(نظر ثانی شدہ)

مطالعہ پاکستان (لازمی)

کوڈ نمبر 9402/5438/417 بی اے/ بی ایڈ/ اے ڈی/ بی ایس یونٹ 1-9

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

مطالعہ پاکستان

کوڈ نمبر: 9402/5438417 بی اے/بی ایڈ/اے ڈی/بی ایس یونٹ 1 تا 9

شعبۂ مطالعہ پاکستان
علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

ایڈیشن اول	.....	1981ء
موجودہ اشاعت	.....	2023ء
تعداد اشاعت	.....	135600
کمپوزنگ	.....	محمد ظہیر
نگران	.....	ڈاکٹر سرمد اقبال
طابع	.....	پاکستان پوسٹ فاؤنڈیشن پریس
ناشر	.....	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	06
	کورس کا تعارف	07
یونٹ نمبر:1	اسلام جنوبی ایشیاء میں	09
یونٹ نمبر:2	جدوجہد آزادی: 1857ء کی جنگ آزادی	51
یونٹ نمبر:3	دوقومی نظریہ اور تحریک پاکستان (حصہ اول) 1868ء تا 1930ء	77
یونٹ نمبر:4	دوقومی نظریہ اور تحریک پاکستان (حصہ دوم) 1930ء تا 1947ء	129
یونٹ نمبر:5	پاکستان کے حصول کے لیے جدوجہد	173
یونٹ نمبر:6	ظہورِ پاکستان	195
یونٹ نمبر:7	تاریخ پاکستان 1947ء تا 1958ء	221
یونٹ نمبر:8	1947ء کے بعد اردو ادب میں اہم رجحانات	247
یونٹ نمبر:9	بیرونی تعلقات: پاکستان تحفظ کا خواہاں ..... 1947ء تا 1971ء	265

کورس ٹیم (برائے اشاعت اول)

تشکیل کار _____ ڈاکٹر اظہر حمید

ممبران _____ پروفیسر شریف المجاہد

سابق ڈائریکٹر قائداعظم اکیڈمی، کراچی۔

_____ ڈاکٹر منیر الدین چغتائی

سابق صدر شعبہ سیاسیات، جامعہ پنجاب

_____ ڈاکٹر عبدالمجید (مرحوم)

سابق ڈائریکٹر، ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، لاہور

_____ ڈاکٹر صفدر محمود

سابق ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل، پاکستان سپورٹس بورڈ، اسلام آباد

_____ خواجہ سعید الدین ڈار

سابق صدر بین الاقوامی تعلقات، جامعہ قائداعظم، اسلام آباد

_____ پروفیسر جاوید اقبال سید، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

مرحومہ مسز مظفر قریشی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

عبدالحمید راٹھور، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

ڈاکٹر محمد صدیق خان شبلی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

امر جلیل قاضی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

کورس ایڈیٹر: _____ ڈاکٹر اظہر حمید

تدوین درسی کتاب: _____ بشیر محمود اختر، سینئر ایڈیٹر

ریڈیو، کیسٹ اور ٹی وی انچارج: _____ امر جلیل قاضی

سرورق: _____ محمود احمد قریشی

کورس ٹیم (برائے نظر ثانی ایڈیشن)

تشکیل کار _____ ڈاکٹر ثمینہ یاسمین

چیئر پرسن _____ ڈاکٹر سید عبدالسراج

ممبران کمیٹی آف کورسز

بیرونی ممبران _____ 1 پروفیسر ڈاکٹر سید جعفر احمد

انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان اسٹڈیز، کراچی یونیورسٹی، کراچی

2 پروفیسر ڈاکٹر لطف اللہ منگی

پرووائس چانسلر شاہ عبداللطیف بھٹائی یونیورسٹی شکارپور کیمپس سندھ

_____ 3 ڈاکٹر فضل الرحیم مروت

وائس چانسلر باچا خان یونیورسٹی چارسدہ

_____ 4 پروفیسر ڈاکٹر عذرا اصغر علی

چیئر پرسن ڈیپارٹمنٹ آف پاکستان سٹڈیز بہاؤالدین ذکریا یونیورسٹی ملتان

اندرونی ممبران _____ ڈاکٹر ثمینہ یاسمین

_____ ڈاکٹر بادشاہ سردار

_____ ثمینہ امان

_____ ملک اختر

پیش لفظ

دوسری جنگ عظیم (1939ء تا 1945ء) کے خاتمے کے بعد کسی علاقے کے جامع مطالعے کے لیے علاقائی مطالعہ (Area Studies) کا ایک نیا نظام تحقیق و تدریس متعارف کروایا گیا۔ جس کا بنیادی مقصد سماجی علوم (Social Sciences) کے مروجہ اصولوں کی روشنی میں خطے کے جغرافیائی سیاسی اقتصادی لسانی اور نسلی حالات کا بے لاگ مطالعہ کر کے اس خطے کو درپیش مسائل کا ادراک حاصل کیا جائے اور ان کے حل کے لیے منصوبہ بندی کی جائے۔

1971ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی جیسے المناک واقعے کے رونما ہونے کے نتیجے میں جہاں قومی یکجہتی سے متعلق بنیادی نوعیت کے سوال پیدا ہوئے وہاں پاکستان کی سیاسی معاشی اور معاشرتی حکمت عملیوں کا تنقیدی جائزہ لینے کی ضرورت کو بھی شدت سے محسوس کیا گیا۔ اس ضرورت کے پیش نظر ملک میں علاقائی مطالعے کے مروجہ اصولوں کے مطابق پاکستان کا تدریسی و تحقیقی نظام متعارف کروایا گیا۔ اس حوالے سے یہ کہنا بجا ہوگا کہ مطالعہ پاکستان نہ صرف ایک علاقائی مطالعہ ہے بلکہ یہ ایک کثیر المضامین (Multi Disciplinary) نظام تدریس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مطالعہ پاکستان کا طالب علم پاکستان کی تاریخ، جغرافیہ، سیاست، معیشت اور معاشرت کا مربوط مطالعہ کرتا ہے۔

اس اصول کے پیش نظر مطالعہ پاکستان کی زیر نظر کتاب ترتیب دی گئی ہے۔ اس کتاب میں آپ سماجی علوم (Social Sciences) کے طلبہ کی حیثیت سے نہ صرف تحریک پاکستان کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی محرکات کا جائزہ لیں گے بلکہ تخلیق پاکستان کے بعد ظہور پذیر ہونے والے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات کا بھی تنقیدی جائزہ لیں گے۔ پاکستان کے جغرافیہ کا مطالعہ کرتے وقت آپ نہ صرف پاکستان کے طبعی خدوخال قدرتی وسائل اور پاکستان کی جغرافیائی اہمیت کے متعلق مفید معلومات حاصل کر سکیں گے۔

امید ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ مطالعہ پاکستان کے ایک طالب علم کی طرح نہ صرف پاکستان کے متعلق سیر حاصل معلومات حاصل کرنے کے قابل ہوں گے بلکہ اس مطالعہ کی روشنی میں پاکستان کو درپیش معاشی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کے حل کے لیے تجاویز بھی مرتب کر سکیں گے۔

شیخ الجامعہ

کورس کا تعارف

نظریاتی مملکت میں طلباء کو خاص اہتمام سے اساسی نظریہ اور اس کے عملی نفاذ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ایک مُدت سے اس ضرورت کا احساس رہا ہے۔ میٹرک کی سطح تک ابتدائی کام بھی ہوا۔ لیکن اعلیٰ سطح پر ضابطہ اہتمام 1981ء ہی سے کیا گیا ہے۔ یہ اہتمام قومی تعلیمی پالیسی کے نصب العین ''پاکستان کے اساسی نظریہ کو قائم رکھنا'' ترقی دینا اور مستحکم کرنا اور عملی تربیت کے ذریعے اس کو انفرادی اور قومی زندگی کا شعار بنانا، کی ایک کڑی ہے۔

مطالعہ پاکستان کا یہ کورس نظریاتی تعلیم کے بارے میں تعلیمی ضرورتوں کا ایک حصہ ہے جو ڈگری کی سطح* پر تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کے لیے لازمی ہے ایسا ہی دوسرا کورس ''اسلامیات'' ہے جو کہ ظاہر ہے تمام مسلم طلباء کے لیے ہے جبکہ غیر مسلم طلباء اخلاقیات پڑھیں گے۔

تدریسی مقاصد

اس کورس کی غرض و غایت پاکستان کا ایسا مطالعہ ہے جس سے طلباء میں ماضی پر فخر، حال کے لیے جوش و خروش اور مستقبل پر مستحکم اعتماد ہو اور ان کا یہ پختہ عقیدہ ہو کہ قومی استحکام اور ملکی ترقی کے لیے وہ سب کچھ کرنا فرض ہے جس کی وہ اہلیت رکھتے ہیں۔ تعمیر وطن کے لیے یہ احساس نظریہ پاکستان کی عملی تعبیر اور تحریک پاکستان کو صحیح معنوں میں سمجھنے سے حاصل ہوتا ہے۔

اس کورس کے حسب ذیل تدریسی مقاصد ہیں:

یہ جان لینا کہ پاکستان کسی نسلی، لسانی یا علاقائی قوم پرستی کا نہیں بلکہ ایک قوم ہونے کے مذہبی احساس کا مظہر ہے۔

یونٹ نمبر 1 میں جنوبی ایشیا میں اسلام کی آمد پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے جنوبی ایشیا پر مسلمانوں کے تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور مذہبی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جبکہ یونٹ نمبر 2 میں 1857ء کی جنگ آزادی اور اس کی ناکامی کے اسباب کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ یوں تو برصغیر میں ہندو اور مسلمان صدیوں سے ساتھ رہے لیکن دونوں کا طریق زندگی جدا جدا اور تہذیبیں الگ الگ رہیں۔ قومی اور اجتماعی سطح پر تو اس کی اہمیت اور بھی زیادہ رہی۔ اس حوالے سے ہم نے یونٹ نمبر 3 اور 4 میں دو قومی نظریہ اور تحریک میں نمائندہ حکومت کے اصول کو رائج کرنے کا فیصلہ کیا تو مسلمانان ہند کو اس بات کا شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ اب وہ ہندوستان

---

* یعنی بی اے، بی ایس سی، بی کام، ایم بی بی ایس اور بی ای۔

میں ایک مستقل اقلیت بن کر رہ جائیں گے چنانچہ برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے لئے ایک علیحدہ وطن حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا۔ اسی پس منظر میں ہم نے یونٹ نمبر 5 میں تاریخی حقائق کی روشنی میں حصول پاکستان کی جدوجہد کا جائزہ لیا ہے جبکہ یونٹ نمبر 6 کا عنوان ظہورِ پاکستان ہے۔

یونٹ نمبر 7 میں قیام پاکستان کے بعد رونما ہونے والے سیاسی حالات اور واقعات پر بحث کی گئی ہے۔ اس یونٹ میں ہم نے ابتدائی گیارہ سالوں میں پاکستان کو درپیش سیاسی اور آئینی مسائل پر گفتگو کی ہے جبکہ یونٹ نمبر 8 میں اردو ادب کی مختلف اصناف کو موضوع بحث بناتے ہوئے اردو ادب میں رونما ہونے والے نئے رجحانات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کے آخری یونٹ یعنی یونٹ نمبر 9 میں پاکستان کے خارجہ تعلقات کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ثمینہ یاسمین

ایسوسی ایٹ پروفیسر

کورس رابطہ کار

یونٹ.....1

اسلام جنوبی ایشیا میں:

قوموں اور تمدنوں پر اثرات

تدوین:

خواجہ سعید الدین احمد ڈار

فہرست مضامین

	یونٹ کا تعارف	12
	یونٹ کے مقاصد	12
1۔	مسلمانوں کی حکومت	13
	1.1- ابتدائی دور	13
	1.2- آخری دور	13
2۔	سندھ میں عرب	14
	2.1- تمہید	14
	2.2- محمد بن قاسم	14
	2.3- دیبل کی تسخیر	15
	2.4- محمد بن قاسم کی حکومت	15
	2.5- خود آزمائی نمبر 1	16
3-	فتح سندھ کے اثرات	17
	3.1- علم وادب	17
	3.2- دین کی اشاعت	17
	3.3- تجارت	18
	3.4- خود آزمائی نمبر 2	18
4-	دینی اثرات.....صوفیاء کا کردار	19
	4.1- تمہید	19
	4.2- صوفی سلسلے	19

	4.3- خودآزمائی نمبر 3	24
5-	اصلاحی تحریکیں	25
	5.1- مجدد الف ثانی	25
	5.2- شاہ ولی اللہ	25
	5.3- شاہ ولی اللہ کے جانشین	29
	5.4- سید احمد شہید	31
	5.5- فرائضی تحریک	32
	5.6- دوسری تحریکیں......تیتو میر شہید اور وہابی تحریکیں	33
	5.7- ہندوؤں پر اسلام کا اثر	34
	5.8- خودآزمائی نمبر 4	35
6-	ثقافتی نشوونما وارتقاء	37
	6.1- تمہید	37
	6.2- تعلیم	37
	6.3- فنون لطیفہ اور تعمیرات	39
	6.4- مغل مصوری	45
	6.5- فنون صغیرہ	47
	6.6- خودآزمائی نمبر 5	47
6-	تشریحات	48
7-	کتابیات	50

یونٹ کا تعارف

اس یونٹ میں آپ برصغیر میں اسلام کی ابتداء کے بارے میں پڑھیں گے اس میں بتایا یا ہے کہ عرب فاتح محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے بعد یہاں مسلمان معاشرے کی ابتداء ہوئی۔ تبلیغ اسلام میں مبلغوں، خصوصاً صوفیاء کرام نے نمایاں کردار ادا کیا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ مسلمانوں کے سیاسی زوال کے بعد اصلاحی تحریکوں نے مسلمان معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنے کے لیے اور لوگوں میں نیا جذبہ پیدا کرنے کے لیے اقدام کیے۔ آخر میں برصغیر کے علوم وفنون پر مسلمانوں کے اثرات کے بارے میں پڑھیں گے۔

یونٹ کے مقاصد

یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد طلباء اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1- اُن اسباب کی نشاندہی کر سکیں جن کے باعث لوگوں نے اسلام قبول کیا۔

2- صوفیاء کرام کے سلسلوں اور اشاعت اسلام میں اُن کے کردار کی وضاحت کر سکیں۔

3- اصلاحی تحریکوں سے آگاہ ہو سکیں۔

4- برصغیر کے تہذیب وتمدن کے فروغ میں مسلمانوں کی خدمات پر بحث کر سکیں۔

1۔ مسلمانوں کی حکومت

1.1- ابتدائی دور

سندھ کی فتح سے تقریباً تین سو سال بعد جنوبی ایشیا کی تسخیر کے بے مثال دور کا آغاز ہوا۔ محمود غزنوی اور اس کے بعد شہاب الدین غوری اپنی سلطنتوں کی سرحدوں کو آگے بڑھاتے ہوئے برصغیر کے اندر لے گئے تھے لیکن جنوبی ایشیا میں مسلمان حکومت کی بنیاد رکھنے کا سہرا قطب الدین ایبک کے سر ہے۔ ابتدائی مسلمان حکمران جنہیں عام طور پر سلاطین دہلی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، برصغیر کے بیشتر حصے پر کم وبیش تین سو سال (1206ء تا 1526ء) تک حکومت کرتے رہے۔ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر بادشاہ التمش، بلبن، علاؤ الدین خلجی اور محمد تغلق تھے۔ 1526ء میں ظہیر الدین بابر نے سلاطین دہلی کے سلسلے کے آخری سلطان ابراہیم لودھی کو شکست دے کر مغل حکومت کا سنگ بنیاد رکھا۔

1.2- آخری دور

مغلوں کی سربراہی میں مسلمانوں کی حکومت ملک کے دور دراز حصوں تک پھیل گئی۔ مسلم حکومت کا زوال 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے فوراً بعد شروع ہوا۔ سراج الدولہ، نظام الملک اور ٹیپو سلطان جیسی شخصیتوں نے مسلمانوں کی سیاسی قوت کو بچانے کی کوششیں کیں لیکن ناکام رہے۔ مسلم معاشرے کی قوت کو بحال کرنے کے لیے شاہ ولی اللہ اور اُن کے پیروکاروں کی کوششیں بھی کامیاب نہ ہوئیں۔ احمد شاہ ابدالی کی مہم (1761ء) اور مرہٹوں کی شکست نے مسلمانوں کے لیے آخری موقع فراہم کیا مگر وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور انگریز غالب آ گئے۔ 1857ء کی عظیم جدوجہد جنوبی ایشیا میں اپنے سیاسی اقتدار کو بچانے کے لیے اور ملک کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی آخری لیکن غیر منظم کوشش تھی۔

2۔ سندھ میں عرب

2.1- تمہید

فارس (جس میں کرمان اور مکران کے صوبے بھی شامل تھے) پر مسلمانوں کے فاتحانہ قبضے کے بعد عرب سندھ کے حکمران کے بالمقابل آ گئے کیونکہ اُس نے مسلمانوں کے خلاف حاکم مکران کا ساتھ دیا تھا لیکن جب تک بحر ہند میں عربوں کی سمندری تجارت کی حالت مخدوش نہ ہوئی سندھ کو مطیع فرمان بنانے کے لیے سخت اقدامات نہ کئے گئے۔

2.2- محمد بن قاسم

عربوں اور برصغیر پاک و ہند کے درمیان تجارتی رابطوں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ جنوبی ہند کے ساحلوں پر عربوں کی بستیاں تھیں جن کے ذریعے عرب بندرگاہوں اور جنوبی اور جنوب مشرقی کی بندرگاہوں کے درمیان رابطہ قائم تھا۔ جب عربوں نے اسلام قبول کر لیا اور ایک سلطنت قائم کر لینے میں کامیاب ہو گئے تو اُن کی تجارتی سرگرمیوں میں بے حد اضافہ ہوا۔ بنو امیہ کے دور میں بعض عرب تاجر سری لنکا میں وفات پا گئے تو وہاں کے راجہ نے اُن کی یتیم بیٹیاں اور بنو امیہ خاندان کے خلیفہ کے لیے بیش بہا تحائف مشرقی صوبوں کے گورنر حجاج کے پاس روانہ کئے۔ یہ مسافر اور ان کے ساتھ تمام مال و متاع آٹھ چھوٹے جہازوں میں روانہ کیا گیا تھا مگر سندھ کے ساحلوں کے قریب ان کو بحری ڈاکوؤں نے لوٹ لیا۔ یہ بحری ڈاکو عرب بندرگاہوں، جنوبی ہند اور سری لنکا میں قائم عرب تجارتی اداروں کے مابین ہمیشہ رکاوٹ کا باعث بنتے اور مال تجارت کی باقاعدہ آمدورفت میں حارج ہوتے تھے۔ حجاج نے سندھ کے راجہ داہر سے نقصانات کی مناسب تلافی کا مطالبہ کیا جس پر داہر نے جواب بھیجا کہ بحری ڈاکو میری دسترس سے بالکل باہر ہیں لہٰذا انہیں سزا دینا میرے بس میں نہیں۔ اس پر حجاج نے سندھ پر حملہ آور ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ دو چھوٹی چھوٹی مہمات ناکام ثابت ہوئیں، جس کے بعد:

> اُس نے سترہ سالہ نوجوان عماد الدین محمد بن قاسم کی کمان میں چھ ہزار منتخب شامی اور عراقی سپاہیوں پر مشتمل فوج روانہ کی۔ اُس کے ساتھ اُتنی ہی تعداد میں ناقہ سوار سپاہی اور تین ہزار اونٹوں پر لدا ہوا سامان رسد اور سامان حرب بھی بھیجا اس فوج کے پاس محاصرے کے ساز و سامان میں ایک (قلعہ شکن) منجنیق بھی تھی جسے چلانے کے لیے پانچ سو مردوں کی اجتماعی قوت درکار تھی اس منجنیق کا نام عروس (دلہن) تھا۔
>
> مکران میں سے گزر کر 712ء میں محمد بن قاسم دیبل پہنچا۔

2.3- دیبل کی تسخیر

دیبل کے مقام پر ایک بڑا مندر تھا جس کی چوٹی پر ایک سرخ جھنڈا لہراتا تھا محمد بن قاسم کو بتایا گیا کہ ساکنان قلعہ کا عقیدہ تھا کہ جب تک جھنڈا لہراتا رہے گا دیبل کو فتح نہیں کیا جا سکے گا۔ لہٰذا اُس نے حکم دیا کہ منجنیق کا نشانہ جھنڈے پر باندھا جائے۔ جلد ہی جھنڈا گرا لیا گیا اس پر دفاع کرنے والوں کی کمر ہمت ٹوٹ گئی اور دیبل فتح ہو گیا۔ اس کے بعد محمد بن قاسم نیرون کی طرف متوجہ ہوا جو موجودہ حیدر آباد کے قریب ایک شہر تھا۔ بدھ مت کے ایک پجاری نے جسے شہر کا نگران بنا کر وہاں رکھا گیا تھا۔ مسلمانوں کی اطاعت قبول کر لی۔ بعد ازاں محمد بن قاسم نے دریائے سندھ کو عبور کیا۔ داہر نے راور کے مقام پر عربوں کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ایک شدید مقابلہ برپا ہوا جس میں داہر کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ ہندوؤں کے دستور کے مطابق راج پریوار (شاہی خاندان) کی خواتین آگ میں جل کر مر گئیں۔ راور کے بعد مسلمانوں نے برہمن آباد کو فتح کیا۔

2.4- محمد بن قاسم کی حکومت

اس کے بعد محمد بن قاسم نے ایلور پر قبضہ کیا اور پھر ملتان کی طرف بڑھا جو بالائی سندھ کا سب سے بڑا شہر تھا۔ راستے میں ایک قلعہ جس کا نام سکہ (اُچ) تھا مفتوح ہوا۔ اہل ملتان نے دو ماہ تک مقابلہ کیا جس کے بعد ہندو مغلوب اور شکست خوردہ ہوئے۔ ملتان کے باشندے جن میں تاجروں، سوداگروں اور دستکاروں کے علاوہ جاٹ اور میڈ بھی شامل تھے اور جو مقامی حکام کے ہاتھوں بہت تکالیف اٹھاتے رہے تھے آداب وتسلیمات بجالانے کے لئے محمد بن قاسم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مسلمانوں کے طرز عمل کے مطابق اُس نے مفتوح عوام کو اُن کی جان و مال کے تحفظ اور ان کی رسوم کے مطابق پوجا پاٹ کی آزادی کی ضمانت دی اور کہا کہ آپ کے مندر اُسی طرح محفوظ رہیں گے جس طرح عیسائیوں کے گرجا گھر، یہودیوں کے ہیکل اور مجوسیوں کی عبادت گاہیں محفوظ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سندھ کے لوگوں کو ذمیوں یعنی زیر حفاظت رعایا کا درجہ دیا گیا۔ برہمنوں اور بدھ مت کے پجاریوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا گیا اور انہیں ذمہ دارانہ عہدوں خصوصاً محکمہ مال کے انتظامی عہدوں پر فائز کیا گیا۔ محکمہ مال کے عہدہ داروں کو محمد بن قاسم نے خاص طور پر مندرجہ ذیل ہدایات جاری کیں۔

> ''عوام اور حکومت کے حصہ ہائے پیداوار متعین کرنے میں دیانت سے کام لو اور اگر ریاست کا حصہ وصول کرنا ہے تو اسے انصاف کے ساتھ وصول کرو اور عوام کی ادا کرنے کی اہلیت کے مطابق اُن پر مالیے کی تشخیص کرو۔ باہم اتفاق رائے رکھو اور ایک دوسرے کی مخالفت نہ کرو تا کہ ملک میں بے چینی پیدا نہ ہو۔''

ازاں بعد محمد بن قاسم نے اپنے ایک جرنیل کو قنوج روانہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ اس مہم کا کوئی نتیجہ نکلتا۔ خلیفہ نے گرو ہی

سیاست کی وجہ سے اُسے واپس دارالحکومت میں بلا لیا جہاں اُسے قید کر دیا گیا اور کچھ عرصے کے بعد وہ قید خانے ہی میں وفات پا گیا۔اُس کے قبل از وقت خاتمے کی وجہ سے برصغیر پاک و ہند میں مسلم افواج کی مزید پیش قدمی رک گئی۔

2.5- خودآزمائی نمبر 1

سوال نمبر-1 محمد بن قاسم سندھ میں کس طرح داخت ہوااور اس نے مسلمانوں کے لیے کیا خدمات سرانجام دیں بیان کریں۔

سوال نمبر-2 سندھ کے لوگ محمد بن قاسم کے گرویدہ کیوں ہوئے؟ واضح کریں۔

3۔ فتح سندھ کے اثرات

3.1- علم وادب

اس خطہ ارضی میں مسلم حکومت کا قیام تاریخ اسلام اور تاریخ برصغیر کا ایک اہم واقعہ ہے۔اس سے برصغیر میں:

☆ اسلام کو اولین ٹھکانا میسر آیا۔

☆ عرب مجاہدین اس ملک میں آباد ہوئے اور ان میں سے بعض نے مقامی خاندانوں میں شادیاں کیں۔

☆ فوجی چھاؤنیوں کی بنیادیں پڑیں جو بعد میں آباد اور ترقی پذیر شہروں اور علوم وفنون کے مراکز کی صورت اختیار کر گئیں۔

☆ سندھ میں مسلم مملکت خاندان بنوامیہ کے زوال تک قائم رہی۔ اس فتح نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ثقافتی روابط کے لیے راستہ کھول دیا۔

عربوں کی اہم ترین عالمی دریافت یہ تھی کہ انہوں نے اعشاری اعداد کا نظام ایجاد کیا تھا۔ یہ نظام جب یورپ میں پہنچا تو اسے ''عربوں کا عددی نظام'' کہا گیا۔

خود عربوں نے ہندوؤں سے شطرنج کا کھیل سیکھا۔عربوں کی موسیقی پر بھی سندھی اثرات کا کھوج لگایا گیا ہے۔ پون صدی کے بعد بغداد میں عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے سنہرے دور حکومت (786ء.....809ء) میں ثقافت کی ترقی ہوئی علم نجوم پر ہندوستانی کتابیں مثلاً سدھانتا (جسے عرب ''عام سندھ ہند'' کا نام دیتے ہیں) عربی میں ترجمہ کی گئیں اور اسی طرح آیورویدک دواؤں پر تالیف کی ہوئی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا گیا۔ قصے کہانیوں کی کتاب کلیلہ ودمنہ کا اصل منبع اور سرچشمہ بھی ہندوستانی علم وادب سے ہے۔تاہم عربوں پر سندھ کا اثر یونانیوں کے اثر سے کہیں کم ہے۔

3.2- دین کی اشاعت

(i) سندھ میں مسلم حکومت کے قیام نے سندھ اور اردگرد کے علاقوں یں اسلام کی نشر واشاعت کے لیے راستہ ہموار کیا۔محمد بن قاسم نے قبول اسلام کے لیے مقامی آبادی پر کسی قسم کا دباؤ نہ ڈالا بلکہ اُنہیں وہ تمام سہولتیں بہم پہنچائیں جو ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کا حق تسلیم کی جاتی ہیں۔ان کی عبادت گاہوں کو بالکل نہ چھیڑا گیا اور اُنہیں اپنے شخصی قوانین کے نفاذ، اپنے مذہبی اداروں، مقامی اور قومیتی معاملات پر اپنا اپنا نظم ونسق قائم رکھنے کی اجازت دی گئی۔ آبادی میں کثیر تعداد رکھنے والے بدھ مت کے پیروؤں کو اُن کے ہندو حکمران اذیت پہنچایا کرتے تھے لہٰذا کبھی کبھی یہ

لوگ عربوں کا ساتھ دیتے تھے۔عوام اُن کے عدل وانصاف اور رحمدلی سے اتنے متاثر تھے کہ جب محمد بن قاسم اور بعد ازاں بنوامیہ خاندان کے متقی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اُنہیں قبول اسلام کی دعوت دی تو ان کا جوابی عمل بہت عمدہ تھا۔ سندھ اور ملتان نے عرب سیاحوں، ادیبوں اور مبلغوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا۔ ان لوگوں نے اپنی سرگرمیوں کے دائرے کو پنجاب، بلوچستان اور شمال مغربی پہاڑوں میں بسنے والے قبیلوں تک وسیع کیا جو بعد کے زمانے میں سندھ اسماعیلی مبلغین کے لیے پرکشش ثابت ہوا اور یہ مبلغ اپنے تبلیغی کاموں میں ایسے کامیاب ہوئے کہ سندھ پر اسماعیلیوں کی حکومت قائم ہوگئی۔

(ii) سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں ملتان اور لاہور کی فتح کے بعد صوفیائے کرام کے دم قدم سے تبلیغی سرگرمیوں کا ازسرنو آغاز ہوا۔مغربی پاکستان کے تمام علاقوں کو اسلام کے حلقہ بگوش بنانے میں صوفیائے کرام نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔

3.3- تجارت

عربوں کے ہاتھوں سندھ اور ملتان کی تسخیر سے جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے ساحلی علاقوں کے ساتھ عربوں کی تجارت میں اضافہ ہوا بعض عرب فتح سندھ سے پیشتر ہی مالا بار اور سری لنکا کے علاقوں میں آباد ہو گئے تھے۔آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں عربوں کی بحری تجارتی شاہراہ بنگال کے ساحل کے ساتھ ساتھ واقع تھی اور عرب تاجر بنگال کے ساحل پر واقع بندرگاہ ''سمندر'' پر آیا کرتے تھے۔ وہ سندیپ اور روہمی (وہ علاقہ جو سمندر اور آسام کے درمیان واقع ہے) بھی اکثر جایا کرتے تھے۔اس امر کی ایک روایت بھی موجود ہے کہ طوفان کا شکار ہونے والے بعض عرب تاجر اراکان کے ساحل کے نزدیک بعض دیہات میں آباد ہو گئے تھے۔ایک اور روایت کے مطابق بعض عرب دسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں چٹاگانگ میں آباد ہو گئے تھے۔

3.4- خودآزمائی نمبر 2

سوال نمبر-3 علوم میں عربوں نے لوگوں کو کیا سکھایا اور ان سے کیا سیکھا؟

(جواب کا جائزہ 3.1 کی روشنی میں لیں۔)

سوال نمبر-4 اُن بنیادی عوامل کی نشاندہی کیجئے جن کی وجہ سے دین اسلام یہاں کی سرزمین میں مستحکم ہوا۔

(جواب کو 3.2 کی روشنی میں پرکھئے۔)

4۔ دینی اثرات.....صوفیاء کا کردار

4.1- تمہید

مسلم حکمران خاندان عروج وزوال سے ہمکنار ہوتے رہے لیکن ان تمام صدیوں کے دوران اسلام ایک متحد کرنے والی قوت کی حیثیت سے مسلمانوں کی پشت پناہی کرتا رہا۔ دین اسلام اور اس کے عقائد و روایات کو برقرار رکھنے کے لیے صوفیاء نے زبردست کردار ادا کیا چنانچہ جہاں بڑے شہروں میں کہ مسلم معاشرے کے اعلیٰ طبقوں کے افراد رہتے تھے علمائے اُمت نے دین کی نگہبانی کا حق ادا کیا وہاں غیر معروف مقامات پر عوام الناس کے اندر صوفیائے کرام نے نسل در نسل نہایت عزم و ہمت کے ساتھ نہ صرف اسلام کی باطنی روح کو برقرار رکھنے کے لیے بلکہ ہزار ہا انسانوں کو آغوش اسلام میں داخل کرنے کا فریضہ بھی سرانجام دیا۔

برصغیر میں اسلام کی نشر واشاعت کی کہانی حقیقتاً ان لاتعداد اولیاء اللہ اور صوفیاء کی کہانی ہے جنہوں نے خدمت انسانیت کے مقصد کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دی تھیں۔ لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کرنے کے ضمن میں دو اہم عوامل نے ان مقدس بزرگوں کی مدد کی۔ ایک تو ذات پات کا نظام جو مسلمانوں کی فتوحات سے پہلے یہاں سختی سے رائج تھا۔ دوسرے ان بزرگوں کی اپنی سادہ، نیک اور قابل تقلید زندگی۔ ذات پات کے غیر منصفانہ نظام نے ہندوؤں کو ایک دوسرے سے مکمل طور پر الگ تھلگ طبقوں میں تقسیم کر دیا تھا جس سے ان کی اعلیٰ ذاتوں کے افراد یعنی برہمنوں اور کھشتریوں نے تمام مراعات پر اپنا اجارہ قائم کر لیا تھا اور عوام کی اکثریت کو ادنیٰ حیثیت دے دی تھی۔ ان لاکھوں مصیبت زدہ عوام کے لیے اسلام امید کا پیغام لے کر آیا اور یہ پیغام انسانوں کی مکمل مساوات کا پیغام تھا۔

4.2- صوفی سلسلے

تمہید

اپنی سادہ اور بے نام ونمود کی زندگی، اللہ تعالیٰ کی محبت اور اطاعت میں کامل استغراق اور دکھ درد میں ڈوبی ہوئی انسانیت کے ساتھ محبت کی بناء پر صوفیائے کرام اس چیز کا پورا پورا حق رکھتے تھے کہ اسلام کے لیے انسانیت نوازی اور حریت پسندی کے پیغام کے علمبردار بنیں۔ وہ بلند کردار لوگ تھے اور انہوں نے مسلم فاتحین کے عقب میں بڑی تعداد میں آنا شروع کیا۔ اگرچہ اُن میں سے بعض فوجی فتوحات سے بھی پہلے تشریف لائے تھے۔ سقوط بغداد کے بعد جب مسلمانوں کی سیاسی قوت انتہائی پستیوں میں جا گری تھی صوفیائے کرام نے منظم روحانی ربط وضبط کے وسیلے سے مسلم معاشرے کی قوتوں کو بحال کرنے کی

عظیم ذمہ داری خود سنبھال لی۔

☆ صوفیاء کے سلسلوں میں سب سے پہلے سلسلہ قادریہ ہے جس کی بنیاد شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (1077ء.....1177ء) نے رکھی تھی کا ذکر مناسب ہوگا۔ اگرچہ مغربی ایشیا میں یہ سلسلہ بڑا مستحکم تھا لیکن سلاطین دہلی (1206ء.....1526ء) کے زمانے میں اسے برصغیر میں کوئی خاص ترقی حاصل نہ ہوئی۔

☆ نقشبندیہ سلسلہ جو بہاؤ الدین نقشبند (1388ء) کے نام پر ہے وہ بھی برصغیر میں تاخیر سے پہنچا عوام کے اندر اسلام کی نشر واشاعت زیادہ تر بقیہ دو سلسلوں یعنی چشتیہ اور سہروردیہ کی مرہون منت ہے۔

☆ چشتیہ سلسلہ جس کے بانی خواجہ ابو اسحٰق شامی (940ء) تھے برصغیر میں خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے توسط سے آیا۔

☆ سلسلہ سہروردیہ کو جس نے شیخ نجیب الدین عبدالقادر سہروردی (م 1169ء) کے نام سے یہ نام پایا ہے برصغیر میں ملتان کے شیخ بہاؤ الدین ذکریا نے ہر دلعزیز بنایا۔

یہ دونوں سلسلے سلطنت دہلی کے قیام کے ساتھ ہی تقریباً ایک ہی وقت میں یہاں آئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں انہوں نے ملتان سے لے کر لکھنؤ تک اپنی خانقاہیں قائم کر لیں۔ نتیجتاً دلی اور اُس کے گردونواح میں چودھویں صدی کے ابتدائی سالوں تک تقریباً دو ہزار خانقاہیں موجود تھیں۔ یہ خانقاہیں عام طور پر الگ تھلگ مقامات پر بنائی جاتی تھیں جہاں غور وفکر کے لیے مثالی فضا کے ساتھ ساتھ ایسے زائرین کے لیے جائے سکوں بھی مہیا ہوتی تھی جو ان درویشوں کی صحبت سے فیض یاب ہونے کی اُمید رکھتے تھے۔ خانقاہوں کو یا تو مستقل اثاثوں کے وسیلے سے زیر انتظام رکھا جاتا تھا یا مقامی لوگوں سے وصول کئے جانے والے عطیات سے۔ بعض صوفیائے کرام کی زندگی کے مختصر حالات اور تعلیمات درج ذیل ہیں۔

(الف) خواجہ معین الدین چشتی اور سلسلہ چشتیہ

خواجہ معین الدین چشتی اجمیری 1141ء میں سجستان میں پیدا ہوئے تھے اور انہوں نے (جوانی میں) سمرقند اور بخارا کے علمی مراکز میں تعلیم حاصل کی۔ نیشاپور میں ان کی ملاقات خواجہ عثمان ہارونی سے ہوئی جن کے ساتھ وہ بیس برس تک وابستہ رہے۔ انہوں نے خاصی سیاحت کی اور اُس کے بعد برصغیر کی طرف متوجہ ہوئے۔ کچھ دیر کے لیے وہ لاہور میں بھی رہے جہاں وہ حضرت داتا گنج بخش (شیخ علی ہجویری) کے مزار پر حاضر ہوئے۔ اس کے بعد وہ اجمیر گئے۔ 1236ء میں اُن کی وفات ہوئی اور وہ اجمیر میں مدفون ہوئے۔ خواجہ معین الدین کے دو سرکردہ مرید جنہوں نے چشتیہ سلسلے کو ہر دلعزیز بنایا شیخ حمید الدین اور شیخ قطب الدین بختیار کاکی تھے شیخ حمید الدین ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتے تھے جہاں وہ زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر کاشتکاری کر کے معمولی سی روزی حاصل کرتے تھے انہوں نے ہر قسم کی شاہی نوازشات قبول کرنے سے انکار کیا اور احتیاج اور

غربت کی زندگی کو ترجیح دی۔ اُن کی سادگی اور حق پرستی نے اُنہیں ناگور میں ایک ہر دلعزیز شخصیت بنا دیا۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے خلیفہ کی حیثیت سے ممتاز مقام حاصل کیا اور دہلی میں آ کر سکوت پذیر ہوئے جہاں سلطان التمش نے گرمجوشی سے اُن کی پذیرائی کی اور اُن سے درخواست کی کہ وہ شاہی محل کے قریب ہی جائے مقام بنائیں لیکن فقیر نے شہر سے باہر ہی قیام پذیر ہونا بہتر سمجھا۔ التمش اُن کا بے حد احترام کرتا تھا تاہم خواجہ موصوف اپنے آپ کو شاہ و دربار سے وابستہ کرنا نہ چاہتے تھے۔ حضرت موصوف کے دو خلیفوں شیخ بہاؤالدین غزنوی اور شیخ فریدالدین گنج شکر نے چشتیہ سلسلہ کو مزید مقبول عام بنایا۔ پاک پتن (اجودھن) کے خواجہ فریدالدین گنج شکر کی کوششوں کا خصوصی نتیجہ یہ نکلا کہ چشتیہ سلسلے کی بہت سی شاخیں جنوبی ایشیا کے کئی اہم شہروں میں قائم ہوئیں۔

(ب) خواجہ فریدالدین مسعود گنج شکر

ملتان کے نواح میں پیدا ہونے والے خواجہ فریدالدین گنج شکر کی ملاقات جب خواجہ قطب الدین بختیار کاکی سے ہوئی تو وہ اُن سے قلبی طور پر وابستہ ہو گئے۔ ''خدا پرستی اور پرہیز گاری میں کوئی بزرگ گنج شکر پر سبقت حاصل نہیں کر سکا'' وہ پہلے ہانسی میں مقیم ہوئے اور بعد ازاں اجودھن (پاک پتن) منتقل ہوئے جہاں روحانی طور پر تشنہ لوگ دور دراز سے اُن کے پاس آنے لگے۔ اُن کے ساتھ مریدوں نے جن میں مشہور زمانہ خواجہ نظام الدین اولیاء بھی شامل تھے آپ کے سلسلہ فیض کو جاری رکھا۔

(ج) خواجہ نظام الدین اولیاء

خواجہ نظام الدین اولیاء (1238ء..... 1325ء) کو خواجہ فرید نے اپنا خلیفہ بنایا جہاں وہ کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔ وہ دلّی میں تقریباً نصف صدی تک رہے اور دین کی خدمت کرتے رہے۔ تمام دیگر صوفیاء کی طرح خواجہ نظام الدین شاہی دربار کے ساتھ کسی قسم کا تعلق رکھنے سے نہ صرف گریزاں رہے بلکہ وہ اس چیز کو بھی ناپسند کرتے تھے کہ شاہی خاندان کے لوگوں کی اُن کی خانقاہ میں آمدورفت ہو۔ اُن کی زندگی اور مشاغل زندگی کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں مسلمان عوام کی کردار سازی اور صوفیاء کے ایک ایسے گروہ کی تربیت سے زیادہ شغف تھا جو بنگال دکن اور گجرات کے علاقوں میں تبلیغ اسلام کے فرائض سرانجام دینے کے لیے ذمہ دار تھے۔ دہلی میں زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق افراد اُن کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے لگے۔ آپ کا دروازہ اُمراء شہزادوں، امیر اور غریب عالم اور جاہل، سپاہی اور کسان، آزاد اور غلام سب کے لیے کھلا تھا۔ کبھی کبھی آپ کی خانقاہ میں یا شہر کے مختلف حصوں میں مجالس منعقد ہوتی تھیں جہاں قوالی بھی ہوتی تھی اور شرکائے مجلس پر رقت کا عالم طاری ہوتا تھا اور وہ وجد میں بھی جایا کرتے تھے۔ شیخ موصوف کے فیضان نظر سے عوام ضبط آشنا اور مخلص ہو گئے۔ اُن کی خانقاہ سے کافی تعداد میں علماء، حفاظ، طلباء اور قوالوں کی کفالت بھی ہوتی تھی۔

(د) شیخ بہاؤالدین ذکریا

شیخ بہاؤالدین ذکریا جو برصغیر میں سہروردیہ سلسلے کے بانی تھے۔ 1182ء..... 1183ء میں ملتان کے نواح میں پیدا ہوئے اور بعد میں انہوں نے بہت سے اسلامی ممالک کی سیاحت کی۔ بغداد میں اپنے قیام کے دوران آپ شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید ہوئے۔ ملتان واپس آ کر اُنہوں نے وہاں ایک سہروردیہ خانقاہ بنائی اور نصف صدی سے زیادہ عرصے تک صوفیانہ نظم وضبط کی زندگی کی تعلیم دینے میں مصروف رہے۔ 1262ء میں ملتان میں اُن کا انتقال ہوا۔ ان کا روحانی تسلط ملتان، سندھ اور بلوچستان تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک سوانح نگار کی تحریر کے مطابق شیخ بہاؤالدین کچھ عرصہ سرحدی علاقے (پشاور) میں بھی خلوت نشین رہے اور بہت سے ہندو جن میں سندھ، ملتان اور لاہور کے رؤسا بھی شامل تھے ان کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور اُن کے مرید بنے۔ وہ ایک معتدل اور متوازن زندگی بسر کرنے کے قائل تھے اور زاہدانہ ترک دنیا کے حق میں نہ تھے۔ صوفیائے چشت کے عمل کے برعکس وہ بادشاہوں اور اُن کے درباروں کو اہمیت دینے کے حق میں نہ تھے۔ وہ دین کے ظاہری شعائر کی پیروی میں بھی راسخ تھے۔ اُن کی نگاہ میں مال وزر کی ملکیت صوفیانہ طرز زندگی میں حائل نہ ہوتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ جب 1257ء میں منگول ملتان میں آ گئے اور وہاں انہوں نے قتل وخونریزی شروع کی، شیخ موصوف نے اُنہیں ایک لاکھ درہم دے کر شہر کو مکمل تباہی و بربادی سے بچا لیا۔

(ر) صدرالدین عارف

شیخ بہاؤالدین کی وفات کے بعد اُن کے صاحب زادے صدرالدین عارف اُن کے جانشین ہوئے جبکہ اُن کے مرید سید جلال الدین بخاری نے اُچ کے مقام پر ایک مستحکم سہروردی مرکز قائم کیا۔ شیخ صدرالدین دولت کے بارے میں اپنے والد کے نقطہ نظر سے اختلاف رکھتے تھے۔ انہوں نے بے شمار روپیہ پیسہ جو اُنہیں والد مرحوم سے ورثے میں ملا تھا خیرات کر دیا اور احتیاج کی زندگی کو خوشحالی کی زندگی پر ترجیح دی۔ اُچ کے بہت سے قبیلوں کو داخل اسلام کرنے کا سہرا سید جلال الدین بخاری کے سر ہے۔

(س) شیخ عبدالقادر جیلانیؒ

قادری سلسلہ طریقت کی بنیاد بغداد کے شیخ عبدالقادر جیلانی (م 1265ء) نے رکھی تھی۔ برصغیر میں اس سلسلہ کو متعارف کرانے والے شاہ نعمت اللہ مخدوم محمد جیلانی تھے جنہوں نے یہ کارنامہ پندرہویں صدی عیسوی کے وسط میں سرانجام دیا۔ شیخ داؤد کرمانی، لاہور کے شیخ ابوالمعانی حضرت میاں میر اور ملا شاہ بدخشی اس سلسلے کے معروف ترین بزرگوں میں سے تھے شاہ جہان اور داراشکوہ اپنی بہن جہاں آرا بیگم کے ہمراہ ملا شاہ بدخشی کا مرید ہو گیا تھا اور مؤخر الذکر نے ''مونس الارواح'' نامی کتاب میں بزرگان طریقت کی مختصر سوانح حیات قلمبند کی۔ اپنی تصنیف ''سکینۃ اولیاء'' میں دارا نے ملا شاہ بدخشی اور اُن کے بعض مریدوں کی

زندگی کے مفصل حالات لکھے ہیں۔

(ل) سلسلہ نقشبندیہ

نقشبندی سلسلۂ طریقت جس نے ان مشرکانہ تصورات کا سدباب کرنے کے لیے بڑا کام کیا جنہیں عام کرنے کی کوشش اکبر نے کی تھیں ۔ اس سلسلے میں متعارف کرنے اور مقبول بنانے والے حضرت خواجہ باقی باللہ اور اُن کے مرید حضرت شیخ احمد سرہندی تھے۔نقشبندیہ سلسلۂ طریقت ''شریعت کی گرمجوشانہ اطاعت کوطریقت کی تربیت اور تعلیم کے لیے ضروری خیال کرتا تھا'' اُن کے بیٹے شیخ معصوم اپنے والد کے نقش قدم پر چلنے والے تھے اور شہزادگی کے زمانے میں عالمگیر اُن کے مواعظ حسنہ میں شریک ہوا کرتا تھا۔ جب اورنگ زیب کو باخ کی مہم میں شاہی افواج کا سالار بنا کر بھیجا گیا تو اس کے نام اپنے ایک خط میں شیخ معصوم نے جہاد کی فضیلتوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ''ہم درویش لوگ جو زندی سے کنارہ کش ہو چکے ہیں کیسی ہی پرہیز گاری سے کام لیں اور کتنے ہی طویل روزے رکھیں جہاد کے انعامات کی سب سے پچھلی حدود کو بھی نہیں پہنچ سکتے'' بعد کے زمانے میں عالمگیر شیخ صفی الدین کا مرید بن گیا اور ان کے اثر ونفوذ کے ماتحت اس نے حضرت شیخ احمد کے تصورات کو عملی جامہ پہنایا۔

مشغلہ: صوفیاء کے سلسلوں کا ایک چارٹ مرتب کیجئے۔

اسلام کی آمد کے بعد ہندوؤں کے ہاں مذہبی افکار میں بعض ایسی تبدیلیاں نمایاں ہوئیں جو براہ راست اسلام کے اثر کا نتیجہ دکھائی دیتی ہیں۔مسلمانوں کے ہاتھوں شمالی ہند کی تسخیر کے بعد یہ اثرات گہرے ہوتے گئے جس کا اظہار مسلمانوں کے مذہبی افکار کی بدولت ہندوؤں کے مذہبی افکار میں ازسرنو تازگی پیدا ہونے کی صورت میں ہوا۔علاوہ ازیں اس کا اظہار ایسے ہندو مفکرین اور فرقوں کی نمود سے بھی ہوا جو مختلف درجوں میں اسلام کے قریب ہوئے۔اس چیز نے مقامی آبادی کے قبول اسلام کی رفتار کو بھی بری طرح متاثر کیا کیونکہ اسلام کی جو خصوصیتیں عوام کو اس کی طرف کھینچ سکتی تھیں وہ ان فرقوں نے اپنے اندر سمو لیں۔وحدت پرستی، غیر طبقاتی معاشرے کا قیام اور ایک ذات معین پر ایمان ایسی امتیازی صفات تھیں جن کی تبلیغ کئی ہندو مذہبی رفارمر بھی کرتے تھے۔ان تصورات کو جس حد تک (ہندو معاشرے نے) اپنے اندر جذب کیا اس حد تک اس بات کا بڑی شدومد کے ساتھ اظہار کیا گیا کہ ہندومت اور اسلام میں کوئی فرق نہیں ہے۔مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے سوچ کا یہ انداز بہت خطرناک تھا کیونکہ اس کے ماننے سے اسلام کی یکسانیت کو نقصان پہنچتا تھا اور ہندومت میں مسلمانوں کے جذب ہونے کا راستہ ہموار ہوتا تھا۔ اس تصور کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعض ہندو لوگوں کے چیلوں میں مسلمان بھی شامل ہو گئے*۔اکبر کا دین الٰہی بھی انہی تصورات کی پیداوار تھا۔ دوسرے نتائج کے علاوہ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں کے اندر اپنے دینی شعائر پر عمل کرنے کے بارے میں سستی پیدا ہو گئی۔

* جیسی مثالیں ہمیں پنجابی کے کلاسیکی ادب میں ملتی ہیں مثلاً رانجھے کا بالناتھ گرو کا چیلا بننا اور شاہ حسین کا مادھولال کے لیے بے پناہ جذبہ محبت۔

4.3- خود آزمائی نمبر 3

سوال نمبر-5 صوفی کی تعریف اپنے الفاظ میں کیجیے نیز برصغیر کے صوفیائے کرام کے سلسلوں کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں تفصیلاً بیان کریں۔

5۔ اصلاحی تحریکیں

5.1- مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ

وہ مردِ حق جنہوں نے مذہب کے بارے میں اکبر کے ذہنی انتشار کے خلاف جہاد کرنے اور داخلی طور پر تطہیر کر کے احیائے اسلام کا فریضہ اپنے لیے منتخب کیا حضرت شیخ احمد سرہندی تھے جنہیں عام طور پر مجدد الف ثانی یعنی دوسرے ہزار سال کے لیے دین کی تجدید کرنے والے کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

شیخ احمد سرہندی 26 جون 1564ء کو سرہند کے مقام پر پیدا ہوئے انہوں نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی اور اس کے بعد حدیث تفسیر اور علوم معقول کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے مختلف اساتذہ کی شاگردی کرتے رہے۔ طریقت میں آپ پہلے چشتیہ اور سہروردیہ سلسلوں میں منسلک ہوئے اور بعد میں حضرت خواجہ باقی باللہ کی ارادت میں نقشبندیہ سلسلے میں شامل ہوئے۔ پھر تو آپ نے اپنے کمال علم و فضل اور خلوص نیت کو اس مقصد کے لیے وقف کر دیا کہ اسلام کو ہندوؤں کے مشرکانہ عقیدوں اور اس کے ساتھ ہی فلسفہ وحدت الوجود جسے بہت سے ذہن ویدانتی فلسفہ وحدت الوجود سے منطبق کرتے ہیں پاک کیا جائے۔ انہوں نے اکبر کے ذہنی انتشار کی کیفیتوں اور خالص اسلام کو کمزور کرنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ علماء اور اونچے طبقے کے لوگوں کی کمزور طبعی اور نام نہاد صوفیوں کے الحاد کی مذمت بھی کی۔ اپنے زبانی مواعظ مباحث اور اپنے مکتوبات (امراء اور دینی افکار کے رہنماؤں کو لکھے جانے والے خطوط) کے توسط سے آپ نے اپنے پیغام کو طبقہ خواص میں خاص طور پر عام کیا انہوں نے اکبر کی حکمت عملیوں کی بڑی شدومد سے مذمت کی۔

حضرت مجدد نے اسلام اور ہندومت کے درمیان حائل ہونے والی وسیع اور ناقابل عبور خلیج کی نہایت پرزور انداز میں وضاحت کی اور اس ضمن میں کسی سمجھوتے کو قبول نہ کیا۔ اُنہوں نے ابن العربی کے فلسفہ وحدت الوجود کو رد کرنے اور اُس کے بالمقابل فلسفہ وحدت الشہود پیش کر کے تصوف اور خالص پاکیزہ اسلام کے درمیان پیدا ہو جانے والی خلیج کو پاٹنے کی کوشش بھی کی۔ اُن کو اصرار تھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور سنت کے ساتھ بلا چون و چرا ہم آہنگی ہونی چاہیئے۔ اقبال نے بجا طور پر اُنہیں ایسی شخصیت قرار دیا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اکبر کی اور بعض صوفیاء کی ضدین کو جمع کرنے کی کوششوں میں مضمر خطروں سے آگاہ کر دیا تھا۔

5.2- شاہ ولی اللہ

وہ عظیم اُفتاد جو اٹھارویں صدی میں مسلمانوں پر پڑی اور اس کے نتیجے میں اُن پر جو اخلاقی زوال آیا اُس کی مثال برصغیر

میں اسلام کی اس سے پہلے کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ جب تک برصغیر میں مسلمانوں کا سیاسی غلبہ قائم رہا۔ اُنہیں جداگانہ طور پر منظم کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔ سولہویں صدی کے بیشتر دینی رہنماؤں کو دینی اصولوں کی عمومی اصلاح کی فکر لاحق تھی۔ کیونکہ انہیں اندیشہ تھا کہ مسلم معاشرے میں ہندووانہ تصورات داخل ہونے کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ لہٰذا صرف اس وقت جب یہ احساس پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی سیاسی قوت کو نقصان پہنچا ہے اور اس نقصان کا ان کی اقتصادی زندگی پر اثر پڑ رہا ہے۔ زیادہ جامع مذہبی اصلاحی تحریکیں نمودار ہوئیں۔

وہ شخصیت جس نے پہلے پہل مسلمانوں کی قوت کی تباہی کے اسباب کی طرف توجہ دی وہ شاہ ولی اللہ کی تھی۔ ''اس وقت بڑھتی ہوئی مایوسیوں اور ظلمتوں کی فضا تھی جب تیسرے مکتب فکر کے بانی شاہ ولی اللہ زندگی کے میدان میں آگے بڑھے'' وہ اس دور کے ایک انتہائی ذاتی سوچ اور تعمیری ذہن رکھنے والے مفکر تھے اور انہیں سیاسی حقائق کا واضح ادراک بھی حاصل تھا۔ انہوں نے ''مسلم سیاست کی نئی تعمیر کے لیے ایک نئی نظریاتی بنیاد وضع کرنے کی کوشش کی۔''

شاہ ولی اللہ 21 فروری 1703ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد شاہ عبدالرحیم اپنے علم وفضل اور پارسائی کی بناء پر بڑے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنے والد کی مشفقانہ نگرانی میں پندرہ برس کی عمر میں ہی رسمی تعلیم مکمل کر لی اور اس کے بعد انہیں سلسلہ نقشبندیہ میں شامل کر لیا گیا۔ جلد ہی انہیں مدرسہ رحیمیہ میں جو ان کے والد گرامی نے ہی قائم کیا تھا دوسروں کو تعلیم دینے کی اجازت حاصل ہوگئی۔ شاہ عبدالرحیم کی وفات کے بعد بھی شاہ ولی اللہ بارہ سال تک وہاں تعلیم دیتے رہے۔ اس برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ کا یہ ایک نازک دور تھا۔ اقبال کے الفاظ میں وہ پہلے مسلمان تھے: ''جنہوں نے اپنے اندر ایک نئی روح کی اُمنگ محسوس کی۔''

شاہ ولی اللہ 1730ء میں حج کے لیے مکہ مکرمہ گئے۔ وہاں انہیں خوش قسمتی سے اس زمانے کے سوبرآوردہ مسلمان علمائے دین کے قدموں میں بیٹھ کر ان کے ساتھ وابستگی پیدا کر کے علم حاصل کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ وہاں جو حال انہوں نے مسلمان اقوام کا دیکھا اس نے انہیں سخت متاثر کیا۔ وطن کے اندر اور وطن سے باہر عمرانی' سیاسی اور روحانی طور پر مسلمانوں کے زوال نے اُنہیں قائل کر دیا کہ اب مناسب ترین وقت ہے کہ نئے سرے سے اسلام کی تشریح کی جائے اور خود مسلمانوں کے اندر اسلامی اقدار کو مقبول بنایا جائے۔

انہیں اس امر کا احساس ہوا کہ مسلمانوں کو ازسرنو بیدار کرنے کے لیے پہلا قدم اٹھانے اور ان کے سامنے اسلام کو عقلی انداز میں پیش کرنے کی ذمہ داری ان کی ہے۔ 38-1737ء میں انہوں نے روایت پسند علماء کی بیزاری کے باوجود قرآن مجید کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ انہوں نے شیعہ اور سنی عقیدے کے لوگوں، علماء اور صوفیاء کے باہمی اختلافات کو دور کرنے اور ان دونوں طبقوں کے درمیان حائل خلیج کو پاٹنے کا کام اپنے ذمے لیا۔ انہوں نے اندھی تقلید کے برعکس اجتہاد کو بروئے کار لانے پر

زور دیا۔ اسلام کی اس افاقیت پر ایمان رکھتے ہوئے ان کی خواہش تھی کہ زمان و مکان کے حوالے سے اسلام کی تشریح جدید کی جائے۔

ان کی تمام تر تعلیمات کا مقصود یہ تھا کہ عدم مساوات کو دور کرتے ہوئے، دولت کی نامنصفانہ تقسیم کو ختم کر کے اور ان کے اندر مضمر تضادات اور کشیدگیوں کو ختم کر کے ''مجلسی انصاف کی بنیادوں پر مسلم معاشرے کی تشکیل جدید کی جائے۔ جب ان سے سوال کیا گیا کہ اس مقصود کا حصول کس طرح ممکن ہے تو انہوں نے جواب دیا ''فرسودہ مجلسی اور سیاسی نظام کو ترک کر کے۔''

اس سے پہلے کسی دوسرے سیاست دان یا مفکر نے شاہ ولی اللہ کی طرح مجلسی اور اقتصادی بیماریوں کا ویسی احتیاط سے مطالعہ نہیں کیا نہ ہی ویسا سائنسی تجزیہ کیا تھا۔ انہوں نے اپنی کتابیں عربی اور فارسی زبانوں میں تصنیف کیں کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ ان کے پیش کئے ہوئے فلسفے کو اونچے طبقوں کے لوگ سمجھیں اور پھر اُسے آگے پھیلائیں اور عام لوگوں میں مقبول بنائیں۔ وہ ایک معلم تھے اور ایک پیغام کے حامل، شورش برپا کرنے والے نہ تھے۔ انہوں نے تقریباً پچاس کتابیں لکھیں، علماء کے ایک گروہ کی تربیت کی، اپنے دارالعلوم کی چند شاخیں دہلی میں قائم کیں اور اس طرح اپنے تصورات کی وسیع تر اور زیادہ مؤثر نشر و اشاعت کے لیے زمین ہموار کی۔ انہوں نے 1762ء میں انتقال فرمایا تاہم ان کے کام کو ان کے بیٹوں اور ارادتمندوں نے جاری رکھا۔ بعد میں نمودار ہونے والی ہر سیاسی، مجلسی اور مذہبی تحریک کی جڑیں انہی کی ذات میں ملتی ہیں اور وہی تھے جنہوں نے قومی آزادی کی تحریک کے لیے جذباتی اور شعوری بنیادیں استوار کیں۔

ایک عالم دین اور محدث کی حیثیت سے شاہ ولی اللہ کا مقام غیر متنازعہ اور عدیم المثال ہے ان کی عظمت کا راز ان کی ذہانت' قرآن و حدیث کے علوم میں ان کی گہری سمجھ' ان کی بے نظیر وسعت نظر اور عصری تقاضوں کے حوالے سے قرآن و حدیث کی تفسیر و تشریح کی گہری آرزو میں پوشیدہ ہے۔

ان کی ذات ایسی نہیں جو محض جذباتی انداز میں اسلام کو پیش کرنے کی کوشش میں مصروف ہو۔ بلکہ انہیں حال اور مستقبل کی فکر زیادہ ہے۔ سمتھ نے کہا ہے کہ ''وہ ایک حساس ناظر زندگی تھے اور یہ حقیقت ان کی نگاہ سے اوجھل نہیں تھی کہ نازک پہلو میں کوئی خرابی پیدا ہو چکی ہے یا ہو رہی ہے۔''

اپنی مشہور تصنیف حجتہ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ انتشار اور شکست و ریخت کے اسباب کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''آج کل مملکت کی تباہی دو وجوہ سے ہے۔

☆ ''پہلی وجہ سرکاری خزانے پر دباؤ جو اس بنا پر ہے کہ لوگوں نے یہ عادت بنالی ہے کہ وہ کام کیے بغیر سرکاری خزانے سے روپیہ وصول کرتے ہیں وہ یا تو یہ عذر کرتے ہیں کہ وہ سپاہی ہیں یا طبقہ علماء سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے سرکاری خزانے پر ان کا حق بنتا ہے یا وہ عوام کے ایسے گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں جنہیں بادشاہ خود انعامات پیش کرتا ہے مثلاً مقدس

صوفیاء یا شعراء یا دیگر گروہوں کے لوگ جو مملکت کی کوئی خدمت بجا لائے بغیر تنخواہیں وصول کرتے ہیں۔ یہ لوگ دوسرے لوگوں کے وسائل آمدنی کا نقصان کرتے رہتے ہیں اور ملکی معیشت پر ایک بوجھ ہوتے ہیں۔

☆ دوسری وجہ یہ ہے کہ کاشتکاروں، تاجروں اور کارکنوں پر بھاری ٹیکس لگائے جاتے ہیں اور ان طبقوں کے ساتھ نامنصفانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام لوگ جو حکومت کے وفادار ہیں اور اس کے احکام بجا لاتے ہیں آہستہ آہستہ تباہ ہو رہے ہیں سرکشی کرنے والے لوگ اور ٹیکسوں سے گریز کرنے والے زیادہ سرکش ہوتے جا رہے ہیں اور وہ ٹیکس بھی ادا نہیں کرتے۔ کسی ملک کی خوشحالی کا دارومدار ہلکے ٹیکسوں اور فوج اور دوسرے محکموں میں مناسب اور ضروری تقرریوں پر ہوتا ہے۔ لوگوں کو یہ اصول واضح طور پر سمجھنا چاہیئے۔''

یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ مشاہدات اٹھارویں صدی کے انتشار پرور حالات کے بارے میں ہیں۔

سیاسی سرگرمیاں

دوسرے مسلم ممالک میں اسی قسم کی تحریکوں کی طرح شاہ ولی اللہ کی تحریک کا جو برصغیر میں اپنی نوعیت کی پہلی تحریک تھی۔ مدعا یہ تھا کہ مسلمان معاشرے کی داخلی گراوٹوں کو روکا جائے اور خارجی زیادتیوں کے مقابلے میں اس کی مدافعت کی جائے۔ ایک عالم دین اور مذہبی مصلح ہونے کی بناء پر انہوں نے اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ اگر اسلام کے بلند اصولوں کو حاصل کرنا ہے تو نئے انداز نظر کی لازماً ضرورت ہے۔

شاہ ولی اللہ نے مسلمانوں کے مختلف گروہوں میں بنیادی اختلافات پر سمجھوتے کرانے کی بے حد کوشش کی۔ ان کے خیال کے مطابق کسی قوم کی نئی تشکیل کے لیے حکومت ایک لازمی ذریعہ اور ضروری واسطہ ہے۔

اپنی زندگی کے دوران شاہ ولی اللہ مسلم معاشرے کے اندر روح پھونکنے یا مغل سلطنت کو تباہی سے بچانے میں کامیاب نہ ہوئے تاہم ان کی کوششوں سے مرہٹوں پر قیامت ضرور ٹوٹی جس میں مسلمان احمد شاہ ابدالی اور نجیب الدولہ کے باہمی اتحاد کے ساتھ منسلک ہو کر لڑے لیکن اپنے رہنماؤں کی نااہلی کی وجہ سے فتح سے حاصل ہونے والے فوائد سے محروم رہے۔ انگریز اس برصغیر میں سب سے زیادہ فعال قوت کی صورت میں نمودار ہوئے اس وجہ سے سیاسی طور پر مسلمانوں کے احیاء کا جو معمولی سا امکان تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ بنگال میں رونما ہونے والے واقعات کی اہمیت کو پوری طرح نہ سمجھ سکے اور نہ ان نتائج کا اندازہ کر سکے جو ان اقتصادی تبدیلیوں کی بناء پر ہوئے جو ان واقعات کے عقب میں نمودار ہوئیں * تاہم آپ کی تعلیمات نے برصغیر میں موجود خطرات کے ساتھ ساتھ مستقبل کے دامن میں مسلمانوں کے لیے جو کچھ تھا اس سے آگاہی کا ایک نیا رخ بھی پیدا

* بنگال میں انگریزوں کا اقتصادی تسلط تو بکسر کی جنگ (1764ء) کے بعد قائم ہوا اور حضرت شاہ ولی اللہ 1762ء میں انتقال فرما گئے تھے۔ لہٰذا ان کے لیے اقتصادی تغیرات کے نتائج کو سمجھنے کا موقع ہی نہ آیا تھا۔ (مترجم)

کیا۔ یہ آگاہی 58-1857ء کے انقلاب کے لیے گویا نفسیاتی تیاری تھی اور 1857ء کا وہ انقلاب بعض پہلوؤں سے شاید مسلمانوں کے نقطہ نظر سے ان کے لیے خوش نصیبی کا واقعہ تھا کیونکہ ان تمام مصائب کے باوجود جو اس انقلاب میں انہیں پیش آئے اس نے ان کے ذہنوں کو نئے مداووں کی طرف متوجہ کیا۔

انہوں نے پے در پے تین بار جاٹوں، پھر سکھوں، پھر نادر شاہ کی قیادت میں ایرانیوں کے ہاتھوں دلی کی بربادی کے خوفناک مناظر دیکھے تھے۔ مرہٹوں کی طوفانی اٹھان کے امکانات نے والیان ریاست اور عوام ہر دو پر یکساں خوف طاری کر دیا تھا اور شمالی ہند کے بعض حکمران اس مشترکہ دشمن کے خلاف اتحاد قائم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے لیکن باہمی بداعتمادی نے اتحاد کے قیام میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ کوئی ایسا مضبوط رہنما نہیں تھا جس پر سب کو اعتماد ہوتا اور مغل شہنشاہ کے پاس نہ تو وسائل تھے نہ قوت ارادی کہ وہ مرہٹوں کے خلاف متحدہ قوتوں کی رہنمائی کرتا۔ اس موقعہ پر امید کی واحد صورت یہ تھی کہ ملکی سرحدوں سے پرے کسی نجات دہندہ کی تلاش کی جائے اور اس کے لیے احمد شاہ ابدالی کی ذات موزوں ترین دکھائی دیتی تھی۔ شاہ ولی اللہ نے مداخلت کے لیے اس سے درخواست کی۔

اپنی سیاسی سوچ میں شاہ ولی اللہ ایک حقیقت پسند انسان تھے۔ ایک ایسے انسان جنہیں اخلاقیات، سیاست اور اقتصادیات کے قریبی باہمی تعلق کے بارے میں کامل بصیرت حاصل تھی۔

انہوں نے مسلم معاشرے کے تمام طبقوں سے نہایت پرجوش انداز میں درخواست کی کہ وہ اُس خطرے کا احساس کریں جو ان کے سر پر منڈلا رہا تھا اور اپنے آپ کو اس کا پرزور مقابلہ کرنے کے لیے تیار کریں انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو لکھا:

> ''اللہ کی مشیت آپ سے تقاضا کرتی ہے کہ آپ عافیت کی زندگی ترک کر دیں، تلوار کھینچ لیں اور اس وقت تک اسے نیام میں نہ ڈالیں جب تک کہ دین صادق اور کفر کے درمیان حد فاصل نہ قائم ہو جائے کفار سزا نہ پا جائیں اور دوبارہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔''

5.3- شاہ ولی اللہ کے جانشین

موصوف کی رحلت کے نصف صدی کے اندر ہی مسلم اقتدار کے لیے پیدا ہونے والے خطرے اور اس کے بعد کے نتائج جنہیں وہ چشم بصیرت سے پہلے ہی دیکھ چکے تھے اور جس خطرے کے سدباب کے لیے انہوں نے کوشش بھی کی تھی اس نے مسلم اقدار کو ہر طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ ستمبر 1803ء کی دہلی کی جنگ نے ملک کے اس حصے میں مرہٹوں کی قوت کا خاتمہ کر دیا اور اہل برطانیہ دہلی کے شہنشاہ کو جسے وہ ''بیچارہ اندھا آدمی'' کہتے تھے بلا شرکت غیرے آقا بن گئے۔ اس برائے نام شہنشاہ کو دہلی کی فتح اور شاہی محلات کی لوٹ مار کے بعد جنرل ریگ نے ''علاقوں وغیرہ کی فہرست میں اس طرح مندرج کر لیا گویا وہ بھی غیر ذی

روح قسم کی کوئی چیز تھا'' اس واقعہ کے ظہور میں آنے کے بعد شاہ ولی اللہ کے لیے اور جانشین شاہ عبدالعزیز نے:

''ایک تحریک کا آغاز کیا تا کہ بھرپور عمل کے ذریعے کوشش کی جائے کہ ہندوستان میں اسلام کے دینوی زوال کی صورت میں ختم کی جا سکے۔''

شاہ ولی اللہ کے چار بیٹے شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی تھے۔ شاہ عبدالعزیز کو جو سب سے بڑے تھے اس تحریک کا قائد تسلیم کیا گیا۔ تحریک کو مقبول عوام بنانے کے لیے شاہ عبدالعزیز کارکنوں کی ایک ایسی جماعت تیار کرنے کے کام میں لگ گئے جس کے توسط سے اصلاحات کے کام کو پوری لگن کے ساتھ سرانجام دیا جا سکے۔ اوپر کا حکومتی طبقہ اچھی قیادت فراہم کرنے میں ناکام ہو گیا تھا جو امت مسلمہ کی یکجہتی کے لیے ضروری تھا۔ اس خلا کو پر کرنے کے لیے شاہ ولی اللہ کے پیروکار آگے آئے۔ شاہ عبدالعزیز نے ایک تاریخی فتویٰ جاری کیا جس کی رو سے ان علاقوں کو جن پر غیر مسلموں کا تصرف تھا دارالحرب قرار دیا۔

''جب کفار کسی مسلمان ملک پر مسلط ہو جائیں اور ملک کے مسلمانوں اور دوسرے قریبی اضلاع کے باقی عوام کے لیے انہیں مار بھگانا ناممکن ہو جائے یا ان کے دل میں ایسا کرنے کی معقول توقع بھی باقی نہ رہے اور کفار کی طاقت اس حد تک بڑھ جائے کہ وہ احکام اسلام کو اپنی مرضی کے مطابق ختم کر دیں یا باقی رکھیں اور کوئی شخص بھی کفار کی اجازت کے بغیر ملک کی مالیت اکٹھی نہ کر سکے اور مسلم باشندے پہلے کی طرح امن و امان کی زندگی بسر نہ کر سکیں تو ایسا ملک سیاسی طور پر دشمن کا ملک یعنی دارالحرب ہو جاتا ہے۔''

یہ فتویٰ گویا اس بات کا اعلان تھا کہ مسلمان ان واقعات جو ظہور پذیر ہو چکے تھے چپ چاپ رہ کر تقدیر پرستانہ انداز میں قبول کرنے کا رویہ ترک کر دیں۔ کافی عرصے تک شاہ عبدالعزیز اپنے والد کے دینی اور سیاسی فلسفے کی تبلیغ کرتے رہے۔ انہوں نے اپنے پیغام کا رخ صرف اونچے طبقے کے لوگوں اور خواص کی طرف نہ رکھا بلکہ عوام کے ضمیر کو متحرک کرنے کی کوشش بھی کی۔ انہیں بدلے ہوئے سیاسی اور اقتصادی حالات سے آگاہ کرنے اور ان کی عزت نفس اور اپنی تقدیر خود بنانے اور ایمان رکھنے کے لیے مساعی بھی کیں۔ کام مشکل تھا لیکن سرانجام دینے کے لائق بھی تھا۔ شاہ عبدالعزیز 17 جولائی 1823ء کو وفات پا گئے لیکن اپنے پیچھے ایثار پیشہ کارکنوں کی ایک ایسی شاندار جماعت چھوڑ گئے جن کے نام تمام مسلمانوں کے نزدیک قابل احترام ہیں۔ ان لوگوں میں شاہ اسماعیل شہید، مولانا عبدالحی، سید احمد شہید، مولانا محمد اسحق اور ان کے بھائی مولانا محمد یعقوب کے علاوہ ایک بڑا انبوہ بھی تھا جس کے افراد اس نصب العین کے لیے جو شاہ ولی اللہ نے ان کے سامنے رکھا تھا ویسی ہی وابستگی رکھنے والے تھے۔

شاہ عبدالعزیز نے پنجاب کو سکھوں کی حکومت سے آزاد کرانے کے لیے جہاد کی تحریک بھی شروع کی جس کے ہاتھوں مسلمانوں پر کئے جانے والے ظلم ناقابل برداشت ہو چکے تھے۔ اس تحریک کی قیادت کا اعزاز سید احمد شہید (1831ء.....1796ء) کو تفویض کیا گیا۔

5.4- سید احمد شہیدؒ

سید احمد شہید رائے بریلیؒ* میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے چھوٹی عمر میں ہی اپنا وطن چھوڑ دیا اور شاہ ولی اللہ دہلوی کے بیٹے شاہ عبدالقادر کی نگرانی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے دلّی آ گئے۔ انہوں نے اپنی تعلیم وہاں مکمل کی اور اس دور کے سب سے بڑے عالم دین شاہ عبدالعزیز کے مریدوں میں ان کا نام درج کرلیا گیا۔ غالباً انہی کے ایماء پر انہوں نے دہلی کی سکونت ترک کردی اور ٹونک جا کر امیر خان (والی ٹونک) کی ملازمت اختیار کی۔ 1817ء کے بعد جب امیر خان کے فوجی دستوں کو توڑ دیا گیا وہ دہلی واپس آ گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے مرید بنانے شروع کئے جن میں سے دو بہت مشہور ہیں ایک مولوی محمد اسمٰعیل جنہیں عام طور پر شاہ اسمٰعیل شہید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور دوسرے شاہ عبدالعزیز کے داماد مولوی عبدالحی۔ 1820ء میں سید احمدؒ تحریک کے لیے معاونت حاصل کرنے کی غرض سے دہلی سے روانہ ہوئے وہ پہلے سہارنپور گئے اور پھر رام پور اور وہاں سے کلکتہ کی طرف روانہ ہوئے پٹنہ میں بڑی تعداد میں لوگ ان کے مرید ہوئے اور اس سے آگے ان کا سفر گویا سراپا فتح وظفر تھا۔ 1822ء میں وہ مکہ مکرمہ کے سفر پر گئے اور (حج کے بعد) دہلی پہنچے جہاں سے وہ ایک بڑی جمیعت کے ہمراہ سندھ کے راستے افغانستان کی طرف روانہ ہوئے تاکہ سکھوں کے خلاف جہاد آزادی شروع کیا جائے۔ یوسف زئی قبیلے کے افغانوں نے جنہیں خود بھی سکھوں سے حساب چکانا تھا ان کا خیر مقدم کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اتر پردیش (صوبہ متحدہ آگرہ واودھ) بنگال اور بہار سے کافی رضا کار بھی دستیاب ہوئے اور روپیہ بھی فراہم ہوا۔ رضا کاروں اور روپے کی فراہمی ان کی شاندار تنظیم کی بدولت ہوئی۔ ابتدائی پسپائیوں کے بعد جو زیادہ تر یوسف زئیوں کی سرد مہری کے باعث ہوئیں، 1830ء میں پشاور کو فتح کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تاہم اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد وہ پشاور کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو گئے۔

1831ء میں انہیں اور ان کے پیروؤں کو بالاکوٹ کے مقام پر سکھ فوج کے ہاتھوں شکست ہوئی اور سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید میدان جنگ میں کام آئے۔ اُن کی مہم عسکری اعتبار سے ناکام ہوئی جس کے بڑے سبب مجاہدین کے درمیان رابطے کی کمی اور پٹھانوں پر سختی سے شرعی قوانین کا نفاذ تھے جبکہ وہ لوگ باقاعدہ حکومت کے عادی نہ تھے اور ان کے اندر ذاتی اغراض اور مفاد بھی کام کر رہے تھے** لیکن وہ آگ جو سید احمد شہیدؒ نے روشن کی تھی ساٹھ سال سے بھی زیادہ عرصے تک اہل برطانیہ کے لیے تشویش کا باعث بنی رہی۔ ان کی وفات کے بعد مولوی ولایت اور مولوی عنایت علی نے تحریک کی قیادت کو سنبھال

---

* شمالی ہندوستان میں ایک شہر۔

** امر واقعہ یہ ہے کہ مجاہدین دینی معاملات میں پرجوش تھے اور پٹھانوں کے اندر بیواؤں کے نکاح ثانی کے متعلق کراہیت پائی جاتی تھی تاہم سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ دشمن بہت چالاک اور عیار تھے اور انہوں نے مجاہدین کو وہابی اور تحریک جہاد کو تحریک وہابیت مشہور کر کے پٹھانوں کو ان کے خلاف بھڑکا دیا تھا۔

لیا اور سید احمد شہید کے بقیہ ساتھیوں نے مستانہ کے مقام پر مجاہدوں کی بستی قائم کی۔

5.5- فرائضی تحریک

بنگال میں اسی قسم کی ایک مذہبی سیاسی اصلاح کی تحریک کی بنیاد 1804ء میں حاجی شریعت اللہ نے رکھی تھی جو فرید پور ضلع کے گمنام ماں باپ کے گھر پیدا ہوئے تھے۔ جب وہ اٹھارہ سال کے ہوئے تو حج کے لیے مکہ معظّمہ گئے لیکن وہاں سے واپس آنے کی بجائے وہ وہیں رہ گئے اور حاجی طاہر السنبل المکی کے مرید بن گئے جو ان دنوں وہاں شافعی مکتب خیال کے سربراہ تھے۔ بیس سال کی غیر حاضری کے بعد تقریباً 1802ء میں وہ ایک عمدہ بحث کرنے والے اور عربی زبان کے اچھے عالم بن کر واپس آئے۔ چند سال تک شریعت اللہ خاموشی سے اپنے آبائی ضلع کے دیہات میں اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کرتے رہے۔ جس کے بدلے میں انہیں بہت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے بڑے مخلص پیروؤں کے ایک گروہ کو بھی اپنی طرف کھینچ لیا۔ رفتہ رفتہ ایک نیک اور مخلص شخص تسلیم کر لیا گیا۔

حاجی شریعت اللہ کی تحریک کا مقصد مسلمان کسانوں کو ہندو زمینداروں اور انگریز حاکم کے مظالم کے خلاف متحد کرنا اور مسلمان معاشرے کی اصلاح کرنا تھا۔ تحریک نے کسانوں میں غیرت مند اور حریت کے جذبات پیدا کئے تحریک کے اہم پہلو یہ تھے:

(i) انگریز کے قبضے میں آنے کے بعد ملک دارالحرب بن گیا ہے۔ اس لیے جمعہ اور عیدین کی نماز جائز نہیں (جب تک آزاد ہو کر پھر دارالسلام نہ بن جائے)

(ii) مسلمان معاشرے میں پیر اور مرید کے سلسلے کو استاد اور شاگرد کے سلسلے میں بدلنا۔ پیروں اور مذہبی پیشواؤں کا غیر ضروری حد تک احترام ختم کر کے مسلمانوں میں مساوات قائم کرنا۔

(iii) مسلمان کسانوں کو متحد کرنا تا کہ وہ ہندو زمینداروں اور انگریزوں کی بے انصافیوں کا مقابلہ کر سکیں۔

ان کا بیٹا محمد محسن جو دودھو میاں کے نام سے زیادہ مشہور ہے اتنا عالم فاضل تو نہ تھا لیکن زیادہ فعال تھا اور اس کے اندر تنظیمی قابلیت بھی زیادہ تھی۔ اس کا اثر و رسوخ اس کے والد کے اثر و رسوخ سے بہت زیادہ تھا۔ دودھو میاں کی زندگی کے دوران جو سب سے نمایاں پیش رفت ہوئی وہ فرائضیوں کی تنظیم تھی۔ اس نے مشرقی بنگال کو مختلف حلقوں میں تقسیم کر دیا اور ہر حلقے میں اپنا ایک خلیفہ یا کارندہ مقرر کیا جو مرکزی تنظیم کے مقاصد کی تکمیل کے لیے عطیات وصول کرنے کا مجاز تھا۔ انہوں نے جو ذرائع اختیار کئے ان کی وجہ سے زمیندار اور نیل کی کاشت کرنے والے کاشتکار جلد ہی دودھو میاں کے خلاف باہمی اتحاد قائم ہو گیا۔

دودھو میاں نے کاشتکاروں اور دیہاتی مزدوروں کے اندر بہت بڑی تعداد میں لوگوں کو مسلمان بنایا۔ وہ تمام انسانوں

کے درمیان مساوات پر زور دیتا تھا اور نچلے طبقے کے لوگوں اور غریبوں کی فلاح و بہبود کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ تاہم جس چیز میں دودھو میاں نے مضبوط ترین مؤقف اختیار کیا وہ زمینداروں کی طرف سے ناجائز ٹیکسوں کا نفاذ تھا لیکن وہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گیا جب اس نے یہ اعلان کیا کہ ''زمین اللہ کی ملکیت ہے اور کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ بطور ورثہ اس پر قبضہ کرے اور اس پر ٹیکس عائد کرے'' 1838ء میں اس پر چند گھروں کو لوٹ لینے کے جرم کی اعانت کا الزام لگایا گیا اور 1848ء میں اسے قتل کے من گھڑت الزام میں سشن سپرد کیا گیا لیکن عدالت نے اسے بری کر دیا۔ چند دیگر موقعوں پر اسے مختلف وجوہ کی بناء پر مقدمات میں الجھایا گیا لیکن وہ عدم شہادت کی بناء پر بری ہوتا رہا وہ خود جھگڑوں کے فیصلے کرتا، سرسری عدالت لگاتا اور ہندو مسلم یا عیسائی کوئی شخص بھی اگر کسی معاملے کو اس کے سامنے پیش کئے بغیر قریبی منصف کی عدالت میں لے جاتا تو اسے سزا دیتا تھا۔

5.6- دوسری تحریکیں: تیتو میر شہید اور وہابی تحریکیں

تحریک مجاہدین کی مقبولیت کے اثرات بنگال پر بھی مرتب ہوئے جہاں تیتو میر ایک جواں مرد نے حکومت کی متشددانہ وصولیوں اور زمینداروں* کے ظلم وستم کے خلاف کسانوں میں پیدا ہونے والی بغاوت کی قیادت کی۔ 32-1831ء میں یہ تحریک فرید پور نادیا اور چوبیس پرگنہ اضلاع میں بڑے زوروں پر تھی بالآخر یہ لوگ مغلوب ہوئے خود تیتو میر شہید ہوئے اور ان کے تقریباً تین سو پچاس ساتھی قید کر لیے گئے۔

سرسید احمد بریلوی کی تحریک اور بعض دیگر تحریکیں جو اس تحریک سے پھوٹی تھیں انہیں مختصراً وہابی تحریک کا نام دے دیا گیا کیونکہ ان تحریکوں اور نجد کے عبدالوہاب کی تحریک کے درمیان بعض مشابہتیں تھیں۔ یہ تحریکیں جارحانہ انداز کی مسلم تحریکیں تھیں اور اس بات پر مصر تھیں کہ برصغیر کی مسلمان قوم ایک دینی سیاسی اکائی تھی۔ انگریزوں کے خلاف مسلمانوں کی عداوت اتنی پرزور اور اتنی نمایاں تھی کہ لارڈ ایلن برائے 1843ء میں اپنے وطن برطانیہ کی حکومت کو متنبہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اسے

> ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو، کی پالیسی پر عمل کرنا چاہیئے۔ اس نے لکھا تھا میں اس عقیدے کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا کہ وہ نسل (مسلمان) بنیادی طور پر ہماری مخالف ہے اور ہماری حقیقی پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کے ساتھ سمجھوتہ رکھیں۔''

مسلمان بڑے جذبے کے ساتھ اپنی مجروح انا کی تیمارداری میں مصروف تھے کیونکہ انہیں اقتدار کی مسند سے دھکیل دیا گیا تھا اور غاصب کے خلاف نفرت رکھتے ہوئے اور اپنے مجلسی اور اقتصادی شکوے شکائتوں کی تلخیاں دل میں لئے وہ اپنے اعلیٰ نظریات کے لیے لڑتے رہے۔ انہیں شکست تو ہوئی تھی لیکن برصغیر کی تحریکات آزادی کی تاریخ میں برطانوی دور کے آغاز ہی میں مسلمانوں نے غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے جو جرأت مندانہ کشمکش کی اس کو شکرگزاری کے ساتھ تواریخ میں مرقوم ہونا

---

* کسان عام طور پر مسلمان تھے اور زمیندار ہندو جنہیں مسلمانوں سے چھینی ہوئی جاگیریں دے کر زمیندار بنایا گیا تھا۔

چاہیئے۔مسلمانوں کی بغاوت پسندی کا یہ رخ ہندوؤں کی اس نرم اور تعاون والی حکمت عملی کے ساتھ، جو وہ غیر ملکی حکومت کے حق میں روا رکھتے تھے، عجیب وغریب تضاد کا حامل ہے۔ برطانوی راج کے خلاف جدوجہد کی وہ سرگرم اور واضح پالیسی جو مسلمانوں نے اختیار کر رکھی تھی ان کے لیے برطانویوں کی طرف سے دشمنی کا سبب ہوئی اور ہندو بھی ان کی ان مساعی کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سرکردہ ہندو اخبار ''ہندو پیٹریاٹ'' اگست 1870ء ہی میں گورنمنٹ اور ہندوؤں کو غیر وفادار مسلمانوں کے بارے میں متنبہ کر رہا ہے۔اس نے لکھا تھا:

> ''فرائضیوں اور وہابیوں جیسے فرقے خطرناک ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ ایک ایسا تیار مرکزی ڈھانچہ بنے رہتے ہیں جس کے گرد شورش پسندی کا مادہ جمع ہوسکتا ہے اور (ملک کے ویسے) نہایت خوشگوار حالات کے تحت انہیں ایک اتنی کثیر الانواح سلطنت کے اندر ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا.....ایسے فرقے غیر ملکیوں کو ملک کے اندر کھینچ سکتے ہیں یا چپکے چپکے طرح طرح کے جراثیم کا ارتکاب کر کے اس کے آنے کے لیے راستہ ہموار کر سکتے ہیں۔''

5.7- ہندوؤں پر اسلام کا اثر

جب مسلمانوں نے گنگا کے میدان کو فتح کیا تھا تو اس وقت ہندو معاشرہ بے لچک اور زوال پذیر تھا۔ذات پات کے نظام نے لوگوں کو منقسم کیا ہوا تھا اور مجلسی ناانصافی اور علم مساوات پیدا کرنے کا موجب بھی تھا۔ بدترین حالت اچھوتوں کے تھی جن کے محض ہاتھ لگانے سے (دوسری ذاتوں کے لوگوں کا) کھانا، کپڑے، استعمال کی اشیاء بلکہ جسم تک بھرشٹ (ناپاک) ہو جاتا تھا*۔کیونکہ جس شخص کو کسی اچھوت کا ہاتھ لگ جاتا تھا اُسے پاک ہونے کے لیے نہانا پڑتا تھا۔جنوبی ہند میں کسی اچھوت کا سایہ بھی اونچی ذات کے ہندو کو بھرشٹ کر دیتا تھا۔ بت پرستی اور توہمات عام تھے۔اسلام کے اثر کے تحت بعض (ہندو) مفکرین نے لوگوں کے عمومی خیالات کے خلاف بغاوت کی اور اُن کے مذہبی عقیدوں اور سماجی ڈھانچے میں اصلاح کرنے کی کوشش کیں۔ بہت سے فرقے جو مخالف درجوں میں اسلام سے قربت رکھتے تھے پیدا ہو گئے جن میں سے اہم ترین سکھ پنتھ تھا۔ دوسرے مکاتب خیال سے ''بھگتی تحریک'' بہت مقبول ہوئی کیونکہ یہ تحریک خدا سے محبت پر زور دیتی تھی۔

ہندوؤں میں اونچے طبقوں کے لوگ بڑی خوشحال زندگی بسر کرتے تھے۔ان طبقوں میں جاگیردار، رئیس، سرکاری ملازم، تاجر اور ساہوکار شامل تھے۔ ہندوؤں نے جلد ہی فارسی سیکھنا شروع کر دی اور اُن میں سے بعض نے اس زبان میں بڑی استعداد پیدا کی۔بعض ہندوؤں نے مسلم لباس اور مسلم رسم و رواج کو بھی اپنا لیا۔مسلمانوں کے ساتھ طویل اور گہرے رابطوں

* صرف اچھوتوں کے ہاتھ لگنے سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے ہاتھ لگنے سے بھی ہندوؤں کی ہر چیز بھرشٹ ہو جایا کرتی تھی اور مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی نفرت کا ایک نفسیاتی سبب یہ بھی تھا۔

نے ہندو معاشرے میں ٹھوس تبدیلیاں پیدا کیں۔ پانیکار کہتا ہے کہ:

''اسلام نے ہندوستان میں انسانی مساوات کا تصور اپنے مذہب پر تفاخر کا جذبہ اور ایک ایسا قانونی نظام متعارف کیا جو کئی لحاظ سے اس زمانے کے ضابطوں پر اضافہ تھا۔''

اس دور میں مسلم اور ہندو صوفیوں کے ملے جلے فرقے یا سلسلے بھی ظہور میں آئے مثلاً محمد شاہ دولہ کا قائم کیا ہوا سلسلہ، پنجاب کے ستھرے، لاہور کے چھجو پنتھی شمسی اور حسینی برہمنی، مذہب کے میدان میں ہندومت پر اسلام کا اثر زیادہ گہرا اور زیادہ دوررس ہے۔

زمانہ وسطیٰ کے ہندو خدا پرستی، بھگتی تحریک کا ظہور، ذات پات کے نظام میں نرمی، دم گھونٹنے اور روح کو قتل کرنے والی مذہبی رسوم سے رہائی اُن سب کی جڑیں اسلام کے اثرات میں مشاہدہ کی جاسکتی ہیں۔

اجتماعی تعلیم ''جس سے ہندوستان ہندوؤں کے عروج کے بہترین ادوار میں بھی نا آشنا رہا'' ہندو قوم کے لیے اسلام کا ایک اور تحفہ تھا۔

علاقائی زبانوں کا فروغ اُس حوصلہ افزائی اور سرپرستی کا نتیجہ تھا جو ان زبانوں کے ادیبوں کو مسلم حکمرانوں کی طرف سے حاصل ہوتی رہی۔ ان زبانوں کا احیاء غالباً سب سے مؤثر قوت تھی جس نے ہندوؤں کو ایک نئے ثقافتی اور مذہبی عمل کی طرف متوجہ کیا۔

اسلام کا ثقافتی اور مذہبی اثر گہرا اور دور تک سرایت کرنے والا تھا۔ مذہب، نظامِ فکر، زبان، ادب، فنون، تعمیرات، مصوری، موسیقی، لباس، خوراک، باغبانی، مکانوں اور شہروں کی ساخت اور طرز تعمیر سب پر مسلم اثرات کا غلبہ ہوا اور زندگی کے ان تمام پہلوؤں میں ثروت مندی اور تنوع پیدا ہوا۔

''بے شک اسلام اپنے واضح معین اور سادہ ایمان کے ساتھ، جو خدا کے متعلق تصورات اور قیاسات تھے ان کے ذہنی انتشار کے متضاد تھا، مذاہب کے پریشان کن مسئلے کے تسلی بخش حل کی صورت میں بہت سے ہندوؤں کے لیے پرکشش ثابت ہوا جبکہ باقی لوگوں کے لیے اس کی معاشرتی جمہوریت ذات پات کے بندھنوں سے رہائی کی ایک خوشگوار صورت تھی۔''

5.8- خود آزمائی نمبر 4

سوال نمبر 6 مجدد الف ثانی کے اصلاحی کردار پر مختصراً بحث کیجئے۔

(جواب کا موازنہ 5.1 سے کیجئے۔)

سوال نمبر 7 مسلم معاشرے پر شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ مفصل تحریر کریں۔

سوال نمبر 8 شاہ ولی اللہ کے جانشینوں نے اُن کے مشن کو کس طرح جاری رکھا۔ مفصل لکھیں۔

سوال نمبر 9 مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھیں۔

(i) تیتو میر کی تحریک (ii) وہابی تحریک (iii) فرائضی تحریک

سوال نمبر 10 ہندوؤں پر اسلام کے اثرات کا مختصراً جائزہ لیجئے۔

6۔ ثقافتی نشوونما وارتقاء

6.1- تمہید

غزنی کی قبا لاہور کے جسم پر راس آئی تو وہ ''غزنی خورد'' کے نام سے معروف ہوا۔ بعد کے زمانے میں دہلی، غزنی اور لاہور کی ثقافتی روایات کی وارث قرار پائی۔ 1258ء میں منگولوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کے بعد دہلی اغلباً شرق اسلام کا اہم ترین ثقافتی مرکز بن گئی۔ جب مرکزی اور مغربی ایشیا میں علمی مراکز تباہ ہو گئے تو دہلی مسلم قوت کا بڑا مرکز بن گیا۔ اس وقت یہ شہر مسلم ارباب دانش کے لیے جو متواتر بڑھتی ہوئی تعداد میں آتے رہے جائے پناہ بن گیا اور ان لوگوں کی آمد سے دربار دلّی کی شان و شوکت میں اضافہ ہوا۔ بلبن سلطان کو ان ممتاز پناہ گزینوں کا بڑا لحاظ تھا۔ اس کے بعد جو دور حکومت ارباب علم کی سرپرستی کے لیے مشہور ہوا وہ علاؤالدین خلجی کا زمانہ تھا۔ محمد بن تغلق اور فیروز شاہ تغلق بھی علم کے سرپرست تھے۔ سلطنت کی ثقافتی زندگی کو سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں نیا ولولہ کار حاصل ہوا۔ سلاطین دہلی نے علمی زندگی کی جو بنیادیں استوار کی تھیں اُنہی پر مغل بادشاہوں نے ثقافتی نشوونما کی عظیم الشان عمارت تعمیر کی۔

6.2- تعلیم

مسلمان ضروری علمی اداروں کے قیام میں گہری دلچسپی لیتے رہے۔ تعلیم مفت اور عام تھی۔ انفرادی طور پر علماء اور ارباب دانش کو حکومت کی طرف سے عطیات دیئے جاتے تھے تاکہ وہ علم کے اُن شعبوں میں تعلیم و تدریس کا کام سرانجام دیتے رہیں جن میں اُنہوں نے اختصاص حاصل کیا ہو اور جن شعبوں میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے طلباء اُن دانشوروں کے گرد اس لیے جمع ہو جاتے تھے کہ وہ اپنے علم و ہنر میں باکمال ہوتے تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے یونیورسٹیاں اور کالج جنہیں مدرسے کہا جاتا تھا حکومت اور جذبہ خدمت سے سرشار اصحاب ثروت کی طرف سے قائم کیے جاتے تھے۔ ان میں سے صرف چند مشہور ترین درسگاہوں کے نام ہم تک پہنچے ہیں۔ اُن کی فراوانی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے تنہا دہلی میں تقریباً ایک ہزار درسگاہیں معلوم کی تھیں۔

مسلم جاگیردار طبقے نے اپنی مرضی سے اور علماء وصوفیاء نے اپنے شغل حیات اور طبعی میلان کی بناء پر لڑائی بھڑائی اور سیاسی انتشار کے حالات میں بھی علم کے وجود کو قائم رکھا اور علم کی یہ بقا اُن کی اپنی زندگی کی مثال اور سرپرستی کے مرہون منت تھی۔ ریاست کے ہاں تعلیم کا کوئی حکومتی شعبہ تو نہ تھا لیکن وہ تعلیم کے پھیلاؤ اور علم کی اشاعت کی مختلف طریقوں سے حوصلہ افزائی ضرور

کرتی تھی۔ تعلیمی ادارے قائم کرنے اور انہیں جاری رکھنے کے لیے کھلے دلوں روپیہ دیا جاتا تھا اور اچھی شہرت رکھنے والے اساتذہ اور ارباب علم کو امدادی عطیات بھی دیئے جاتے تھے۔ ان عطیات میں اُمراء و روساء کی طرف سے اضافہ بھی کیا جاتا تھا۔ سکول، مکتب اور پاٹھ شالائیں تمام قصبوں اور دیہاتوں میں موجود تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے دینی اور دنیوی ہر دو شعبوں کے مدرسے یعنی اعلیٰ درسگاہیں موجود تھیں۔

☆ ایڈم کے قول کے مطابق انیسویں صدی کے چوتھے عشرے (1831ء سے 1840ء کے درمیان) تنہا بنگال اور بہار میں ایک لاکھ ابتدائی سکول (ہر چار سو افراد کے لیے ایک سکول) موجود تھے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے بنگال میں 1800 کالج موجود تھے۔

☆ ہمایوں بادشاہ نے دہلی میں دینی اور دنیوی علوم کی تدریس کے لیے ایک مدرسے (کالج) کی بنیاد رکھی تھی۔

☆ اکبر بادشاہ بچوں کی تعلیم و تدریس میں خصوصی دلچسپی لیتا تھا جنہیں وہ گلستان حیات کی نازک ترین کلیاں کہا کرتا تھا اور اُس نے ابتدائی سکولوں کے نصاب تعلیم میں اصلاحات نافذ کی تھیں۔ اُس نے نصاب تعلیم میں منطق، حساب، علم پیمائش، جیومیٹری، علم نجوم، حساب مال، انتظام عمومی اور علم زراعت کے دنیوی شعبے جاری کر کے تعلیم کو غیر مذہبی رجحان دے دیا تھا۔ میر فتح اللہ شیرازی نے جو ''اپنے زمانے کا عظیم ترین دانشور تھا'' اکبر کی تعلیمی پالیسی کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ اکبر، ابوالفضل اور ماہم انگہ نے ایسے مدرسے قائم کیے جنہوں نے بڑی تعداد میں طلباء کو اپنی طرف کھینچا اور ان مدرسوں کو فخر تھا کہ اس دور کے بعض بہترین اساتذہ ان میں کام کرتے تھے۔ ایک شاہی حکمنامہ کے ذریعے اکبر نے ہدایت کی کہ کسی مرجانے والے امیر کی ایسی جائیداد جس کا کوئی وارث نہ ہو اور جو جائیداد عام طور پر واپس حکومت کی تحویل میں چلی جاتی ہے اُسے مدارس کی تعمیر اور دیکھ بھال پر صرف کیا جایا کرے۔

☆ شاہ جہان نے جامع مسجد دہلی کے نواح میں یک مدرسہ قائم کیا۔ اُن فاضل حضرات میں جن کی سرپرستی شاہ جہاں نے کی ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، ملا محمد فاضل، قاضی محمد اسلم اور چندر بھان برہمن قابل ذکر ہیں۔

☆ عالمگیر نے سلطنت کے تمام حصوں میں بڑی تعداد میں مدرسے قائم کئے اور طلباء کو ان کی اہلیت کے مطابق وظیفے دیئے۔ ملا نظام الدین نے جو عالمگیر کے عہد میں زندہ تھا ایک قلمی نصاب مرتب کیا جو درس نظامی کے نام سے معروف ہے۔ یہ نصاب عرصہ دراز تک مسلم یونیورسٹیوں اور کالجوں میں رائج رہا۔

اسلامی حکومت کے زوال سے پہلے کا فارسی اور عربی ادب جس میں دنیوی اور دینی ہر دو علوم شامل ہیں، اسلامی دنیا کی ادبی روایات میں ایک بلند مقام رکھتا تھا۔ ان مسلمان علماء کے ساتھ جو وسطی ایشیا ایران اور عربوں کی سرزمینوں میں موجود تھے ربط

وضبط قائم رکھا جاتا تھا۔ ہند اور پاکستان کے علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں نے علم حدیث اور فقہ کے مطالعات میں ایک بلند علمی معیار قائم رکھا۔ تہذیب وثقافت کا بلند معیار حقیقتاً اس عمدہ تعلیمی نظام کی وجہ سے تھا جو مسلمانوں کے تحت جنوبی ایشیا میں مروج تھا۔ حکمران اور ملک کے سرکردہ امراء بڑی بڑی لائبریریاں بناتے تھے۔ فادر مسزیق کے قول کے مطابق 1641ء میں آگرہ کی لائبریری میں چوبیس ہزار کتابیں تھیں جن کی قیمت کا تخمینہ پینسٹھ لاکھ روپے تھا۔ سنسکرت بلکہ یونانی اور لاطینی زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ بھی فارسی میں کیا جاتا تھا جو کہ ان دنوں میں ثقافت اور نفاست طبع کی زبان تھی۔

کرنل سلیمان جس کی اُنیسویں صدی میں ہندوستان کے راجوں نوابوں اور عوام کے ساتھ کافی تعلقات تھے برصغیر میں مسلمانوں کی تعلیم کے معیار کے بارے میں مندرجہ ذیل الفاظ میں اپنی رائے قلمبند کرتا ہے۔

> ''شاید دنیا میں چند ہی قومیں ایسی ہوں جن میں مسلمانان ہند سے زیادہ تعلیم کی نشر واشاعت کی ہو وہ شخص جو بیس روپے ماہانہ کے عہدے پر کام کرتا تھا وہ بھی اپنے بیٹے کو ایسی تعلیم دلاتا تھا جیسی کہ کسی وزیر اعظم کے بیٹے کی ہو۔'' آگے چل کر وہ لکھتا ہے ''ایک تعلیم یافتہ مسلمان شریف آدمی مناسب انداز میں بطلیموس کے علم نجوم، ارسطو کی منطق اور اخلاقیات بوعلی ابن سینا کے تلوسط سے بقراط اور جالینوس کے علمی کاموں سے آشنا ہوتا ہے اور وہ فلسفہ، ادب، سائنس اور فنون پر گفتگو کرنے کا ماہر ہوتا ہے اور ان شعبوں کی طرف اس کا میلان طبع بھی ہوتا ہے اور ان اضافوں کی نوعیت سے بھی آگاہ ہوتا ہے جو عصر جدید میں ان علوم پر ہوتے ہیں۔''

برفیئر ان دو امیروں کے ذہنی تجسس اور علم سے محبت کی بڑی تعریف کرتا ہے جن کے ساتھ اس کا قریبی واسطہ تھا۔ اُن میں سے ایک (دانشمند خان) جو علم نجوم، جغرافیئے اور علم الابدان کا طالب علم تھا گیسنڈی اور ڈسکارٹ کی کتابیں بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔

تعلیم نسواں اگرچہ اپنی وسعت کے اعتبار سے محدود تھی مگر اُوپر کے طبقوں میں خصوصیت کے ساتھ عام تھی۔ شہزادی گلبدن بیگم، ملکہ سلیمہ سلطانہ، شہزادی جہاں آراء بیگم اور شہزادی زیب النساء اپنے وقتوں کی انتہائی متمدن خواتین تھیں۔

6.3- فنون لطیفہ اور تعمیرات

مسلمان اپنے ساتھ وسطی ایشیا سے تعمیرات کی انتہائی ترقی یافتہ روایات اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ ان کا فن تعمیر اعلیٰ معیار کا تھا جو حقیقی محرابوں، قبہ دار چھتوں اور گنبدوں پر مشتمل تھا۔ محراب ایک تعمیراتی اسلوب ہے جس کی طاقت کا دارومدار پتھروں کی ایسی تراش میں ہے جس سے وہ اوپر کی طرف تو چوڑے ہوتے ہیں اور نچلی طرف تنگ۔ اُنہیں اس انداز سے نصب کیا جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اوپر لگے ہوئے ایک کلیدی پتھر کے توسط سے ملتے جاتے ہیں۔ ایک قبہ دار چھت محراب کی توسیعی

صورت ہوتی ہے جو اسی اصول پر بنائی جاتی ہے جبکہ گنبد قبہ دار چھت کی گولائی کو کہا جاتا ہے۔ اس طرز تعمیر کے فوائد یہ ہیں کہ بڑے بڑے فاصلوں کو رکاوٹ کے بغیر مسقّف کیا جا سکتا ہے اور عمارتیں زیادہ مضبوط اور زیادہ پرشکوہ ہوتی ہیں۔

فن تعمیر کے خصوصی اسلامی عناصر میں مینار، معلق اور چھوئی سہارا دینے والی محرابیں، شہد کے چھتوں جیسی جالیاں اور نصف گنبد والے دروازے بھی شامل ہیں۔ آرائشی موضوعات عربی حروف کے نقوش، اقلیدی اشکال اور روایتی گلکاریوں پر مشتمل ہوتے تھے جن کے اندر قرآن حکیم کی خوبصورت انداز میں لکھی ہوئی یا کھدائی کی ہوئی قرآنی آیات بھی ہوا کرتی تھیں۔

قطب الدین ایبک نے مسجد قوۃ الاسلام کا سنگ بنیاد اسی سال رکھا تھا جس سال دہلی فتح ہوا تھا۔ التمش نے مسجد کی وسعت کو دگنی سے زیادہ کر دیا اور قطب مینار بھی تعمیر کیا۔ ایبک کے زمانے میں مسلمان معماروں کی کمی تھی۔ علاوہ ازیں چونکہ ضرورت سخت تھی اس لیے پرانی ہندو عمارتوں کا تعمیراتی سامان استعمال کرنا پڑتا تھا۔ لہٰذا ان تعمیرات میں ہندوانہ خدوخال غالب تھے لیکن التمش کی تعمیرات کا اسلوب اسلامی تھا۔ منگولوں کے خطرے کے خلاف بلبن کی مصروفیت نے بڑے پیمانے پر تعمیراتی کاموں کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا تاہم منگولوں کے حملوں نے فنون لطیفہ اور فن تعمیر کو بہت تیز رفتاری عطا کیا۔ بہت سے اعلیٰ پائے کے معماروں اور دستکاروں نے دہلی میں پناہ حاصل کی اور اُنہوں نے بہت جلد ہند مسلم فن تعمیر کی پوری ہیئت کو بدل کر رکھ دیا۔ اُن ہنرمند پناہ گزینوں کی آمد کے بعد مسلم فن تعمیر میں گل آوری کا عمل شروع ہوا۔ علاؤ الدین خلجی نے مسجد قوۃ الاسلام میں اضافے کئے۔ ایک بہت بڑا تالاب جو ''حوض طلائی'' کہلاتا تھا کھدوایا۔ یہ تالاب ستر ایکڑ رقبے میں تھا اور اس کے قریب ہی اسی نام کا ایک مدرسہ بنوایا۔ مسجد جماعت خانہ جو درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء میں ہے جو ابھی تک باقی ہے قطب صاحب کی عمارات میں طلائی دروازہ اسلامی فن تعمیر کا انمول موتی ہے۔ علاؤ الدین خلجی نے سیکری کا نیا شہر بھی آباد کیا تھا۔

خاندان تغلق کے تخت دہلی پر متمکن ہونے کے ساتھ ہی مسلم فن تعمیر ایک نئے دور میں داخل ہو گیا۔ اس طرز تعمیر پر بنائی ہوئی عمارات نہایت عمدہ تناسبات اور سادگی کی خصوصیات کی حامل ہیں۔ غیاث الدین تغلق نے قطب صاحب کے مشرق میں ایک نیا شہر تغلق آباد تعمیر کیا جس کے قریب ہی سلطان کا مقبرہ ہے۔ محمد تغلق نے کئی عمارات بنوائیں۔

شاہ جہاں سے پہلے فیروز شاہ دہلی کے حکمرانوں میں سب سے بڑا معمار بادشاہ تھا۔ ہم اس کے بے شمار تعمیراتی کاموں کا جن میں محلات، مساجد، مقبرے، قلعے اور شہر شامل ہیں پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں۔ اس نے دہلی کے بعد ایک نیا شہر فیروز آباد تعمیر کیا۔ محلاتی قلعہ جس کا نام کوٹلہ فیروز شاہ تھا اس شہر کے اندر تعمیر کیا گیا تھا۔

کوٹلہ کے اندر دو تعمیرات خصوصی تذکرے کی مستحق ہیں ایک جامع مسجد اور دوسری ایک مخروطی ساخت کی تعمیر جس کے اوپر شوق مینار ہے۔ اگرچہ تیمور کے حملے نے دہلی کے تاریخی آثار پر کاری ضرب لگائی لیکن سادات اور لودھیوں نے بھی کئی مساجد اور مقبرے بنائے۔

صوبائی (یا علاقائی) طرز تعمیرات میں جونپور، مالوہ، بنگال، گجرات اور دکن کے آثار قدیمہ برصغیر میں مسلم فن تعمیر کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ صوبائی حکمران خانوادوں کی تعمیرات مسلمانوں کے تعمیراتی کمالات کی عظمت کے منہ بولتے شواہد ہیں۔ جونپور کے مشرقی حکمرانوں کی بنوائی ہوئی مساجد بڑی مستحکم اور پرشکوہ ہیں۔ مالوہ میں واقع شہر مانڈو اپنے محلات بارگھوں اور عظیم جامع مسجد کی بناء پر اپنے اردگرد ایک رومانی فضا لئے ہوئے ہیں۔ بہمنی سلطانوں نے بھی محلات مقبرے اور مساجد بنوائیں۔ دکن میں خاص طور پر عسکری تعمیرات میں کمال حاصل کیا۔ سلطنت گجرات نے نہایت عمدہ عمارات بنوائیں جن کی خوبصورت آرائش اور پتھر کی تراشی ہوئی جالیاں قابل دید ہیں۔ ملتان میں اولیاء کرام کے پانچ مشہور مقبرے تعمیری نمونوں میں ایک نیا آہنگ مہیا کرتے ہیں۔ اس زمانے میں بنگال میں بھی ہم بہت سے تاریخی آثار تعمیر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ مسجد آدینہ سکندر شاہ نے تعمیر کرائی تھی اور یہ ''اپنی طرز کی انتہائی اولوالعزمانہ تعمیر تھی جو مشرقی ہند میں استوار کی گئی تھی''۔ باگرہٹ کے مقام پر خان جہان کی ست گنبد مسجد ایک مشہور تاریخی عمارت ہے جس پر فی الواقعہ تہتر گنبد بنائے گئے ہیں۔ چھوٹا سونا مسجد مسلم بنگال کی مشہور ترین مسجد ہے جو علاؤالدین حسین شاہ کے دور حکومت میں تعمیر ہوئی تھی۔ کوڑ کی بڑا سونا مسجد 1526ء میں نصرت شاہ نے تعمیر کرائی تھی بنگال میں پتھر کے حصول میں مشکلات اور تعمیرات میں اینٹوں پر مکمل انحصار کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں جداگانہ نمونوں اور شکل و صورت کی تعمیرات ہونے لگیں۔ بنگال فن تعمیر کی بعض خصوصیتوں میں سے نیم دلانے میں صورت میں ڈھلوانی چھتوں، مٹی کے پلستر میں خوبصورت نقش و نگار اور تراشی ہوئی کارنسوں کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سلاطین دہلی کے زمانے میں مسلمانوں نے آرائش کے فنون مثلاً خوبصورت کتاب اور عربی حروف میں نقش گری کو بھی بہت ترقی دی۔ اُن کی گلکاری اور اقلیدی نقش و نگار کے نمونے ان کی تعمیرات کو خوبصورت بناتے تھے اور ان کی کتابوں کو بھی جگمگاتے تھے۔

> مغلوں کے دور میں ہند مسلم فن تعمیر نے انتہائی عمدگی حاصل کی۔ ایک لمبے اور مقابلتاً امن و خوشحالی کے دور اور اس کے ساتھ ساتھ افراط وسائل جو مغلوں کو حاصل تھے اُنہیں اپنی تعمیرات میں اعلیٰ تعمیراتی سامان لگانے اور خوبصورت انداز میں مکمل کرنے کے قابل بنا دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ تعمیر کرنے میں طبطانی دیووں کی طرح تھے اور ڈھانچہ مکمل کرنے کے بعد حسن کاری جوہریوں کی طرح کرتے تھے۔

مغل دور کی تعمیرات کا زیادہ دارومدار ان اشیائے تعمیر پر تھا جو برصغیر میں دستیاب تھیں اور آرائش میں وہ بعض ہندوانہ طریقے بھی کام میں لاتے تھے لیکن تعمیرات کی شکل وصورت اور انداز تعمیر میں وہ قطعاً مسلمان تھے۔ مغل طرز تعمیر کے نمایاں پہلو یہ تھے:

> ''بڑا گنبد، کونوں پر چھوٹے چھوٹے برج، ستونوں پر قائم ہونے والے بڑے محلاتی ہال اور ہند عرب نمونے کا صدر دروازہ ایک بڑے نیم قبے کی شکل میں سامنے کی دیوار میں دھنسا ہوا جو تمام عمارات کے ساتھ قابل

تعریف تناسب کا حامل ہو جبکہ اصل باب داخلہ ایک مستطیل دروازہ ہو جو اس محرب کے نیچے کھلتا ہو۔''

عمارتوں کی تعمیر کے لیے مزدور ہندوستان کے تقریباً تمام حصوں بلکہ افغانستان سے بھی آتے تھے۔ جونپور کے مقام پر بنا ہوا مشہور پل جو 1564ء میں تعمیر ہوا تھا اس کا نقشہ بنانے اور اصل تعمیر کے لیے ہنرمند کاریگر افغانستان کے ہزارہ قبائل کے علاقے سے لائے گئے تھے اور یہ لوگ انجینئرنگ میں ہنرمندی کے لیے مشہور تھے۔

پانی پت کی پہلی (جنگ) میں فتح حاصل کرنے کے فوراً بعد بابر نے ایک حوصلہ مندانہ تعمیراتی پروگرام کا آغاز کیا لیکن اس کا دور حکومت اتنا مختصر اور جنگ وجدل میں مصروفیت کا تھا کہ بہت کم قابل ذکر آثار باقی ہیں۔

ہمایوں نے اپنی تخت نشینی کے بعد دہلی کے نواح میں محلات اور باغات سے آراستہ ایک نئے شہر کی طرح ڈالی تاہم اب وہ تعمیرات موجود نہیں ہیں۔

اکبر کی تخت نشینی کے ساتھ ہی مغل تعمیرات کو ایک نیا ولولہ کار حاصل ہوا اور اس کے دور کے تاریخی آثار جو بعد میں آنے والی نسلوں کو ورثے میں ملے ابوالفضل کے اس اعلانیہ بیان کی توثیق کرتے ہیں کہ ''شہنشاہ انتہائی شاندار عمارتوں کے خاکے تیار کرتے ہیں اور اپنے قلب وذہن کے عمل کو پتھر اور مٹی کا لباس پہنا کر دنیا کے سامنے لاتے تھے۔''

دہلی میں شہنشاہ ہمایوں کا مقبرہ اکبر کے زیر نگرانی مغل فن تعمیر کے نشوونما وارتقاء کا ایک نمایاں نشان راہ ہے یہ مقبرہ ہمایوں کی بیوہ حاجی بیگم نے تعمیر کرایا تھا اور تعمیر کی نگرانی میرک مرزا غیاث نے کی تھی۔ ''یہ عمارت ایک بڑے باغ کے مرکز میں بنائی گئی ہے۔ مقبرہ ایک کھلے چبوترے کے اوپر تعمیر کیا گیا ہے جو مربع شکل کا ہے اور جس کا ہر پہلو 356 (تین سو چھپن) فٹ ہے۔ اس میں خصوصی دلچسپی کا مرکز اس کے گنبد کی تعمیر ہے۔ ہندی تعمیرات کی تاریخ میں پہلی بار کم از کم تکمیلی صورت میں ہم دہرے گنبد کی قابل توجہ طرز تعمیر کا مشاہدہ کرتے ہیں گنبد سازی کا یہ طریقہ مغربی ایشیا میں کافی عرصے سے کام میں لایا جا رہا تھا۔ اس طرز تعمیر کا وہاں پر استعمال اس امر کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ مقبرہ ہمایوں کا معمار ایران کے تعمیری تجربوں کے ساتھ براہ راست رابطہ رکھتا تھا۔ گنبد دو جداگانہ خولوں پر مشتمل ہے ایک بیرونی اور دوسرا اندرونی جن کے درمیان ایک خلا ہے۔ بیرونی خول اوپر کے مرمر کے کام والے حصے کو سہارا دیتا ہے جب کہ اندرونی خول نیچے کے گیج والے گنبد کی سقف بناتا ہے''

آگرہ سے چھبیس میل کے فاصلے پر فتح پوری سیکری کے مقام پر نئے دارالحکومت کی تعمیر اکبر کی ذہانت کا غالباً سب سے زیادہ قابل ذکر ثبوت ہے۔ نئے محلاتی قلعہ کی تعمیر کو بجلی کی سی سرعت سے آگے بڑھایا گیا۔ تناسب کے مطابق بنایا ہوا تعمیری مسالہ کامل اور تیار صورت میں موقعہ پر لایا جاتا تھا جہاں اسے فوری طور پر استعمال کیا جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہانگیر کے الفاظ کے مطابق ''وہ پہاڑی جو جنگلی جانوروں کی آماجگاہ تھی ایک شہر بن گئی جس میں ہر طرح کے باغات، تعمیرات، شاندار عمارتیں اور خوش

منظر محلات تھے جو آدمی کے دل کو اپنی طرف کھینچتے تھے۔ بلند دروازہ جو سنگ مرمر اور ریتلے پتھر سے بنا ہوا تھا اور جو مسجد کا جنوبی باب داخلہ ہے اس شہر کا خوبصورت ترین اور دل کو لبھانے والا پہلو ہے۔'' اسے تمام برصغیر کے اندر ایک کامل ترین نمونہ فن تعمیر کہا گیا ہے اور اس کا جو اثر ایک عام آدمی کے ذہن پر مرتب ہوتا ہے اس کا اندازہ ذیل کے بیان سے کیا جا سکتا ہے جو ایک فرانسیسی سیاح کا ہے جو فتح پوری سیکری آیا تھا۔

''محراب کھلے ابرووی والی صبح کی طرح سے ہے اور اس کی برجیاں کہکشاں کی مانند ہیں۔ ایک حیرت افزا الفاؤ احساس کی ایک الہامی تعمیر جو اس مستحکم قوس کے سامنے آدمی کی ذات کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے جہاں سے ایسے محسوس ہوتا ہے گویا کامرانی کی صدا بلند ہو رہی ہے جو مسلسل ہے اور سینکڑوں شہنائیوں کی آواز سے زیادہ بلند اور اس بارگاہ سے بلند ہو رہی ہے جو اسے ہندوستان کے افق پر نہایت فخر کے ساتھ سرفراز کرتی ہے۔''

شہر کی دیگر عمارات میں سے یہ عمارات سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ جامع مسجد، جودمابائی کا محل، دیوان عام، ترکی سلطانہ کے نام سے منسوب بارگاہ، بیریل کا دولت کدہ، دیوان خاص اور شیخ سلیم چشتی کا مقبرہ جو سنگ مرمر کی بنی ہوئی موتی جیسی خوبصورت عمارت ہے جس میں سنگ مرمر کی جالیاں لگی ہیں۔

اکبر نے آگرہ، لاہور اور الہ آباد کے مقام پر محلاتی قلعے تعمیر کرائے۔ اکبر کا قلعہ لاہور متوازی الاضلاع کی شکل کا ہے جس کا اضلاع 1200 فٹ 1050 × فٹ ہیں۔ تعمیری کام جو ابھی تک موجود ہے ویسا ہی ہے جیسا اُسی طرح کی عمارات کا آگرہ میں ہے۔ تاہم ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جو کاریگر ان عمارات پر کام کرتے رہے ہیں وہ اُن کاریگروں سے بہتر تخیل رکھنے والے تھے جنہوں نے آگرہ میں کام کیا تھا۔

جہانگیر کے عہد حکومت میں تعمیر کی جانے والی عمارتوں کی تعداد اُس کے باپ کے زمانے کی تعمیرات کے مقابلہ میں بہت کم ہے۔ پھر بھی ان میں سے بعض عمارات غیر معمولی دلچسپی اور خوبیوں کی مظہر ہیں۔ مقامی ارضی خصوصیتوں کے مطابق باغوں کی تعمیر میں خاص طور پر بہت ترقی ہوئی جس کا بہترین نمونہ کشمیر کا شالامار باغ ہے۔ آگرہ میں اعتماد الدولہ کے مقبرے سے زیادہ خوبصورت کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

یہ مقبرہ جسے فن تعمیر کا چھوٹا سا موتی کہا جاتا ہے۔ مغل فن تعمیر کی خوبصورت عمارتوں میں سب سے زیادہ خوبصورت مثال ہے۔ لاہور اور دوسرے مقامات پر تعمیر ہونے والی عمارات میں جہانگیر کے دور کی قابل ذکر تعمیر سکندرہ میں اکبر کا مقبرہ ہے جسے خود اکبر نے تعمیر کروانا شروع کیا تھا اور جہانگیر نے مکمل کرایا تھا۔

جہانگیر کے دور حکومت کے آخری سالوں کا ایک اور تعمیراتی کارنامہ خود اُس کا اپنا مقبرہ ہے جو شاہدرہ (لاہور) کے مقام

پر اُس کی ذہین وفطین ملکہ نور جہاں بیگم کے حکم پر مکمل ہوا تھا۔ یہ مقبرہ ایک بہت بڑے باغ کے وسط میں تعمیر کیا گیا ہے اور دریائے راوی کے پرانے کنارے پر واقع ہے۔

تاہم شاہ جہاں کے عہد حکومت میں پہنچ کر ہندی اسلامی طرز تعمیر نے کمال حسن و جمال حاصل کیا۔ ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ سنگ مرمر کے تمام تر استعمال کی وجہ سے اُس کی تعمیر کرائی ہوئی عمارتیں بہت جذبات انگیز اور پرشوکت ہیں اس طرز تعمیر میں عمارات کی اعلیٰ پیمانے پر مرصع کاری ہوتی تھی جو خوبصورت انداز میں تراشی ہوئی مرمر کی جالیوں، مرمریں کی خوبصورت سلاخوں اور کنگروں اور گچ کے اندر پچی کاری میں پھولوں، پودوں اور حیوانی زندگی کی حسین نقش کاریوں میں ظاہر ہوتی تھی۔ تعمیری مصارف جو شاہجہان کی بنوائی ہوئی عمارات پر ہوئے بہت زیادہ تھے۔ ایک اندازے کے مطابق صرف تاج محل کی تعمیر پر پینتالیس لاکھ پاؤنڈ سٹرلنگ خرچ اٹھا تھا۔ بہت سے محلات، باغات، موتی مسجد جو دنیا کی خوبصورت ترین ذاتی عبادت گاہ تھی تاج محل آگرہ اور وہاں کے دوسرے محلات اور باغات اور دہلی کی جامع مسجد، عیدگاہ اور محلات کے علاوہ اُس نے لاہور میں بھی محلات اور باغات تعمیر کرائے۔ کابل میں بھی ایک قلعہ، ایک محل اور ایک مسجد بنوائی اور چند عمارات کشمیر اجمیر، احمد آباد اور دوسرے مقامات پر بھی تعمیر کرائیں۔ لاہور کی مسجد ''وزیر خان'' جو 1634ء میں تعمیر ہوئی تھی ایک نہایت شاندار عمارت ہے۔ اس کی مصفا چمکتی ٹائیلوں سے پہلی بار تو شوخ وشنگ رنگوں کا ایک سماں بندھ گیا ہوگا۔ لاہور کی دیگر تعمیرات میں گلابی باغ کا دروازہ، چوبرجی، مقبرہ علی مراد خان، مقبرہ شرف النساء بیگم، شالیمار باغ اور مسجد دائی انگہ کا ذکر مناسب ہے۔ اس کے اطراف بدلتے ہوئے رنگوں کی بناوٹ سے جو یا تو پھولوں کے نمونوں میں رنگوں کی آمیخت سے بنائی گئی ہے یا روائتی نمونوں کے چوکھٹوں میں خیرہ کر دینے والی چمک دمک لئے ہوئے ہے بے حد حسین وجمیل ہیں۔ سندھ میں شاہ جہان نے ٹھٹھہ کے مقام پر ایک مسجد کی بنیاد رکھی تھی۔ *

تاج محل کا کام 1631ء میں شروع کیا گیا اور 1653ء تک یہ کام مکمل نہ ہوا تھا۔ اس پر بیس ہزار کارکن روزانہ کام کرتے تھے۔ تاج محل کی بلند ترین عظمت اُس کے گنبد کی صورت اور جسامت میں ہے جو ایک بلند روکرسی پر رکھا ہوا ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی بادل اپنے ہوائی تخت کا سہارا لئے ہوئے ہو اس کو ''خواب مرمر'' کا دیا جانے والا نام انتہائی موزوں ہے۔

جہانگیر نے کچھ زیادہ تعمیرات نہیں کیں۔ تاہم اورنگ آباد دکن میں ہم ''رابعہ دوراں'' کا مقبرہ دیکھتے ہیں جو شہنشاہ کی ملکہ تھی۔ اس کی ساخت کا انداز تاج محل سے لیا گیا ہے۔ تاج محل کی بے حد مرصع کاری کے بغیر اپنی سادگی اور زیبائی میں یہ مقبرہ شہنشاہ کے درویشانہ مزاج کا انعکاس ہے۔ مغل حکومت کے زمانہ مؤخر کے کارناموں میں لاہور کی بادشاہی مسجد بھی ایک نفیس ترین کارنامہ ہے۔

مشغلہ: مسلمان حکمرانوں اور ان کے دور میں بننے والی تعمیرات کا جدول تیار کیجئے۔

* یہ مسجد شاہجہاں مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں آوازوں کو چاروں طرف پھیلانے کا ایسا طریقہ رکھا گیا ہے کہ محراب میں کی جانے والی قرأت مسجد کے تمام حصوں میں یکساں طور پر سنائی دیتی ہے۔

6.4- مغل مصوری

برصغیر میں مسلمانوں کے ابتدائی حکمرانوں کے دور کی مصوری کے کاموں ہی سے بہت کم باقی بچا ہے۔ مصوری کے نمونے تو ہم تک بالکل ہی نہیں پہنچے اور ان کے بارے میں جو حوالے ہیں وہ صرف ادب میں ملتے ہیں۔ مغلوں کی آمد کے ساتھ مصوری ایک عظیم مکتب کی صورت میں اُبھری۔ مغلوں کا مکتب مصوری فی الحقیقت شاہی سرپرستی کی پیداوار تھا۔ تقریباً تیس سال کے اندر ہی اس مکتب مصوری کے قدم جم گئے اور رفتہ رفتہ یہ ''ایک ایسا سخت جان پودا بن گئی کہ تاریخ ہند کے تمام انقلابات کو برداشت کر گئی۔''

پہلا یورپی فن کار جس نے مغل فن مصوری کی تحسین کی وہ مشہور مصور ریمبران (Rembrandt) تھا۔ اُس کے پاس منی ایچرز (Miniatures) کا مجموعہ تھا اور اُس کے سوانح نگار کے قول کے مطابق اُس کی بیس تصاویر جو اُس نے 1638ء اور 1653ء کے درمیان بنائیں مغل اثر دیکھا جا سکتا ہے اُس کے اپنے ملک کے ہم عصر مصوروں کی مصوری میں مغل نمونوں کا احترام موجود ہے۔

مغل مصوروں کی مصوری کی وسعت اور کل مصورانہ کاموں کی فہرست کا مرتب کرنا تو مشکل ہے کیونکہ وہ یورپی، امریکی اور ایشیائی لائبریریوں اور لوگوں کے ذاتی مجموعوں میں بکھری پڑی ہیں۔ مغل فن مصوری کی تیار کی ہوئی تصاویر کو بہت نقصان اس وجہ سے پہنچا کہ مقامی آب و ہوا کے مقابلے میں اس کاغذ کی جو استعمال کیا جاتا تھا قوت مدافعت بہت کم تھی اور اٹھارویں صدی میں سیاسی اور عسکری نشیب و فراز بھی بہت ہوئے۔

مغل خاندان کا بانی بابر مصوری کا قدر دان ضرور تھا لیکن اُسے اس فن کی غور و پرداخت کا موقع نہیں ملا۔ اُس کے بیٹے ہمایوں نے ایران میں اپنی جلاوطنی سے دو مصوروں میر سید علی تبریزی اور عبدالصمد شیرازی کو ملازم رکھا۔ ان دو فنکاروں کو عام طور پر مغل مکتب مصوری کا بانی کہا جاتا ہے۔ اکبر نے اس مکتب مصوری کو مضبوط بنیادوں پر قائم کیا۔

پہلی اہم مہم یہ تھی کہ اکبر نے داستان امیر حمزہ کو مصور کرنے کا حکم دیا۔ اس مسودے کو مصور بنانے کے لیے چودہ سو تصاویر کی ضرورت پیدا ہوئی اور یہ منصوبہ مغل مصوروں کے لیے ایک تربیتی مکتب بن گیا یہ تصاویر عمل، اشیاء، انسانوں، درختوں اور جانوروں سے لبریز ہیں۔ داستان امیر حمزہ کے علاوہ ہمیں مہابھارت کے فارسی ترجمہ ''رزم نامہ'' اور جامی کی ''بہارستان'' میں بھی مصوری کی خوبصورت مثالیں ملتی ہیں۔ اس تمام عرصہ میں مغل مصور فنی تکنیک میں نئے نئے تجربات کی کوشش کرتے رہے۔ 1590ء تک مغل اسلوب پختگی کی حد تک پہنچ گیا اور اسے تاریخی کتابوں کو مصور کرنے کے دوران اظہار کے بہترین مواقع ملے۔ مسلم مصوروں کے علاوہ ابوالفضل بعض ہندو مصوروں کے نام بھی گنواتا ہے جن میں دسونت، بساول اور سانول داس شامل ہیں۔

جہانگیر کے زمانے میں مصوری میں دلچسپی کتابوں کو مصور کرنے سے ہٹ کر تصویری مجموعوں کے لیے فن پارے تیار کرنے میں لگ جاتی ہے۔ مصوری کا ایک پرجوش عاشق ہونے کے باعث اُس نے اپنے مجموعوں کے لیے اچھے نمونے حاصل کرنے کی غرض سے کارکنوں کی ایک تنظیم قائم کی۔ جہانگیر کی جمع کی ہوئی تصاویر اب لندن، واشنگٹن اور تہران میں ملتی ہیں۔ اپنے آپ کے بارے میں جہانگیر بیان کرتا ہے کہ:

> ''جب بھی کوئی (مصوری کا) کام میرے سامنے لایا جاتا ہے تو میں فوراً بتا دیتا ہوں کہ یہ فلاں مصور کا کام ہے اور اگر کوئی ایسی تصویر ہو جس میں کئی انسانوں کے چہرے ہوں تو بھی میں معلوم کر لیتا ہوں کہ اس میں فلاں چہرہ فلاں مصور کا بنایا ہوا ہے اور فلاں فلاں کا ہے۔ میں یہ بھی جان سکتا ہوں کہ اصل چہرہ کس نے بنایا ہے اور کس نے آنکھوں کی یا ابروؤں کی مصوری کی ہے۔''

اس سلسلے میں مصوروں کی ''شبیہہ سازی (Portraiture) سے وفاداری'' کے مسئلے سے الجھن بڑھتی رہتی ہے۔ لہٰذا وہ تصاویر میں چہروں کے ہجوم والی تصویروں سے بھی توجہ ہٹا کر ایسی تصویروں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں جن میں چہرے کم ہوں مغل مصور شبیہہ سازی میں کمال کو پہنچ گئے تھے۔ اُن کی تصاویر ان کے معمول کا صرف چہرہ ہی پیش نہیں کرتیں بلکہ اُس کے مکمل کردار کی نشاندہی بھی اس طرح کرتی ہیں گویا وہ اُس کی محض تصویر نہیں روح ہے۔ خواتین کی شبیہیں بھی کمیاب نہیں۔ اُس زمانے کے سرکردہ مصوروں میں اُستاد محمد نادر محمد مسعود، اُستاد منصور، بشن داس اور گوردھن ہیں۔

تاہم پرسی براؤن کے قول کے مطابق جہانگیر کے ساتھ مغل مصوری کی حقیقی روح زوال پذیر ہو گئی۔ شاہجہان میں مصوری کے لیے ویسا جذبہ نہ تھا جیسا اُس کے باپ میں تھا۔ وہ تعمیرات اور زیورات (ہیرے جواہرات) میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کے زمانے کی مصوری کا خصوصی وصف یہ ہے کہ سونے (سنہری روشنائی) کا استعمال بڑے اسراف کے ساتھ ہوتا تھا۔ تصویروں کی عمدگی تو برقرار رہی اور ان کی تخلیق اب بھی مکمل انداز میں تھی لیکن ان میں وہ قوت اظہار نہ رہی تھی۔

عالمگیر کی تخت نشینی سے مصوری کو دھچکا پہنچا۔ یہ فن جو جہانگیر کے عہد میں نصف النہار پر پہنچ چکا تھا اور شاہجہاں کے زمانے میں بہت زیادہ پختہ ہو چکا تھا۔ اب روبہ تنزل ہو گیا۔ عام طور پر یقین کیا جاتا ہے کہ عالمگیر مصوری کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ یہ بات درست نہیں۔ اُس نے بھی مصوروں کو ملازم رکھا اور شبیہہ سازی کا کام ان کے سپرد کیا۔ اُس کی چند اپنی شبیہیں بھی ہم تک پہنچی ہیں۔

اگرچہ اکبر کے عہد میں بعض تصاویر کپڑے پر بنائی گئیں لیکن رفتہ رفتہ تصاویر درآمد کئے ہوئے کاغذ پر اور پھر مقامی طور پر تیار کئے ہوئے کاغذ پر بنائی جانے لگیں۔ کاغذ کی درجہ بندیاں خام مال سے کی گئی جس سے وہ بنایا جاتا تھا یہ خام مال بانس، پٹ سن، کتان اور ریشم تھا۔ منتخب اوراق کو باہم گوند سے جوڑا جاتا تھا اور اوپر والے ورق کی سطح کو جس پر تصویر کشی مطلوب ہوتی تھی ہموار کر کے سنگ مروہ* سے ملائم کیا جاتا تھا۔ رنگ تقریباً پچیس مختلف رنگوں سے تیار کئے جاتے تھے جن میں سے بعض معدنی ہوتے تھے اور بعض عضویاتی، صمغ عربی ** شکر یا السی کے تیل کو جوڑنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

6.5- فنون صغیرہ

مسلمانوں نے موسیقی کی سرپرستی کی اور اسے ترقی دی۔ اُنہوں نے شخصی حسن افزائی کی اشیاء کی طرف بھی بہت توجہ دی۔ کئی دوسرے فنون کی طرح زیور سازی بھی کاریگری کے حسن، بناوٹ کی صفائی اور جزئیات کی طرف توجہ کے اعتبار سے کمال کی نئی بلندیوں تک جا پہنچی۔ زیورات میں جڑاؤ کا فن بھی بہت ترقی کر گیا۔ مردوں اور عورتوں کے استعمال میں آنے والے زیورات کے حجم اور تنوع میں اور ہیرے جواہرات کے استعمال میں جو پیش رفت ہوئی وہ کلیتاً حیرت انگیز تھی۔ مغلوں نے بعض نئے نمونے اختراع بھی کئے اور پرانے نمونوں کو بہتر بھی بنایا۔ کرن پھول (پھول کی شکل کی بالی) جھمکا (لٹکنے والی بالی) جہانگیری پہونچی (کنگن) اور جھومر (تکون نما زیور) جو پیشانی کے ایک طرف پہنا جاتا ہے اسی دور میں رائج ہوئے۔ جمیلہ بہوشان کی تحریر کے مطابق ان کا بڑا عطیہ تزئین و آرائش کے میدان میں تھا۔ سادہ چیزوں کی جگہ نفیس اور بیرونی ممالک کی چیزیں یہاں لائی گئیں تا کہ نفاست طبع رکھنے والے لوگ انہیں پہنا کریں۔''

مغلوں کے تحت کپڑے کی صنعت بھی خوب پھلی پھولی اور اٹھارویں صدی کے خاتمے تک برصغیر کو دنیا کی ایک کارگاہ کہا جا سکتا تھا۔ اکبر جہانگیر اور موخر الذکر کی ذہین و فطین ملکہ نور جہاں نے دستکار لوگوں کی ہنرمندی میں بڑی دلچسپی کا اظہار کیا۔ جامدانی، جمادہ، کمخواب، اونی شالیں اور مختلف قسموں کے زربفت کو برصغیر میں رائج کیا گیا۔ ڈھاکہ کی ململ کا دنیا بھر میں کوئی جواب نہ تھا۔

بہت سے نئے پھل، پھول، روٹی اور کھانوں کی متنوع اقسام کو برصغیر میں پہلی بار رائج کیا گیا۔ ان اشیاء کے ابتدائی نام ہی مقامی زبانوں میں شامل کر لئے گئے *** کیونکہ مقامی طور پر ان کے کوئی نام ہی نہ تھے اور یہاں ہندو اور مسلمان یکساں طور پر استعمال کرتے تھے۔

6.6- خود آزمائی نمبر 5

سوال نمبر 13 مغلیہ دور میں ہونے والی تعلیمی ترقی پر بحث کیجیے۔

سوال نمبر 14 مسلم دورِ حکومت میں فن تعمیر نے کس طرح ترقی کی، بیان کریں۔

سوال نمبر 15 مغلیہ عہد کی مصوری سے یورپ کو کس نے روشناس کرایا؟ کیا آپ اس فن کی ترقی اور اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔

سوال نمبر 16 مغلیہ عہد میں فن مصوری میں ہونے والی ترقی کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالیئے۔

---

* ایک قیمتی پھر جس میں سے سونے کے ذرات برآمد ہوتے ہیں۔

** گوند

*** مثلاً نان، خطائی، باقر خانی، یخنی، پلاؤ، فیرینی (شیرینی) کباب وغیرہ کی طرح کے سینکڑوں الفاظ برصغیر کی مقامی زبانوں میں شامل ہو گئے ہیں۔

7۔ تشریحات

-1	آسام۔ بنگال۔ بہار۔ گجرات	بھارت کی ریاستیں/صوبے جن کے نام اسلامی دور میں بھی یہی تھے۔
-2	آگرہ۔ اجمیر۔ الہ آباد۔ جونپور۔ اورنگ آباد۔ ناگور	بھارت کے شہر جو اسلامی دور میں تہذیب وتمدن کے مرکز تھے۔
-3	افغانستان	پاکستان کا شمال مغربی ہمسایہ اسلامی ملک
-4	ایران	پاکستان کا مغربی ہمسایہ اسلامی ملک
-5	بھرشٹ	پلید۔ ناپاک
-6	بہمنی سلطنت	دکن میں مسلمانوں کی سلطنت۔
-7	بدھ بھکشو	بدھ مت میں اہل دین۔
-8	پانی پت	بھات کا شہر جہاں 1526ء، 1556ء اور 1761ء میں برصغیر کی تین بڑی لڑائیاں لڑی گئیں۔ 1526ء میں بابر اور ابراہیم لودھی میں، 1556ء میں اکبر اور عادل شاہ سوری میں اور 1761ء میں احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں میں۔
-9	تیمور	وسط ایشیا کے تاتاریوں کا سردار جس نے 1398ء میں برصغیر پر حملہ کیا۔
-10	تیتو میر	اصل نام نثار مرزا۔ بنگال کے مسلمان کسانوں کا رہنما
-11	چٹاگانگ	بنگلہ دیش کا بندرگاہی شہر
-12	چشتیہ۔ نقشبندیہ۔ قادریہ۔ سہروردیہ	صوفیوں کے سلسلے
-13	دکن	بھارت کا جنوبی مرتفاعی علاقہ
-14	ریمبران	ہالینڈ (یورپ) کا مشہور مصور
-15	سید احمد بریلوی	انقلابی مسلمان لیڈر جو بالاکوٹ کے مقام پر 1831ء میں سکھوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔
-16	شیراز۔ تبریز	ایران کے شہر

-17	صوفیائے عظام	بڑے صوفی
-18	غزنی	افغانستان میں ایک شہر
-19	قطب الدین ایبک۔علاؤالدین خلجی۔محمد تغلق	برصغیر میں مسلمانوں کے دور میں عہد سلاطین (1206ء تا 1526ء) کے نامور بادشاہ
-20	مہابھارت	ہندوؤں کی مقدس کتاب
-21	مدرسہ	کالج.....اکیڈمی (اکادمی)
-22	مکتب	سکول۔
-23	نصیرالدین ہمایوں۔نورالدین جہانگیر۔محی الدین اورنگ زیب	برصغیر میں مغلیہ دور (1526ء تا 1857ء) کے حکمران

8۔ کتابیات

1. Qureshi, I. H. *A Short History of Pakistan, Karachi,* Karachi University, 1967.
2. Qureshi, I. H. *The Muslim Community of Indo. Pakistan Subcontinent. Ma,aref Ltd. Karachi,* 1977. (Second Edition)

یونٹ.....2

جدوجہد آزادی:

1857ء کی جنگ آزادی

تدوین:

ڈاکٹر محمد اسلم سید

فہرست مضامین

یونٹ کا تعارف 54

یونٹ کے مقاصد 54

1۔ پس منظر: مغلیہ سلطنت کا زوال اور برطانیہ کا عروج 55

2۔ جنگ آزادی کے اسباب 57

2.1- مذہبی اسباب 57

2.2- معاشی بدحالی 58

2.3- برطانوی توسیع پسندی 59

2.4- مسلمانوں کی حالت 61

2.5- سماجی ناانصافیاں 61

2.6- اصلاحات رائج کرنے پر غلط فہمیاں 62

2.7- ہندوستانی سپاہیوں کے مسائل 62

2.8- خود آزمائی نمبر 1 63

3- جنگ آزادی کی ابتداء 64

3.1- مولوی احمد اللہ شاہ 64

3.2- کارتوسوں کا واقعہ 64

3.3- میرٹھ کے واقعات 65

3.4- خود آزمائی نمبر 2 65

4- جنگ آزادی کے واقعات 66

4.1- دہلی 66

-4.2	اودھ	66
-4.3	پنجاب،صوبہ سرحد اور سندھ	67
-4.4	روہیل کھنڈ	68
-4.5	کان پور	68
-4.6	جھانسی	68
-4.7	خود آزمائی نمبر 3	69
-5	جنگ آزادی کیوں ناکام ہوئی؟	70
-5.1	تنظیم کا فقدان	70
-5.2	غیر مسلم آبادی کا رویہ	70
-5.3	بعض مسلمان رؤسا کی غداری	71
-5.4	روپے کی قلت	71
-5.5	مجاہدین آزادی کی صفوں میں انتشار	71
-5.6	دیگر عوامل	72
-5.7	خود آزمائی نمبر 4	72
-6	جنگ آزادی کی ناکامی کے نتائج	73
-6.1	برطانیہ کا انتقام	73
-6.2	ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ	73
-6.3	آزادی کے لیے جدوجہد	73
-6.4	خود آزمائی نمبر 5	74
-6	تشریحات	75
-7	کتابیات	76

یونٹ کا تعارف

اس یونٹ میں جنوبی ایشیا کی جدوجہد آزادی (1857ء) پر بحث کی گئی ہے۔ پہلا حصہ مغلیہ سلطنت کے زوال اور برطانوی سامراج کے عروج پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصے میں جنگ آزادی کی وجوہات بیان کی گئی ہیں۔ خاص طور پر مذہبی وجوہات، معاشی بدحالی، برطانوی حکومت کی توسیع پسندی، مسلمانوں کی زبوں حالی، سماجی ناانصافیاں، بعض اصلاحات جاری کرنے سے پیدا شدہ غلط فہمیاں اور مقامی سپاہیوں کے خصوصی مسائل۔ تیسرا حصہ جنگ آزادی کے آغاز سے متعلق ہے جس میں مولوی احمد اللہ شاہ اور چپاتی سکیم کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کارتوسوں کے واقعے اور میرٹھ میں مقامی سپاہیوں کے احتجاج کو بیان کیا گیا ہے۔ چوتھے حصے میں جنگ آزادی کے ان اہم واقعات پر روشنی ڈالی گئی ہے جو دہلی، بودھ، پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، روہیل کھنڈ، کانپور اور جھانسی میں رونما ہوئے۔ پانچواں حصہ ان وجوہات سے بحث پر مشتمل ہے جو جدوجہد آزادی کی ناکامی کا سبب بنیں ان میں خاص طور پر تنظیم کے فقدان، مقامی سپاہیوں کی صفوں میں انتشار، مالی وسائل کی کمی، غیر مسلم آبادی کے سلوک اور بعض مسلمان روساء کے رویئے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ برطانوی فوج کی تنظیمی برتری اور بہتر حکمت عملی کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔

اس یونٹ کا چھٹا اور آخری حصہ برطانوی ردعمل پر مبنی ہے جس میں انگریزوں کے انتقام، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ اور اس بات کا تذکرہ ہے کہ اگرچہ یہ جدوجہد کامیاب نہ ہوسکی تاہم اسی سے متاثر ہوکر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے جدوجہد آزادی کا ایک نئے رنگ سے آغاز کیا۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کو پڑھنے کے بعد طلباء اس قابل ہوجائیں گے کہ:

1- جنگ آزادی کا پس منظر بیان کرسکیں۔

2- جنگ آزادی کی اہم وجوہات پر بحث کرسکیں۔

3- یہ بتاسکیں کہ یہ جنگ کیسے شروع ہوئی۔ اس کے اہم واقعات کیا تھے اور جنگ آزادی کے اہم لیڈر کون تھے؟

4- جنگ آزادی کی ناکامی کی وجوہات پر تبصرہ کرسکیں۔

5- برطانیہ کے ردعمل پر روشنی ڈال سکیں۔

6- تاریخ میں جدوجہد آزادی کے واقعے کی اہمیت بیان کرسکیں۔

1۔ پس منظر: مغلیہ سلطنت کا زوال اور برطانیہ کا عروج

انگریز جنوبی ایشیا میں تاجروں کی حیثیت سے آئے۔ عظیم مغل حکمرانوں کے دور میں انہوں نے اپنی اس حیثیت کو برقرار رکھا۔ جب کبھی سیاست کا کھیل کھیلنے کی کوشش کی تو انہیں قرار واقعی سزا ملی۔ مگر ان کی یہ تاجرانہ حیثیت اسی وقت تک رہی جب تک کہ مغلیہ سلطنت میں دم خم تھا۔ اٹھارویں صدی عیسوی کی ابتداء میں مغلیہ حکومت میں انتشار اور بدنظمی کے آثار نمایاں ہونے شروع ہو گئے جو کہ آہستہ آہستہ سلطنت کے زوال کا باعث بنے۔

انگریزوں نے ان حالات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ جنوبی ایشیا کے ساحلی علاقوں پر اپنا قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے نصف تک انہوں نے جنوبی ایشیا کو اپنی سلطنت کا ایک حصہ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ تاہم آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو نام نہاد ''شہنشاہ ہند'' کہلانے کی اجازت دے دی جس کی حکومت صرف لال قلعے کی چار دیواری تک محدود تھی۔ ان انگریز تاجروں نے جو اپنے آپ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کہتے تھے اپنی سلطنت بنانے کے دوران ہر جائز و ناجائز طریقہ استعمال کیا جس سے ان کی شان و شوکت میں اضافہ ہوتا۔ جنوبی ایشیا کو ہر طریقے سے لوٹا گیا جس سے نہ صرف اس کی اپنی سیاسی حیثیت ختم ہو گئی بلکہ اس کی معیشت بھی مکمل طور پر مفلوج ہو کر رہ گئی۔

اس تمام سیاسی و معاشی کشمکش میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔ ان کی آٹھ سو سالہ حکومت اور شان و شوکت کے صرف چند نشانات باقی رہ گئے تھے جن میں ایک ان کا نام نہاد بادشاہ اور دوسرے وہ کھنڈرات جو ان کی عظمت رفتہ کی یاد دلاتے تھے۔ انگریز مذہباً عیسائی تھے اور انہیں صلیبی جنگیں نہیں بھولی تھیں جن میں مسلمانوں نے عیسائیوں سے اپنی برتری منوالی تھی۔ یہ بات مسلمانوں کو بھی معلوم تھی لہٰذا انگریزوں نے یہ سوچا کہ اگر وہ جنوبی ایشیا پر اپنی حکومت قائم کرانا چاہتے ہیں تو انہیں مسلمانوں کو اس قدر مفلوج کرنا پڑے گا کہ وہ پھر ابھر نہ سکیں۔ ایک مشہور انگریز ولیم ہاروڈ رسل جو کہ اپنی میانہ روی کی وجہ سے مشہور ہیں نے اپنے ہم وطنوں کو مشورہ دیا کہ:

> ''اگر ہم محمد کی مسجدوں اور روایات کو ایک مضبوط کوشش کے ذریعے ختم کر دیں تو یہ عیسائی مذہب اور برطانوی حکومت دونوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا۔''

اس قسم کے بیانات سے تاریخ کے صفحات پر ہیں اور ان سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ برطانوی حکومت کی حکمت عملی مسلمانوں کے حق میں زہر قاتل سے کم نہ تھی۔

برطانوی استعمار سے ہندوؤں نے بھی چند تبدیلیاں محسوس کیں۔ مغل حکمران عموماً انصاف پسندی اور رواداری کے قائل تھے کسی مغل حکمران کے تحت نہ تو ہندو اداروں کو تباہ کرنے کی کوشش کی گئی اور نہ ہی ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنایا گیا۔ انگریزوں

نے ان کے برعکس ہندوؤں کے مذہبی اداروں سے کسی قسم کی ہمدردی کا اظہار نہیں کیا بلکہ کھلم کھلا ان کے سماجی اور مذہبی اداروں سے نفرت کا اظہار کیا۔جس سے ہندوؤں میں بھی کسی حد تک انگریزوں سے بد دلی اور مایوسی کے جذبات پیدا ہو گئے یہی وجہ تھی کہ جب 1857ء میں مسلمانوں نے برطانوی حکومت کے خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز کیا تو ہندو بھی اپنے انداز میں کسی حد تک اس جدوجہد میں شریک ہو گئے۔

2۔ جدوجہد آزادی کے اسباب

1857ء کی جنگ آزادی کے کئی اسباب تھے۔ یہ دراصل مذہبی، معاشی، سماجی اور سیاسی پہلوؤں سے برطانیہ کے خلاف شدید نفرت کا اظہار تھی۔

2.1- مذہبی اسباب

جنوبی ایشیا میں انگریزوں کی حکومت قائم ہوتے ہی یہ تاثر عام ہو گیا کہ انگریز یہاں کے ہندوؤں کو عیسائی بنانے کے لیے آئے ہیں اٹھارویں صدی عیسوی کے آغاز میں کلکتہ کے گردونواح میں کچھ ڈچ علاقوں * میں مشنریوں نے اپنی کارروائیوں کا آغاز کیا ان سب سے اہم سیرام پور کا مرکز تھا۔ انگلستان سے جو عیسائی پادری آئے تھے اور کسی وجہ سے وہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے اجازت حاصل نہیں کر سکتے تھے وہ انہی مراکز سے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز کرتے تھے۔ انگریز گورنر جنرل ولزلی نے ان پادریوں کی سرپرستی کی اور ان کو کہا کہ جنوبی ایشیا کے باشندوں کی کم ہمتی دراصل عیسائیت سے ناواقفیت کی بناء پر ہے جس سے اس کی مراد یہ تھی کہ ان کو عیسائیت کے اصول وضوابط سے آگاہ کرنا بہت ضروری ہے اس کے ساتھ ساتھ اس نے فورٹ ولیم کالج (جس کا متفقہ مقصد کمپنی کے حکام کو تربیت دینا تھا) کے پرنسپل کا عہدہ قانونی طور پر پادری کے لیے وقف کر دیا۔ جب گورنر جنرل نے عیسائی پادریوں کو تبلیغی سرگرمیاں تیز کرنے کے لیے کہہ دیا تو ان حالات میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہو گا کہ دوسرے ماتحت افسروں نے ان کو کتنی مراعات دی ہوں گی یہاں تک کہ ان کو سکولوں، کالجوں، جیلوں، بازاروں اور مذہبی اور سماجی تہواروں میں جا کر عیسائیت کا پرچار کرنے کی کھلی چھٹی تھی۔

شروع شروع میں تو ان عیسائی مشنریوں نے ہندوؤں کو عیسائی بنانے پر زیادہ توجہ نہ دی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی سرگرمیوں کا دائرہ کار وسیع ہوتا گیا اور انہوں نے مسلمانوں کو بھی عیسائی بنانے کی کوششیں تیز کر دیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان علماء اور عیسائی پادریوں میں مباحثے ہونے لگے ان مباحثوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ فضا میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوئی اور لوگوں میں یہ تاثر عام ہو گیا کہ انگریز جنوبی ایشیا کے تمام باشندوں کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔ بعض انگریز حکام مثلاً الفنسٹن اور میور کھلم کھلا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخیاں کرتے تھے۔ مسلمانوں کے مذہب اور ان کی تاریخ پر انہوں نے نہایت متعصّبانہ انداز میں کتابیں لکھیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ برطانوی حکومت نے ہر ممکن طریقے سے انیسویں صدی کے پہلے نصف میں عیسائیت کا پرچار کیا۔ زیادہ سے زیادہ گرجے تعمیر کئے جن کی تعداد 1854 میں 142 تک پہنچ گئی۔

---

* وہ علاقے جہاں ولندیزی (یعنی ہالینڈ) کے باشندے کام کرتے تھے۔

مشن سکول کھولے گئے جن میں عام تعلیم کے بہانے عیسائیت کی تعلیم کو فروغ دیا تھا۔ جو بچے انجیل کے اسباق اور عیسائیت کے اصول وضوابط میں نمایاں کارکردگی دکھاتے تھے ان کو انعامات دیئے جاتے تھے۔ بچپن سے دوسرے بچوں کے ذہنوں میں بھی عیسائی مذہب کے متعلق زیادہ سے زیادہ جاننے کی خواہش پیدا ہوتی تھی۔ یہ تمام باتیں مسلمانوں اور ہندوؤں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کرنے کے لیے کافی تھیں کہ انگریز نہ صرف سیاسی بلکہ مذہبی طور پر بھی ان کے اداروں کی تباہی کے درپے ہیں۔

سب سے اہم فیصلہ جو انگریزوں نے اس سلسلے میں کیا وہ لارڈ میکالے کے تعلیمی نظام کو رائج کرنا تھا۔ میکالے نے عربی، سنسکرت اور دوسری مشرقی زبانوں اور علوم کو بیکار قرار دیا تھا اور اُس کا خیال تھا کہ صرف مغربی زبانوں اور علوم کے ذریعے جنوبی ایشیا کی تہذیب میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اس کی سفارشات پر برطانوی حکومت نے پرانے نظام تعلیم کو تبدیل کر کے ایک نیا نظام رائج کیا جس نے ہندوستانیوں کے شکوک وشبہات کو اور بھی زیادہ تقویت دی۔

2.2- معاشی بدحالی

مسلمانوں کے دور حکومت میں جنوبی ایشیا اپنی معاشی خوشحالی اور عمدہ تجارتی اشیاء کی وجہ سے مشہور تھا۔ برطانوی تاجروں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا مگر جب وہ برسر اقتدار آئے تو ان کی لوٹ کھسوٹ کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ان کا محبوب مشغلہ جنوبی ایشیا کے مقامی حکمرانوں کو آپس میں لڑانا تھا وہ ایک فریق کی مدد کرتے اور اس سے بھاری معاوضہ وصول کرتے مثلاً 1757ء میں انہوں نے میر جعفر کی مدد سے سراج الدولہ کو شکست دی تو میر جعفر سے 12,38,575 پاؤنڈ وصول کیے۔ اسی طرح تین سال بعد میر قاسم کی مدد کر کے میر جعفر کو معزول کروایا اور میر قاسم سے 2,00,269 پاؤنڈ وصول کیے۔ تین سال بعد پھر میر جعفر کو واپس لانے کے لیے اس سے 5,00,65 پاؤنڈ وصول کئے۔ اس کے علاوہ اور کئی ہتھکنڈوں سے روپیہ وصول کیا جاتا تھا گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہر جائز وناجائز طریقے سے روپیہ، عورتوں کے زیورات اور دیگر نادر اشیاء حاصل کیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ انگریزوں نے جنوبی ایشیا کی معاشی صنعتوں کو بھی تباہ کیا تاکہ انگلستان سے درآمد شدہ اشیاء مہنگے داموں بیچی جاسکیں خاص طور پر جنوبی ایشیا کے کپڑے کی صنعت جو کہ اپنی نفاست کی وجہ سے مشہور تھی مکمل طور پر تباہ کر دی گئی۔ ایک گورنر جنرل کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ہندوستان کے میدانوں میں کپڑا بنانے والوں کی کھڈیاں بکھری پڑی ہیں۔ اسی طرح ریشمی کپڑے کی صنعت کو بھی ختم کر دیا گیا اور جو صنعت بچ گئی اس پر اس قدر بھاری ٹیکس عائد کر دیئے گئے کہ وہ برطانوی اشیاء کا مقابلہ نہ کر سکے اور خود بخود ہی ختم ہو جائے۔

صنعت کے علاوہ زرعی پیداوار میں بھی بہت زیادہ کمی واقع ہوئی۔ کاشتکاروں سے بہت زیادہ لگان وصول کیا جاتا تھا اور زراعت کو ترقی دینے پر کوئی توجہ نہ دی جاتی۔ مغلیہ دور میں لگان بھی کم لیا جاتا تھا اور پھر لگان کی اس قسم کا زیادہ تر حصہ سڑکوں، نہروں اور پانی کے ذخائر پر خرچ کیا جاتا تھا جس سے زرعی پیداوار میں اضافہ ہوتا تھا لیکن ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے اس

سلسلے میں کوئی مثبت قدم نہ اٹھایا جو کچھ لگان اور مالیے کی صورت میں وصول کیا جاتا تھا وہ یہاں کی آبادی پر خرچ کرنے کی بجائے انگلستان کو روانہ کر دیا جاتا تھا۔ اس قسم کی معاشی حکمت عملی جنوبی ایشیا کے باشندوں کے لیے تباہ کن اثرات کی حامل تھی ان کی حالت روز بروز دگرگوں ہوتی جاتی تھی اور ان کو بہتر مستقبل کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔

2.3- برطانوی توسیع پسندی

کمپنی کا دور حکومت علاقائی توسیع پسندی کی وجہ سے کافی بدنام ہو چکا تھا۔ زیادہ سے زیادہ علاقہ حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کی کوشش کو جائز سمجھا جاتا تھا۔ معاہدے توڑے جاتے تھے۔ دوستوں کو دھوکا دیا جاتا اور قتل و غارت، سازش، جھوٹ غرضیکہ ہر ممکن طریقے سے علاقے ہتھیائے جاتے رہے اور وہ برطانوی سلطنت کا حصہ بنتے رہے ان میں سے چند ایک کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔

(الف) سندھ پر قبضہ

انگریزوں نے 1843ء میں سندھ پر قبضہ کیا۔ یہ واقعہ ایک غیر اخلاقی حرکت تھی جس کی مثال شاید دنیا کی تاریخ میں کہیں نہ ملے۔ ہوا یوں کہ برطانیہ کی فوجیں افغانستان میں لڑ رہی تھی اور ان کو رسد و اسلحہ کی فراہمی کے لیے انگریزوں نے سندھ کے امیروں سے اجازت طلب کی اگرچہ امیران سندھ اس بات کے خلاف تھے۔ تاہم انہوں نے برطانیہ کی ان خواہشات کو مان لیا۔ امیران سندھ اپنے وعدہ پر قائم رہے اور اگرچہ انگریزوں کو افغانستان اور بلوچستان میں ناخوشگوار حالات کا سامنا کرنا پڑا اور ہزیمت اٹھانا پڑی تاہم امیران سندھ نے ان کی اس حالت سے کسی قسم کا فائدہ نہ اٹھایا۔ مگر انگریز گورنر جنرل لارڈ ایلن برو اور اس کے ایک فوجی جرنیل سر چارلس نیپئر کے ارادے کچھ اور تھے انہوں نے سندھ کو ہتھیانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ امیران سندھ پر جھوٹے الزامات لگا کر ان کو ایک توہین آمیز معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ امیران سندھ اس معاہدے کو بھی منظور کرنے کے لیے تیار تھے مگر چونکہ انگریز اس علاقے پر قبضہ کرنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ ان تمام حالات سے مجبور ہو کر امیران سندھ کو انگریزوں سے لڑنے پر مجبور ہونا پڑا۔ جنرل لیپئر نے انگریزی روایات قائم رکھتے ہوئے امیران کے درمیان بھی نفرت کے بیج بوئے اور پیشتر اس کے کہ امیران سندھ متحد و منظم ہو کر انگریزوں کے خلاف لڑ سکتے۔ لیپئر نے ان کو شکست دے کر سندھ پر قبضہ کر لیا۔

دراصل انگریزوں کو ذلت افغانستان اور بلوچستان میں اٹھانا پڑی تھی اس کو زائل کرنے کے لیے انہوں نے مسلمانوں کے اس علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ الحاق سندھ کا واقعہ انگریزوں کی ناانصافی، ظلم اور انسان دشمنی کا زندہ ثبوت ہے جس میں انگریزوں نے انسانیت کے تمام اصولوں کو پامال کر دیا۔

(ب) پنجاب پر قبضہ

سندھ کے بعد انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کر لیا پنجاب اٹھارویں صدی کے آخری سالوں سے سکھوں کے زیر حکومت تھا۔ رنجیت سنگھ کی موت (1839ء) کے بعد پنجاب میں بدامنی اور انتشار پھیل گیا اور سکھوں کی آپس کی رقابتوں نے اس علاقے کے امن و امان کو تباہ کر دیا۔ انگریزوں اور سکھوں کے درمیان دوستی کے کئی معاہدے طے پا چکے تھے۔ بگڑی ہوئی صورتحال نے ان کو بھی متاثر کیا اور آخر کار انگریزوں نے سکھوں کو شکست دے کر پنجاب میں اپنا ریذیڈنٹ مقرر کر دیا لیکن 1847ء میں سکھوں نے انگریزوں کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا جس کے نتیجے میں 1849ء میں گجرات کی لڑائی میں انگریزوں نے سکھوں کو شکست دی۔ لارڈ ڈلہوزی نے جو کہ اس وقت برطانوی گورنر جنرل تھا 30 مارچ 1849ء کو پنجاب کے الحاق کا اعلان کر دیا۔ پنجاب میں انگریزوں کی حکومت نسبتاً پسند کی گئی اس کی وجہ یہ تھی کہ سکھوں کی حکومت نے مسلمانوں پر بہت ظلم و ستم ڈھائے تھے اور انہوں نے انگریزوں کی حکومت کو سکھوں کی حکومت پر ترجیح دی۔ یوں پنجاب پر قبضہ کر کے انگریز جنوبی ایشیا کے زرخیز ترین صوبے کے مالک بن گئے۔ جس سے ان کے اقتدار کو مالی اور سیاسی استحکام نصیب ہوا۔ الحاقات کا سلسلہ جاری رہا اور اودھ کے الحاق نے جس کی بظاہر نہ کوئی ضرورت تھی اور نہ ہی کوئی وجہ یہاں کے باشندوں کو انگریزوں کے خلاف مشتعل کر دیا۔

(ج) اودھ پر قبضہ

انگریزوں اور اودھ کے حکمرانوں کے درمیان بہت اچھے تعلقات چلے آ رہے تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انگریز مضبوط سے مضبوط تر ہوتے گئے اور اودھ کے حکمران کمزور سے کمزور تر۔ اب انگریزوں نے اودھ کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی یہاں تک کہ ایک حکمران کی وفات کے بعد اپنی مرضی اور پسند کے شہزادے کو برسر اقتدار لاتے تھے اور یہ شہزادہ عموماً سلطنت کے کاروبار اور انتظامی معاملات میں نااہل ہوتا تھا اور انگریز اس صورت حال سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے تھے۔ اودھ کے اقتصادی و معاشی ذرائع اکثر انگریزوں کے رحم و کرم پر ہوتے تھے۔ جو اپنی روایتی لوٹ کھسوٹ سے باز نہیں آتے تھے۔ ان تمام اقدامات کا لازمی نتیجہ تھا کہ اودھ کی حکومت انتظامی اور معاشی معاملات میں نااہل ثابت ہونا شروع ہو گئی۔ انگریز یہی چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے 7 فروری 1856ء کو لکھنؤ کے نواب پر نااہلیت کا الزام لگا کر اودھ پر قبضہ کر لیا۔

(د) متبنیٰ کے قانون کا خاتمہ

انگریز گورنر جنرل ڈلہوزی کے متعلق مشہور تھا کہ ہر علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی نہ کوئی بہانہ ہوتا تھا۔ مسلم ریاستوں کو حاصل کرنے کے بعد اب اس نے ہندو ریاستوں کو قبضہ میں کرنے کا پروگرام بنایا۔ ہندوؤں کے قانون میں اس بات کی اجازت تھی کہ جس ہندو حکمران کے ہاں اولاد نہ ہوتی وہ کسی کو متبنیٰ بنا کر اپنی جگہ حکمران مقرر کر سکتا تھا اور صدیوں سے یہ قانون چلا آ

رہا تھا مگر ڈلہوزی نے اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس قانون کو ختم کرنے کا اعلان کر کے اس نے ستارہ (1848ء) جیت پور اور سنبل پور (1849ء) بگھ (1850ء) اودے پور (1852ء) اور جھانسی (1853ء) ناگپور (1854ء) کی ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔

ان تمام علاقوں پر قبضہ کرنے سے برطانوی حکومت کو اگرچہ مزید تقویت حاصل ہوئی تاہم ان اقدامات نے لوگوں کے ذہنوں میں اور انگریزوں کے بارے میں بے شمار شکوک وشبہات پیدا کر دیئے وہ جان گئے کہ ان کے نزدیک نہ اُن کے مذہب، نہ معیشت، نہ روایات نہ قانون نہ ہی اُن کا تمدن، غرضیکہ کسی بات کی بھی کوئی وقعت نہیں تھی۔ انہیں ہر چیز خطرے میں نظر آئی۔ چنانچہ وہ مفید کام بھی جو برطانوی حکومت نے کسی نہ کسی وجہ سے جنوبی ایشیا میں کئے تھے برے نظر آنے لگے۔ ان تمام واقعات نے اگرچہ جنوبی ایشیا کے تمام باشندوں پر برا اثر ڈالا۔ تاہم مسلمانوں کی حالت سب سے زیادہ دگرگوں تھی۔

2.4- مسلمانوں کی حالت

جیسا کہ ہم آپ کو بتا چکے ہیں انگریزی سلطنت کے قیام نے مسلمانوں کی حکومت کو ختم کر دیا تھا اور مسلمانوں کی روایات اور تاریخ یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ محکوم رہنا پسند نہیں کرتے۔ پھر جب ان سے حکومت ایک عیسائی قوم نے چھینی ہو تو یہ بات اور بھی ناقابل برداشت تھی۔ انگریز مسلمانوں کے ان جذبات سے بخوبی آگاہ تھے چنانچہ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ مسلمان دوبارہ طاقت نہ حاصل کر سکیں اور ان کا اقتدار دوبارہ کسی صورت میں قائم نہ ہونے پائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جہاں ان کے مذہب اور تاریخ کا مذاق اڑایا گیا وہاں ہندوؤں کو ہر شعبہ زندگی میں ترجیح دی گئی۔ فوجی اور سول ملازمتوں میں ہندوؤں کو زیادہ سے زیادہ بھرتی کیا گیا اور مسلمانوں کو صرف معمولی عہدے دیئے گئے۔

مسلمان جن کے پاس نہ سلطنت رہی تھی اور نہ ہی معاشی اور سماجی وقار، آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر (جس کی حکومت اب لال قلعے کی چار دیواری تک محدود تھی) کی ذات میں کسی حد تک نفساتی طور پر پناہ ڈھونڈتے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کا دربار جو کہ کسی صورت میں بھی عظیم مغل حکمرانوں کے دربار کا مقابلہ نہیں کرتا تھا صرف عظمت رفتہ کی یاد دلاتا تھا اور لال قلعے کے اندر جا کر مسلمان شاید حقیقی طور پر ان تمام ناانصافیوں کو بھول جاتے تھے جو چار دیواری کے باہر ان پر روا رکھی جاتی تھی۔ ڈلہوزی کو یہ بات بھی ناگوار گزرتی تھی۔ چنانچہ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ بہادر شاہ ظفر کی موت کے بعد شہنشاہ کا لفظ اس کے جانشین استعمال نہیں کر سکیں گے اور یہ کہ ان کو قلعہ اور محلات بھی خالی کرنا ہوں گے۔ اس فیصلے سے مسلمانوں کے ہاتھ وہ بچا کھچا وقار چھین لیا گیا۔ جس کی اگرچہ حقیقت کچھ بھی نہ تھی مگر پھر بھی کسی حد تک ان کے لیے جذباتی طور پر باعث تسکین تھی۔

2.5- سماجی ناانصافیاں

انگریز نسل پرست تھے۔ ان کے نزدیک ان کی نسل، زبان اور ثقافت ہی مہذب ہونے کی علامت تھی۔ بجائے اس

کے کہ وہ اپنی رعایا کے احساسات کو ہمدردی سے سمجھنے کی کوشش کرتے انہوں نے ان کی زبان' ثقافت اور مذہب سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مشرقی علوم اور زبانوں سے ناواقفیت یا عملاً کنارہ کشی کی وجہ سے انہوں نے جنوبی ایشیا کے سیاسی، سماجی اور معاشی ڈھانچے کو بدلنے کی کوشش کی۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں میکالے کا تجویز کردہ تعلیمی نظائم رائج کر کے وفادار ملازم مہیا کئے گئے۔ انگریزی ادب، زبان، طور طریقے اور طرز زندگی کو مہذب انسانوں کے لیے ضروری سمجھا گیا۔ اپنی تہذیب وثقافت پر اس قسم کا غرور جنوبی ایشیا کے باشندوں کو سخت ناپسند تھا۔ اس سے نفرت کی خلیج اور بھی وسیع ہوتی گئی۔

2.6- اصلاحات رائج کرنے پر غلط فہمیاں

جیسا کہ آپ نے اوپر پڑھا ہے کہ عیسائی مشنریوں کو سرگرمیوں سے یہاں کے باشندوں میں انگریزوں کے متعلق طرح طرح کے شکوک پیدا ہو چکے تھے۔ چنانچہ ان کے چند اچھے کاموں کو بھی نفرت کی نظر سے دیکھا گیا مثلاً ریلوے اور تار وغیرہ کو بھی بعض لوگوں نے اپنے مذہب وسماج پر ایک طرح کا حملہ سمجھا۔ اسی طرح بعض سماجی برائیوں کو ختم کرنے کے لیے انگریزوں نے ستی کی رسم کو ختم کیا۔ ہندو بیواؤں کی دوبارہ شادی کو قانونی طور پر جائز قرار دیا اور بچپن کی شادی کی قبیح رسم کو ختم کر دیا۔ اگرچہ یہ تمام اصلاحات سماجی برائیوں کو دور کرنے کے لیے کی گئی تھیں تاہم ان سے مثبت اثرات مرتب نہ ہوئے۔

2.7- ہندوستانی سپاہیوں کے مسائل

جس طرح جنوبی ایشیا کی آبادی کے مختلف طبقوں سے یہ محسوس کیا کہ انگریز ان کو لوٹنے کے لیے آیا ہے اور وہ انہیں عیسائی بھی بنانا چاہتا ہے۔ اسی طرح انگریزی فوج میں کام کرنے والے مقامی سپاہیوں کو طرح طرح کی شکایات تھیں۔ ان کو بھی سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ انہیں زبردستی اپنے مذہب سے دور کر کے عیسائی بنا دیا جائے گا۔ زیادہ تر سپاہی ہندوؤں کی اعلیٰ طبقوں سے تعلق رکھتے تھے 1856ء میں حکومت نے ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے یہ لازمی قرار دیا گیا کہ جہاں بھی ان سپاہیوں کو مامور کیا جائے گا وہیں پر انہیں خدمات انجام دینا ہوں گی۔ فوج کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مگر ہندو مذہب کی رو سے بعض ہندوؤں کے لیے ہندوستان کی سرحد عبور کرنا جائز نہیں تھا۔ اس طرح سمندری سفر پر جانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ چنانچہ اس قانون کو ہندومت کے خلاف سمجھا گیا۔ اکثر انگریز افسروں اور مقامی سپاہیوں میں تلخ کلامی ہو جاتی تھی جس میں انگریز ہندو مذہب کو برا بھلا اور ہندوؤں کو سخت سست کہتے تھے۔ چونکہ اکثر ملکی سپاہی تعداد میں زیادہ ہوتے تھے اس لیے عموماً اس قسم کے احکامات کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی جاتی اس قسم کے واقعات فوج کی صورتحال کو ایک ایسے مقام پر لے آئے تھے جہاں کسی وقت بھی حالات بگڑ سکتے تھے۔

2.8- خودآزمائی نمبر 1

سوال نمبر 1 1857ء کی جنگ آزادی کی اہم وجوہات ع تحریر کریں؟

سوال نمبر 2 اقتصادی بدحالی سے کیا مراد ہے؟ برصغیر کی معیشت پر اقتصادی بدحالی کیسے اثر انداز ہوئی۔

سوال نمبر 3 نظریہ ''ختم معیاد'' سے کیا مراد ہے؟ برصغیر میں برطانوی اقتدار پھیلانے میں اس نظریہ کو کس طرح بروئے کار لایا گیا؟ اس نظریئے کے ذریعے کتنی ریاستوں پر تسلط قائم کیا گیا؟ بیان کریں۔

سوال نمبر 4 نظریہ ''ختم معیاد'' سے کیا مراد ہے؟ برصغیر میں برطانوی اقتدار پھیلانے میں اس نظریہ کو کس طرح بروئے کار لایا گیا؟ اس نظریے کے ذریعے کتنی ریاستوں پر تسلط قائم کیا گیا؟ بیان کریں۔

3۔ جنگ آزادی کی ابتداء

3.1- مولوی احمد اللہ شاہ

مندرجہ بالا اقدامات نے جنگ آزادی کے لیے حالات سازگار کر دیئے تھے لکھنؤ کے مولوی احمد اللہ شاہ نے چپاتی سکیم تیار کی تھی۔ جب سے انگریزوں نے اودھ پر قبضہ کیا تھا مختلف علاقوں میں چپاتیاں تقسیم ہوتی رہتیں اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں پہنچائی جاتی رہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس طرح چپاتیوں کو گردش میں رکھنے کا کیا مقصد تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لوگ چپاتی (اناج) پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتے تھے کہ انگریزوں کو ملک سے نکال دیا جائے گا۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ چپاتیاں دراصل مجاہدین کے منصوبوں کے متعلق بتاتی تھیں۔ مقصد جو بھی تھا۔ ان کی گردش سے تمام اودھ کو معلوم ہو گیا کہ انگریزوں کے خلاف کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے چپاتیوں کے منصوبے کے علاوہ مولوی احمد اللہ شاہ نے شمال مغربی صوبوں کا دورہ بھی کیا اور وہاں انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کے متعلق تحریری مواد بھی تقسیم کیا۔ مولوی احمد اللہ شاہ کی سرگرمیوں کا انگریزوں کو علم ہو گیا ان کو گرفتار کیا گیا۔ مقدمہ چلایا گیا اور سزائے موت سنائی گئی لیکن قبل اس کے کہ انہیں پھانسی دی جاتی مقامی سپاہیوں نے انگریزوں کے خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔

3.2- کارتوسوں کا واقعہ

جنوبی ایشیا کی سول آبادی نے مقامی سپاہیوں سے مدد مانگی تھی کہ وہ انہیں انگریزوں کے راج سے نجات دلائیں۔ سپاہی ذہنی طور پر تیار تھے اور کسی موقعہ کے منتظر تھے جبکہ کارتوسوں کے واقعہ نے اُن کو بے صبر کر دیا۔ جنوری 1857ء میں انگریزوں نے ایک نئی بندوق رائج کی جس کا نام Enfiled تھا۔ اس میں ایسے کارتوس استعمال ہوتے تھے جن پر چربی قسم کی کوئی چیز ملی ہوتی تھی اور بندوق میں بھرنے سے پہلے ان کارتوسوں کو ایک سرے سے دانت سے کاٹنا پڑتا تھا۔ یہ بات مشہور ہو گئی کہ ان کارتوسوں پر گائے اور سور کی چربی ملی ہوتی ہے اور یہ محض ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے لیے کیا گیا ہے۔ چنانچہ فروری اور مارچ 1857ء میں جنوبی ایشیا کے مختلف شہروں میں اس قسم کے واقعات پیش آئے جس میں سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ اس امر کی وضاحتیں کی گئیں کہ یہ محض افواہ ہے ان کارتوسوں پر ایسی کوئی چیز نہیں ملی گئی جس سے یہاں کے مقامی باشندوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچے لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا اور مقامی سپاہی ان کو استعمال کرنے سے مسلسل انکار کرتے رہے۔ آخر کار انگریزوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان سپاہیوں کو سخت سزا دی جائے جو ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کریں۔

3.3- میرٹھ کا واقعہ

میرٹھ کے مقام پر سپاہیوں کی ایک کمپنی نے یہ کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ برطانوی افسروں نے اس کا سختی سے نوٹس لیا اور ان سپاہیوں پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا کر انہیں جیل میں بند کر دیا گیا۔ اس سے ان کے ساتھی سپاہیوں میں غم و غصے کے جذبات بھڑک اٹھے اور انہوں نے جیل پر حملہ کر کے قیدیوں کو آزاد کرا لیا۔ اس کے بعد ان سپاہیوں نے انگریز افسروں کو قتل کر کے دہلی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد بہادر شاہ ظفر کو 11 مئی 1857ء کو شہنشاہ ہند بنانے کا اعلان کر دیا۔ یہ بات قابل غور ہے کہ بہادر شاہ ظفر پہلے بھی شہنشاہ ہند کہلاتے تھے مگر لوگوں کو معلوم تھا کہ اصل حکومت تو انگریزوں کی ہے اس لیے یہ اعلان مکمل آزادی کا اعلان سمجھا گیا۔

3.4- خود آزمائی نمبر 2

سوال نمبر 7 1857ء کی جنگ آزادی میں ''چپاتی سکیم'' کس طرح کارآمد ثابت ہوئی بحث کریں۔

سوال نمبر 8 میرٹھ میں ہونے والے واقعات کی جنگ آزادی میں کیا اہمیت تھی واضح کریں۔

4۔ جنگ آزادی کے واقعات

4.1- دہلی

آزادی کے اعلان کے بعد بجنور، روہیل کھنڈ اور اودھ کے مسلمان رؤسا اور حکمرانوں نے بہادر شاہ ظفر کو تحائف اور اپنی وفاداری کے پیغامات بھیجنے شروع کر دیئے۔ مقامی سپاہیوں اور سول مجاہدین نے دہلی کا رخ کیا۔ بریلی سے جنرل بخت خان تقریباً 14 ہزار سپاہیوں کو لے کر دہلی پہنچا اور بادشاہ نے فوراً ہی اُسے فوج کا سپریم کمانڈر مقرر کر دیا۔ بخت خان ایک قابل حکمران اور عمدہ جرنیل تھا۔ اس کی دہلی میں آمد سے مجاہدین کو بہت زیادہ تقویت پہنچی لیکن بدقسمتی سے بعض دوست نما دشمنوں نے بہادر شاہ ظفر کے ایک بیٹے مرزا مغل کو جرنیل بخت خاں کے خلاف بھڑکایا اور ان دونوں میں دشمنی پیدا کرانے کی کوشش کی۔ جنرل بخت خاں نے ان باتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بڑی دلیری سے چار ماہ تک انگریزی اور سکھ فوج کے متحدہ حملے سے شہر کی حفاظت کی لیکن کچھ تو اندرونی سازشوں کی وجہ سے اور کچھ مسلمان مجاہدین میں تنظیم اور اسلحہ کی کمی کی وجہ سے انگریزوں نے 20 ستمبر کو توپ خانے کی مدد سے شہر پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ بہادر شاہ ظفر ایک انگریز ایجنٹ کے کہنے پر ہمایوں کے مقبرہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے حالانکہ بخت خاں نے بادشاہ کو مشورہ دیا تھا کہ وہ شہر چھوڑ دیں اور دکن سے یا دوآب سے جنگ کا آغاز کریں۔ بخت خان اپنی اس ناکامی کے بعد اودھ کی طرف چلا گیا۔ میجر ہڈسن کی سرکردگی میں ایک انگریزی دستے نے بادشاہ کی بے حرمتی کی۔ اس کے بیٹوں کو قتل کر دیا اور ان کے سر کاٹ دیئے گئے۔ ایک فوجی عدالت نے بہادر شاہ پر مقدمہ چلایا اور اسے باغی قرار دے کر رنگون میں جلاوطن کر دیا گیا۔ بہادر شاہ ظفر نے رنگون میں ہی 1862ء میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔ یہاں پر اس بات کا تذکرہ کرنا مناسب ہوگا کہ کمپنی کی حکومت کے قانونی ڈھانچے میں مغل بادشاہ نے جنوبی ایشیا کا اصل حکمران تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی محض اس کی ایجنٹ تھی۔ لہٰذا ایک ایجنٹ کو اپنے قانونی حکمران کے خلاف بغاوت کا مقدمہ چلانے کا کوئی حق نہیں تھا۔

4.2- اودھ

اودھ میں مولوی احمد اللہ شاہ کی سرکردگی میں آزادی کی جدوجہد کا آغاز ہوا۔ ہم پہلے بھی ان کا ذکر کر چکے ہیں کہ کس طرح چپاتی سکیم اور تحریری مواد کے ذریعے مولوی صاحب نے ان لوگوں کو انگریزوں کے خلاف آزادی کے لیے تیار کیا تھا پیشتر اس کے کہ ان کو پھانسی دی جاتی فوجیوں نے آزادی کا آغاز کر دیا۔ مولوی احمد اللہ اودھ کی بیگم حضرت محل کے پاس چلے گئے اور دونوں نے مجاہدین کو بہترین سرکردگی مہیا کی۔ جب انگریزوں کو انگلستان سے مزید فوجی امداد ملنا شروع ہوگئی تو انگریزی فوج نے جنرل کیمبل کی سرکردگی میں یکم مارچ 1858ء کو لکھنؤ پر بھی قبضہ کر لیا۔ حضرت محل نیپال کی طرف بھاگ گئیں لیکن مولوی احمد اللہ شاہ نے اپنی

جدوجہد جاری رکھی اور آخر کار شاہ جہاں پور کے گرد ونواح میں ایک علاقے پر قابض ہو کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ عین ممکن تھا کہ اس حکومت سے مجاہدین کو مزید مدد ملتی مگر ایک ہندو رئیس جو کہ انگریزوں سے ملا ہوا تھا نے دھوکہ سے مولوی صاحب کو شہید کر کے اودھ میں آزادی کی اس شمع کو گل کر دیا۔ مولوی احمد اللہ شاہ بہت اچھے منتظم، بہترین سپاہی اور قابل حکمران تھے۔ انگریزوں نے بھی ان کے متعلق بہت اچھے جذبات کا اظہار کیا ہے:

''اگر کوئی محبِّ وطن اپنے ملک کو آزاد کرنے کے لیے منصوبے بناتا ہے اور لڑتا ہے تو یقیناً مولوی صاحب ایک سچے محب وطن تھے۔ انہوں نے قتل و غارت سے اپنی تلوار کو داغدار نہیں بلکہ بہادری، جرأت اور مردانگی سے ان اجنبیوں کے خلاف لڑے جنہوں نے ان کے وطن پر قبضہ کیا تھا۔''

4.3- پنجاب صوبہ سرحد اور سندھ

جب میرٹھ کے واقعات کی خبر لاہور پہنچی تو انگریز افسروں نے فوراً مقامی سپاہیوں سے ہتھیار چھین کر ان کی کڑی نگرانی شروع کر دی لیکن جوں جوں مزید اطلاعات پہنچتی رہیں حالات خراب ہوتے گئے۔ پنجاب سندھ اور سرحد کے بڑے بڑے شہروں میں بدامنی کے آثار نمودار ہوئے اور اکثر مقامات پر تو انگریزوں نے محض معمولی شک کی بناء پر سینکڑوں سپاہیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ ان علاقوں کے سکھوں نے اس جنگ میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ہندو بڑی ہوشیاری سے اپنے قیمتی اثاثوں سمیت محفوظ مقامات پر چلے گئے جہاں سے وہ واقعات کے رخ کا اندازہ لگا سکتے تھے اور پھر نتائج کے مطابق لائحہ عمل اختیار کر سکتے تھے چنانچہ ان علاقوں میں بھی مسلمان اس جنگ میں پیش پیش تھے۔ راولپنڈی، جہلم، ملتان، ساہیوال، مردان، پشاور، حیدر آباد اور کراچی میں ہزاروں سول اور فوجی مسلمان بے دردی سے قتل کر دیئے گئے۔ سیالکوٹ میں عوام کے ایک مشتعل گروہ نے جیل پر ہلہ بول کر قیدیوں کو آزاد کرا دیا اور انگریز افسروں کی رہائش گاہوں اور دفتروں کو نذر آتش کر دیا اور یہ خبریں اردگرد کے علاقوں میں پھیل گئیں اور دریائے راوی کے کنارے پر مجاہدین کے گروہ جمع ہونا شروع ہو گئے۔ نکلسن کی فوجوں کے ساتھ ان مجاہدین کا ترےموکوٹ کے مقام پر مقابلہ ہوا جہاں پر انگریزی دستوں نے انہیں شکست دی۔

امرتسر میں بھی مسلمان سپاہیوں نے آزادی کا علم بلند کیا۔ وہاں کے ڈپٹی کمشنر فریڈرک کوپر نے سکھ دستوں کی مدد سے ایسے تمام مسلمان سپاہیوں کو قید کر دیا جن پر آزادی حاصل کرنے کا شک تھا۔ جو ظلم وستم ان نہتے مسلمانوں پر ہوا اس کو خود فریڈرک کوپر بیان کرتا ہے۔

''اسے اتفاق یا خوش قسمتی سمجھئے کہ جب یہ مسلمان قیدی جمع ہو گئے تو یہ معلوم ہوا کہ یکم اگست کو مسلمانوں کا بقرعید کا تہوار ہے۔ میں نے مسلمان گھڑسوار فوجیوں کو امرتسر میں جا کر عید منانے کے لیے کہا اور میں اکیلا

عیسائی اپنے وفادار سکھوں کی مدد سے عید کے دن ایک نئی قربانی کے لیے تیار ہو گیا۔''

کوپر کے بیان کے مطابق ان قیدیوں کی تعداد 500 تھی جنہیں بقرعید کے دن نہایت بے دردی سے ذبح کر دیا گیا۔ اسی طرح کے واقعات کراچی، حیدر آباد، شکار پور اور قلات میں پیش آئے۔ ہندوؤں کی سازشوں کی وجہ سے انگریزوں کو مجاہدین کے منصوبوں کا قبل از وقت علم ہو جاتا تھا۔ چنانچہ فوجیوں سے فوراً ہتھیار چھین کر ان کے اہم لیڈروں کو ختم کر دیا جاتا تھا۔

4.4- روہیل کھنڈ

روہیل کھنڈ کے مسلمان رؤسا نے بھی آزادی کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا حافظ رحمت خان کے پوتے بہادر خان نے روہیل کھنڈ میں انگریزوں کے خلاف آزادی کا علم اٹھایا اس نے نہایت کامیابی سے انگریزوں کو اپنے علاقے سے نکال دیا اور روہیل کھنڈ کے مشہور شہروں مثلاً بدایوں، بریلی اور شاہ جہاں پور پر قبضہ کر لیا مولوی احمد اللہ شاہ کی شہادت کے بعد انگریزوں نے اپنی بھرپور قوت کو استعمال میں لاتے ہوئے جون 1858ء میں روہیل کھنڈ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔

بنگال اور بہار میں بھی حصول آزادی کی اکا دکا کوششیں ہوئیں مگر ان کو انگریزوں نے نہایت سختی سے کچل دیا۔

4.5- کان پور

متبنیٰ کے قانون کو ختم کرتے ہوئے لارڈ ڈلہوزی نے پیشوا باجی راؤ کے متبنیٰ نانا صاحب کو پنشن دینے سے انکار کر دیا یہ واقعہ 1853ء میں پیش آیا۔ جنگ آزادی کے دوران نانا صاحب نے کانپور کے علاقے میں انگریزوں کے خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز کیا وہ شہر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا اور انگریزوں نے بھی وقتی طور پر اس سے صلح کر کے کان پور کے ذریعے الہ آباد تک اپنے فوجی دستے پہنچانے کی اجازت دے دی مگر نانا صاحب کے سپاہیوں نے جنہیں الہ آباد میں انگریزوں کے ظلم وستم کی خبر مل چکی تھی برطانوی سپاہیوں کی کشتیوں پر (جو دریا پار کر رہی تھیں) گولی چلا دی جس سے بہت سے انگریز ہلاک ہو گئے۔ الہ آباد میں متعین انگریزی افسر ہیولاک نے نانا صاحب کی فوجوں پر حملہ کر دیا۔ نانا صاحب نے انتقاماً تمام انگریز قیدیوں کے قتل کا حکم دے دیا۔ اس جدوجہد میں ایک مرہٹہ لیڈر تانیتا ڈوپی نے نانا صاحب کی مدد کی۔ آخر کار انگریزوں نے نانا صاحب کو شکست دی۔ نانا صاحب نیپال کی طرف بھاگ گئے۔ تانیتا ٹوپی نے اپنی جدوجہد جاری رکھی لیکن ہندو سازشیوں کی وجہ سے آخر کار وہ پکڑا گیا۔

4.6- جھانسی

جھانسی کے راجہ کا 1853ء میں انتقال ہو چکا تھا۔ انگریزوں نے اس کی بیوہ لکشمی بائی کو حکمران ماننے سے انکار کر کے ریاست پر قبضہ کر لیا اور رانی کو پنشن دے دی۔ جب جنگ آزادی کی ابتداء ہوئی تو رانی نے خود فوجوں کی کمان سنبھال لی اور بہت

جلد اپنی بہادری اور عقلمندی کا سکہ منوا لیا۔ تانیتا ٹوپی نے بھی رانی کی مدد کی مگر انگریزوں نے دونوں کی مشترکہ فوج کو شکست دی۔ تانیتا ٹوپی کو پکڑ کر پھانسی دے دی گئی مگر رانی تین سو افغانوں کی مدد سے بھاگنے میں کامیاب ہوگئی۔ اس نے مرتے دم تک انگریزوں کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ 1859ء کے آغاز میں انگریزوں نے جھانسی کے پورے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اب انگریز ایک عظیم سلطنت کے حکمران بن گئے اور آزادی کی جنگ ختم ہوگئی۔

4.7- خود آزمائی نمبر 3

سوال نمبر 9 جنگ آزادی میں رونما ہونے والے واقعات کی تفصیل بیان کریں۔

سوال نمبر 10 جنگ آزادی میں کیا خدمات سرانجام دیں، مفصل تحریر کریں۔

الف۔ بخت خان ب۔ مولوی احمد اللہ شاہ

ج۔ خان بہادر خان د۔ حضرت محل

ر۔ لکشمی بائی س۔ تانیتا ٹوپی

ص۔ نانا صاحب

5۔ جنگ آزادی کیوں ناکام ہوئی؟

حصولِ آزادی کی یہ کوشش ناکام ہوئی۔ مسلمان اپنا کھویا ہوا اقتدار واپس لینے میں ناکام ہوئے۔ اُس جدوجہد کی ناکامی نے جہاں مسلمانوں کی قومی کمزوریوں کو بے نقاب کیا وہاں غیر مسلم آبادی کے رویئے کو بھی ظاہر کیا تھا۔ ناکامی کی چند اہم وجوہات درج ذیل ہیں۔

5.1- تنظیم کا فقدان

جنگ آزادی کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب مسلمان مجاہدین اور دیگر لڑنے والے گروہوں میں تنظیم کا فقدان تھا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ جدوجہد فوری حالات کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ مسلمان علماء اور رؤساء نے اپنا کھویا ہوا اقتدار واپس لینے کے لیے شروع کی تھی۔ مگر لیڈروں اور عوام کے درمیان کسی قسم کا مستقل رابطہ پیدا نہیں ہو سکا۔ نہ تو جنگی حکمت عملی وضع کی گئی اور نہ ہی مجاہدین کی تنخواہوں اور خوراک و رہائش کے بارے میں وسائل فراہم کئے گئے۔ لوگ مذہب اور اپنی گزشتہ عظمتوں کے نام پر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مگر ان کے جذبات کو صحیح سمت میں موڑنے کے لیے جس اہلیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہمیں شاہی خاندان کے کسی فرد میں بھی نظر نہیں آتی۔ شاہی خاندان کے اخلاقی اقدار اس قدر گر چکے تھے کہ اس موقعہ پر بھی محلاتی سازشوں کو ختم کرنے کی کوشش نہ کی گئی بلکہ ان کو اور تیز کیا گیا جس کی وجہ سے بعض نہایت وفادار اور بہادر جرنیلوں اور شاہی خاندان کے افراد کے درمیان شکوک وشبہات پیدا ہوئے۔

علاوہ ازیں مؤثر جنگی حکمت عملی کے فقدان کی وجہ سے لڑائی مختلف مقامات پر الگ الگ موقعوں پر شروع کی گئی جس کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک لڑائی کے مثبت اثرات کا دوسری لڑائی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اگر یہ جدوجہد ایک ہی وقت میں تمام علاقوں میں شروع کی جاتی تو شاید اس سے بہتر نتائج برآمد ہوتے۔

5.2- غیر مسلم آبادی کا رویہ

اس جنگ میں ناکامی کی ایک اور وجہ ہمیں جنوبی ایشیا کی غیر مسلم آبادی کے رویے میں نظر آتی ہے۔ ہندوؤں کے نزدیک سب سے اہم اپنے معاشی اثاثوں کا تحفظ تھا۔ وہ مال و دولت سے بھرے ہوئے تھیلے لئے صرف حالات کا جائزہ لیتے رہے اور جب کبھی انگریزوں نے ان کو مزید چند سکے عنایت کئے انہوں نے فوراً ان کو مطلوبہ معلومات فراہم کیں اس طرح انگریزوں کو مجاہدین کے تمام منصوبوں کا قبل از وقت پتہ چل جاتا تھا۔ چنانچہ بہت سے مجاہدین ہندوؤں کی دھوکا دہی، لالچ اور دولت پرستی کی وجہ سے انگریزوں کے ہاتھ آئے۔

اسی طرح سکھوں نے اس جدوجہد کو ناکامی سے ہمکنار کرنے میں کافی حصہ لیا۔ بظاہر اس بات کی کوئی معلوم نہیں ہوتی کہ سکھ جن کی حکومت کو برطانیہ نے 1849ء میں ختم کیا تھا وہ اس قدر زور شور سے انگریزوں کی حکومت کو برقرار رکھنے میں کیوں پیش پیش رہے؟ مگر غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ سکھوں نے اپنی عملداری میں پنجاب کے مسلمانوں پر اس قدر ظلم وستم کئے تھے کہ ان کو معلوم تھا اگر جنگ آزادی کامیاب ہوئی تو مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگی اور مسلمان حکومت کے قیام کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان سکھوں سے انتقام لیں گے۔ پس وہ نفرت اور تعصب جو جنوبی ایشیا کی مختلف قوموں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف تھا وہی 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب بنا۔

5.3- بعض مسلمان رؤسا کی غداری

جہاں پر ہندوؤں اور سکھوں نے جنگ آزادی میں انگریزوں کی مدد کی وہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بعض مسلمان حکمران اور رؤسا نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا۔ حیدرآباد دکن کے نظام نے مغل بادشاہ کی کوئی مدد نہیں کی اسی طرح پنجاب کے بعض رؤساء نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ دراصل سکھوں کے دور حکومت میں پنجاب کے مسلمانوں پر اس قدر ظلم وستم ہوا تھا کہ انگریزی حکومت کے قیام نے انہیں بہتر مواقع فراہم کئے تھے۔ پھر صدیوں کے ظلم وستم کی وجہ سے ان میں نہ تو وہ لیڈرشپ رہی اور نہ ہی جوش وخروش۔ وہ اپنا بچا کھچا اثاثہ بچانے کی فکر میں تھے۔ اس لیے یا تو انہوں نے خاموشی اختیار کی اور یا مجبوراً انگریزوں کا ساتھ دیا۔ مزید برآں بے شمار رؤسا کو انگریزوں نے پہلے سے غیر مؤثر بنا دیا تھا ان سے ہتھیار چھین لئے گئے تھے اور انہیں کڑی نگرانی میں رکھا جاتا تھا۔

5.4- روپے کی قلت

مجاہدین نے اتنے بڑے پیمانے پر جنگ تو شروع کر دی تھی مگر ان کے پاس لڑائی کے اخراجات اور سپاہیوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے روپیہ نہ تھا۔ اول تو مسلمان رؤسا سے دولت چھن چکی تھی جن کے پاس تھی بھی انہیں یقین تھا کہ لڑائی کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا چنانچہ وہ اس دولت سے ہاتھ دھونے کو تیار نہیں تھے۔ اگرچہ بعض مقامات پر مجاہدین نے انگریزی خزانوں کو لوٹا تھا لیکن مرکزی خزانہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ دولت ایک جگہ اکٹھی نہ ہوسکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس کو دولت مل گئی اس کے سپاہی خوش ہو گئے جہاں دولت نہ ملی وہاں مجاہدین کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہ آئی۔

5.5- مجاہدین آزادی کی صفوں میں انتشار

جنگ آزادی کی ناکامی کا اہم ترین سبب برطانوی فوجوں کی بہتر تنظیم تھی۔ مجاہدین میں مقامی سپاہی تھے۔ جو شیلے

نوجوان تھے اور والنٹیئر تھے جو کسی ایک تنظیم یا تربیتی نظام سے نہیں گزرے تھے۔ جس سے یہ خرابی پیدا ہوئی کہ ان کی سرگرمیوں میں وہ یکجہتی اور اثر پیدا نہ ہو سکا جو ایک منظم اور تربیت کے لحاظ سے بدرجہا بہتر تھی۔ علاوہ ازیں ان کے پاس اسلحہ تھا روپیہ تھا اور وہ تمام وسائل تھے جن سے ان کی فوج فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ پھر اُن کی پشت پر انگلستان جیسا مضبوط اور امیر ملک تھا۔ برطانیہ کی تمام دولت جو جنوبی ایشیا سے لوٹی گئی تھی ان کے لیے وقف تھی اور بہترین فوجی قیادت ان کو میسر تھی جبکہ ان کے برعکس مسلمان فوجیوں کے پاس اس قسم کی کوئی سہولت موجود نہ تھی بلکہ بے شمار منفی عوامل موجود تھے۔ ایک منتشر قوم، کمزور قیادت اور غیر یقینی ذرائع آمدنی۔

5.6- دیگر عوامل

دیگر عوامل جنہوں نے انگریزوں کی مدد کی وہ سائنس کی جدید ایجادات تھیں۔ ڈاک اور تار کے جدید نظام کی مدد سے ان کو بروقت لڑائی کے واقعات کی اطلاع ملتی رہتی تھی اور وہ آسانی سے حالات پر قابو پا لیتے تھے۔ علاوہ ازیں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، نہ صرف افراد نے بلکہ کئی ریاستوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا مثلاً حیدر آباد، گوالیار، نیپال اور پٹیالہ۔ مجاہدین کی امداد کسی غیر ملکی طاقت نے بھی نہ کی۔ گورنر جنرل لارڈ کیننگ نے 1856ء میں امیر کابل دوست محمد سے معاہدہ کر کے اسے غیر جانبدار بنا دیا تھا۔ نہ روس اور نہ ہی ایران اس حالت میں تھے کہ وہ ان مجاہدین کی مدد کر سکتے۔ اگرچہ اس قسم کی افواہیں عام تھیں کہ ایران اور روس سے مدد آ رہی ہے۔ مگر یہ بات صرف افواہوں تک محدود رہی حقیقت میں کوئی ایسی امداد نہیں ملی۔

5.7- خود آزمائی نمبر 4

سوال نمبر 11 1857ء کی جنگ آزادی کی اہم وجوہات بیان کیجئے۔

سوال نمبر 12 انگریزوں کو اس جنگ میں کیوں کامیابی حاصل ہوئی؟ جوابات لکھتے ہوئے خاص طور پر مندرجہ ذیل سوالوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جنگ آزادی میں انگریزوں کی کامیابی پر مفصل بحث کریں۔

☆ ان کو کس قسم کی برتری حاصل تھی؟ اس کا انہوں نے کیسے استعمال کیا؟

☆ انگریزوں کی مدد کس نے کی؟ اور کیوں کی؟

(جوابات لکھتے وقت 5.1 سے 5.6 تک ملاحظہ کیجئے۔)

6۔ جنگ آزادی کی ناکامی کے نتائج

6.1- برطانیہ کا انتقام

جنگ آزادی کی ناکامی نے مسلمانوں کی حکومت کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے بھیانک انتقام لیا۔ مسلمانوں کو جنگ کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ دہلی اور لکھنؤ کی مسلمان آبادیوں کو نہایت بے رحمی سے تہ تیغ کیا گیا۔ مسلمان علماء، مشائخ اور رؤساء کو سرعام پھانسیاں دی گئیں۔ مسلمانوں کے مقبروں، مسجدوں، مدرسوں اور لائبریریوں کو جلا یا گیا اور ان کی بے حرمتی کی گئی۔ ہزاروں گھروں کو لوٹ لیا اور بے شمار عورتیں اور بچے لاپتہ ہو گئے۔ مسلمان پہلے ہی تباہ و برباد تھے مگر اس جنگ نے ان کے وقار کو ریزہ ریزہ کر کے تاریکی کے گڑھوں میں دھکیل دیا۔

6.2- ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ

1857ء کی جنگ آزادی نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو ختم کر دیا۔ اب جنوبی ایشیا برطانوی سلطنت کا حصہ بن گیا اور حکومت ہند برطانوی پارلیمینٹ کے سامنے جواب دہ قرار پائی۔ پارلیمینٹ اور حکومت ہند کے درمیان رابطے کے لیے سیکرٹری آف سٹیٹ کا عہدہ قائم کیا گیا۔ ملکہ وکٹوریہ نے ان تمام فیصلوں کا اعلان حکومت ہند ایکٹ 1858ء کے ذریعے کیا۔

6.3- آزادی کے لیے جدوجہد

انگریز افسروں اور مصنفین نے اس واقعے کو بغاوت کا نام دیا کیونکہ وہ اپنے آپ کو جنوبی ایشیا کے جائز حکمران تصور کرتے تھے لیکن کسی بھی معیار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ آزادی کی جنگ تھی انگریز غیر ملکی تھی اور اس وقت مغل بادشاہ کے ایجنٹ کی حیثیت سے حکومت کر رہے تھے۔ وہ نہ صرف لٹیرے اور ناجائز حکمران تھے بلکہ انہیں کوئی حق نہیں تھا کہ وہ دھوکہ دہی اور فریب سے جنوبی ایشیا کے باشندوں کے مذہب، تہذیب اور زبان پر حملے کرتے۔ ایسی قوم کے خلاف کوئی بھی جدوجہد شروع کی جاتی اور خواہ کسی رنگ میں کی جاتی، خواہ وہ کامیاب ہوتی یا ناکام، اجتماعی ہوتی یا انفرادی، منظم ہوتی یا منتشر، وہ آزادی کی جدوجہد کہلانے کی مستحق ہے۔ مجاہدین آزادی نے اپنے ہم وطنوں کو انگریزی حکومت کے ظلم وستم سے نجات دلانے کی کوشش کی اور اپنی بساط کے مطابق جنگ کی۔ مگر ناکام ہوئے۔ جنگ ختم ہوگئی مگر جدوجہد جاری رہی۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے اب لوگوں نے

نئے طریقوں پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا مگر منزل وہی تھی۔ آزادی۔

6.4- خود آزمائی نمبر 5

سوال نمبر 13 جنگ آزادی کی وجوہات، واقعات اور نتائج بیان کریں۔

7۔ تشریحات

-1	امرتسر، کانپور، دہلی، گوالیار، جھانسی، لکھنؤ، میرٹھ، پٹیالہ	بھارت کے شہر۔ جنگ آزادی کے دوران جن کی اہمیت تھی۔
-2	اودھ، روہیل، کھنڈ	بھارت کے علاقے، جنگ پزادی کے دوران جن کی اہمیت تھی۔
-3	ایسٹ انڈیا کمپنی	ایک برطانوی تجارتی کمپنی جس نے اٹھارویں صدی میں برصغیر کے علاقے بنگال پر سیاسی تسلط قائم کیا۔
-4	بہار۔ بنگال	بھارت کے صوبے/ ریاستیں جنگ آزادی کے دوران جن کی اہمیت تھی۔
-5	چپاتی تحریک	برطانیہ کے خلاف صف آرائی کے لیے 1857ء میں شروع کی گئی تحریک۔ چپاتیاں خفیہ طور پر تقسیم کی جاتی تھیں جو جنگ آزادی کی علامت بن گئیں۔
-6	روس	پاکستان کے شمال میں ہمسایہ ملک۔
-7	سراج الدولہ	بنگال کا حکمران جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1757ء میں شکست دی۔
-8	عرب	جنوب مغربی ایشیا میں ایک اسلامی ملک۔
-9	عربی	عرب میں بولی جانے والی زبان
-10	عیسائیت	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مذہب
-11	کابل	پاکستان کے شمال میں ہمسایہ ملک افغانستان کا دارالحکومت
-12	مغل سلطنت	مغل وسط ایشیا کے تاتاری سردار امیر تیمور کی اولاد تھے۔ برصغیر میں ان کی سلطنت 1525ء سے 1857ء تک رہی۔
-13	میر جعفر	بنگال کے حکمران نواب سراج الدولہ کی حکومت میں ایک امیر جس نے برطانیہ سے ساز باز کر کے نواب کو شکست دلائی۔
-14	میکالے	تھامس بینگٹن میکالے برطانوی مؤرخ تھا جس نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت اختیار کی اور برطانیہ میں تعلیمی پالیسی کے لیے مشورے دیئے۔
-15	نیپال	بھارت کے شمال میں ایک ریاست

8۔ کتابیات

1- سید معین الحق۔ 1857ء کا عظیم انقلاب (انگریزی)۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، 1968ء

2- اشتیاق حسین قریشی۔ برصغیر پاک و ہند میں مسلمان قوم (انگریزی) باب گیارہ' کراچی، 1977ء

3- سید احمد خان۔ رسالہ اسباب بغاوت ہند، محمد حسین، کراچی، 1955ء

4- تحریک آزادی کی تاریخ۔ حصہ اول، حصہ دوم باب دس تا بارہ (انگریزی)، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، 1960ء

یونٹ.....3

دوقومی نظریہ اور تحریک پاکستان-I
(1868ء تا 1930ء)

تحریر:
ڈاکٹر عبدالحمید

فہرست مضامین

یونٹ کا تعارف 82

یونٹ کے مقاصد 82

1- دوقومی نظریہ 83

1.1- ابتداء 83

1.2- مغربی تعلیم اور تصورات 83

1.3- ایک قوم یا دوقومیں؟ نظریہ یا حقیقت 84

1.4- خود آزمائی نمبر 1 84

2- سرسید احمد خان اور علی گڑھ تحریک 85

2.1- سرسید احمد خان کی شخصیت 85

2.2- مسلمان اور حکمران قوم 86

2.3- مسلمان اور مغربی تعلیم 86

2.4- کالج کا قیام 87

2.5- علی گڑھ کالج کا کردار 87

2.6- کالج کی بعض مشکلات 88

2.7- آل انڈیا محمڈن ایجوکیشن کانفرنس 89

2.8- مغربی تعلیم اور کانگریس کا قیام 90

2.9- کانگریس کے مطالبات 91

2.10- اردو زبان کی تاریخی حیثیت 92

2.11- حکومت کا فیصلہ 93

2.12- اردو اور سیاست 93

2.13- خلاصہ 94

2.14-	خودآزمائی نمبر 2	94
3-	تقسیم بنگال	95
3.1-	مشرقی اور مغربی بنگال کے علاقے	95
3.2-	تقسیم بنگال کی تنسیخ	95
4-	شملہ وفد اور جداگانہ انتخابات	97
4.1-	عیسائی پادری اور مسلمان	97
4.2-	ہندو اصلاحی تحریکوں کی مسلم دشمنی	97
4.3-	مغربی تصورات اور ان کے مضمرات	97
4.4-	بلدیاتی انتخابات میں مسلمانوں کی ناکامی	98
4.5-	اکثریت کو مطمئن کرنے کی برطانوی کوشش	99
4.6-	شملہ وفد	100
4.7-	مخالفوں کی کوشش	101
4.8-	جداگانہ انتخاب کی منظوری	101
4.9-	ہندو اور جداگانہ انتخاب	101
4.10-	میثاق لکھنؤ (1916ء)	102
4.11-	1924ء کے بعد جداگانہ انتخاب کی مخالفت	102
4.12-	خودآزمائی نمبر 3	103
5-	مسلم لیگ کی بنیاد اور ابتدائی سیاست	104
5.1-	مسلم لیگ کا تاسیسی اجلاس	104
5.2-	مسلمانوں کے خدشات	104
5.3-	لیگ کا وجود میں آنا	105
5.4-	لیگ کے ابتدائی سال	105
5.5-	1911ء کے بعد لیگ کے رویے میں تبدیلی	106

-5.6	لیگ کے مقاصد میں تبدیلیاں	106
-5.7	لیگ میں جناح کی شمولیت	107
-5.8	خودآزمائی نمبر 4	107
-6	تحریک خلافت	108
-6.1	تحریک خلافت کی بنیادیں	108
-6.2	ترکوں کا جنگ میں شامل ہونا	108
-6.3	برصغیر کے مسلمان اور حکومت	109
-6.4	جنگ کا خاتمہ اور ترکی کی حالت	110
-6.5	لیگ اور کانگریس کی مفاہمت	110
-6.6	حکومت کا رویہ	111
-6.7	رولٹ ایکٹ	111
-6.8	جلیانوالا باغ کا حادثہ	112
-6.9	تحریک خلافت کا آغاز	112
-6.10	عدم تعاون کی تحریک	114
-6.11	چوراچوری کا حادثہ	115
-6.12	تحریک خلافت کے مثبت اور منفی پہلو	116
-6.13	خودآزمائی نمبر 5	116
-7	1920ء سے 1930ء تک	117
-7.1	1919ء کا ایکٹ اور مسلمانوں کے مسائل	117
-7.2	فسادات کا دور	117
-7.3	شدھی اور سنگھٹن	118
-7.4	ہندو مہا سبھا	118
-7.5	کانگریس اور سوراجی دھڑا	119

7.6-	مسلم لیگ کا اجلاس 1924ء	119
7.7-	فسادات کی ذمہ داری	120
7.8-	ہندو مہا سبھا کانگریس اور جداگانہ انتخاب	120
7.9-	تجاویز دہلی	121
7.10-	سائمن کمیشن کا تقرر اور مسلم لیگ میں پھوٹ	121
7.11-	آل پارٹیز کانفرنس اور نہرو رپورٹ	122
7.12-	نہرو رپورٹ اور مسلمان	122
7.13-	کلکتہ کنونشن	123
7.14-	چودہ نکات	124
7.15-	سول نافرمانی	124
7.16-	سائمن رپورٹ اور پہلی گول میز کانفرنس	124
7.17-	دوسری گول میز کانفرنس	125
7.18-	خود آزمائی نمبر 6	126
8-	تشریحات	128

یونٹ کا تعارف

اس یونٹ کا تعلق تحریک پاکستان کے ابتدائی دور سے ہے۔ یہ دور 1868ء سے 1930ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اس میں ایسے واقعات رونما ہوئے اور ایسی سیاسی تبدیلیاں واقع ہوئیں جن کے باعث مسلمانوں کا ملی تشخص ابھرا۔ آپ سرسید احمد خان اور ان کی علی گڑھ تحریک کے بارے میں پڑھیں گے۔ ان حالات کا مطالعہ کریں گے۔ جن میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان گہرے مذہبی اختلافات ظاہر ہوئے۔ اس یونٹ میں مسلم لیگ کے قیام، قائداعظم کی سیاست کے ابتدائی دور، تحریک خلافت اور 1930ء تک اہم سیاسی واقعات کی تفصیل دی ہوئی ہے۔

یونٹ کے مقاصد

یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد طلباء اس قابل ہوسکیں کہ:

1- مسلمانوں اور ہندوؤں میں تہذیبی فرق کی وضاحت کرسکیں۔

2- مسلمانوں پر برطانوی حکومت کا اعتماد بحال کرنے کے سلسلے میں سرسید کی تعلیمی، معاشرتی اصلاحات اور سیاسی رہنمائی کا جائزہ لے سکیں۔

3- مسلمانوں میں ملی شعور پیدا کرنے میں مسلم لیگ کے کردار کی وضاحت کرسکیں۔

4- مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے قائداعظم کی کوششوں کی ناکامی کے اسباب بتا سکیں۔

1- دوقومی نظریہ

1.1- ابتداء

یہ اصطلاح 1940ء میں قرار داد پاکستان کے منظور ہونے کے بعد کثرت سے استعمال ہوتی چلی آئی ہے۔ بار بار دہرانے سے اس کے معنی بہت دھندلے پڑ گئے ہیں۔ معلوم نہیں کہ اس محاورے کو وضع کرنے والے کون تھے یا اس کو رائج کرنے کا سہرا کس کے سر بندھتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ پنڈت جواہر لال نہرو کے زرخیز دماغ کی اختراع ہو یا پنجاب کے کسی ہندو اخبار نویس کی۔ حقیقت کچھ بھی ہو لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ لاہور کا ہندو اخبار ٹریبون، مسلمانوں کے قومی وطن کے مطالبے کی تحقیر کے لیے جا و بے جا ''دوقومی نظریے'' کا سہارا لیا کرتا تھا، یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ 1940ء میں قائداعظم نے اپنے خطبہ صدارت میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ان مٹ اختلافات کا ذکر کیا تھا۔ تفصیلات بیان کر کے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ ''نیشن'' کی کس مروجہ تمدن کو سامنے رکھا جائے تو برصغیر کے مسلمان ہر اعتبار سے ایک نیشن ثابت ہوں گے۔

اس کے برخلاف کانگریس کے لیڈر یہ کہتے کبھی نہ تھکتے تھے کہ برصغیر کی جغرافیائی حدود کے اندر بسنے والے تمام افراد ''انڈین نیشن'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیشن (یعنی قومیت) کے یہ دونوں تصورات ایک دوسرے کی ضد تھے اور ان میں کوئی درمیانی راہ نکالنا مشکل تھا۔

1.2- مغربی تعلیم اور تصورات

حقیقت یہ ہے کہ انگریزی حکومت کے قائم ہونے سے پہلے برصغیر میں ''نیشن اور نیشنلٹی'' جیسی اصطلاحات کا کوئی وجود نہ تھا اس سرزمین میں یہ دونوں تصورات انگریزی تعلیم کے ذریعے حاصل ہوئے۔ کلکتہ، بمبئی اور مدراس کی یونیورسٹیاں 1856ء میں قائم کی گئی تھیں۔ ان میں تعلیم پانے والوں کی غالب اکثریت ہندو معاشرے سے تعلق رکھتی تھی، انہوں نے بنتھم اور مل جیسے برطانوی ریڈیکل مصنفوں کی تحریروں کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ ان کے خیالات سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے انہوں نے یہ دعویٰ کیا کہ ہندوستان کے رہنے والے بھی کسی یورپی ملک کے باشندوں کی طرح ایک قوم (نیشن) ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ مطالبہ کرتے تھے کہ جس طرح یورپ کا ہر نیشن اپنے ملک کے اندر سفید و سیاہ کا مالک ہے، اسی طرح ہندوستان میں حکومت کے تمام اختیارات کلی طور پر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہونے چاہئیں تھے۔ بظاہر یہ منطق بہت دلاویز اور ناقابل شکست تھی۔

''اکثریتی حکومت، کا اصول یورپ کے سیاسی نظریات کی بنیاد ہے۔ اگر برصغیر میں اس اصول کو نافذ کیا

جائے تو لازماً حکومت ہندو اکثریت کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ یہ سبق ہندوؤں نے بہت اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا''۔

وہ بیرونی دنیا کے دانشوروں کے سامنے اپنی دوامی حکومت کا جواز ثابت کرنے کے لیے مغربی تصورات کا بے تکلف استعمال کرتے تھے۔ وہ باہر کے ناواقف اہل علم کو اس امر کا یقین دلاتے تھے کہ ہم ہندوستان میں بالکل اسی قسم کی حکومت چاہتے ہیں جیسی تمہارے ہاں پہلے سے موجود ہے، ایسی باتیں بنا کر ہندو اہل سیاست نے انگلستان کی آبادی کے بعض پڑھے لکھے لوگوں کی توجہ اور ہمدردی حاصل کر لی۔

1.3- ایک قوم یا دو قومیں؟ نظریہ یا حقیقت

ملک سے باہر ہندوستان کی جو یک طرفہ تصویر پیش کی جاتی تھی کہ ہندوستان کی آبادی کے تمام طبقے متحد ہو کر انگریز حکمرانوں کے خلاف آزادی کے لیے جدوجہد کا علم بلند کئے ہوئے ہیں لیکن اصلیت کچھ اور تھی، ہندوستان میں اتحاد ناپید تھا۔ یہاں کی دو بڑی قوموں کے اختلافات بنیادی اور تاریخی تھے۔ نیشن کے لفظ کا اطلاق ہندوستان پر نہیں ہوسکتا تھا لیکن اگر اس لفظ کو استعمال کئے بغیر چارہ نہ ہو تو نیشن (Nation) کا لفظ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے جائز طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ وجہ ظاہر ہے تاریخ کے کسی مرحلے پر بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی ثقافت اور تمدن میں کوئی قدر مشترک نہیں رہی۔

1.4- خود آزمائی نمبر 1

سوال نمبر 1 قومیت کے یورپی نظریئے میں ہندوؤں کیا فائدہ دیکھا؟

2- سرسید احمد خان اور تحریک علی گڑھ

2.1- سرسید احمد خان* کی شخصیت

سرسید احمد خان انیسویں صدی کے نصف آخر کی قد آور شخصیت تھے۔ وہ دہلی کے ایک ممتاز خاندان میں 1817ء میں پیدا ہوئے جو مغلیہ دربار کے ساتھ متعلق تھا۔ 1857ء کے ہنگامے سے 20 سال پہلے وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ اس طرح وہ اس ماضی سے بھی آشنا تھے جو عصر جدید کی جارحانہ قوتوں کے سامنے تحلیل ہو رہا تھا اور اس قوم سے بھی واقف تھے جو جلد ہی یہاں کے سفید و سیاہ کا انتظام سنبھالنے والی تھی۔ خود اعتمادی اور پیش بینی قیادت کی دو بڑی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ سرسید ان دونوں سے بخوبی بہرور تھے۔

> ان کی شخصیت ہمہ گیر تھی۔ وہ زندگی کے مختلف شعبوں کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک فلسفہ تعلیم وضع کیا جو آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ کا کام دیتا ہے وہ بیک وقت اخبار نویس، مورخ اور آثار قدیمہ کے ماہر تھے۔ مذہب اور دینیات پر بھی انہوں نے مستقل تصانیف چھوڑیں۔ اگر ان کے ہم عصر ان کو ماہر تعلیم سمجھتے تھے تو آنے والی نسلوں نے ان کی سیاسی فراست کو تسلیم کیا۔

اصلاح معاشرہ کا موضوع اب بہت پامال ہو چکا ہے اور ہر کوئی اس پر گفتگو کرتا ہے۔ اس مضمون کے خدوخال سرسید نے ہی متعین کئے تھے۔ ان کی بتائی ہوئی باتیں آج بھی اتنی ہی کارآمد ہیں جتنی آج سے ایک سو سال پہلے تھیں۔ انہوں نے اردو زبان میں وسعت پیدا کی اور اسے ہر قسم کے خیالات ادا کرنے کے قابل بنایا۔ وہ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے بائبل کی تفسیر لکھی۔ اگر ان کی معلومات کی وسعت کا اندازہ لگانا ہو تو بین الاکلام کا ضمیمہ دیکھئے جس میں بائبل کے بیسیوں ایڈیشنوں کی تفصیلات درج ہیں۔ وہ شاعر تھے۔ آھی تخلص کرتے تھے ان کا ایک مشہور شعر یوں ہے:

خدا دارم بریان زعشق مصطفی دارم

ندارد ہیچ کافر ساز وسامنے کہ من دارم

انہوں نے ہومیوپیتھی کا مطالعہ بھی کیا اور وہ اس کو ایلوپیتھی کے مقابلے میں زیادہ موثر سمجھتے تھے۔ غرض کہ وسعت فکر و عمل میں ان کی نظیر کے آدمی صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

---

*نوٹ: سرسید احمد خان نسلاً سید تھے۔ ماں باپ نے احمد نام رکھا۔ عمر کا زیادہ حصہ سید احمد خان کہلائے۔ 1888ء میں نائٹ ھڈ ملی، اس سے سرسید احمد خان بنے، لیکن آج تک قوم ان کو سرسید کے لقب سے یاد کرتی ہے۔

سرسید احمد خان 1857ء کے ہنگامے سے گزرے تھے مسلمانوں کی تباہی انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی ان کے دیکھتے ہزاروں کھاتے پیتے مسلمان گھرانے اجڑ گئے۔ مسلمانوں کے دوبارہ ابھرنے کی کوئی سبیل باقی نہ تھی۔ انہوں نے خود کہا کہ اس غم سے میرے سر کے بال سفید ہو گئے اور اس نے ملک کو چھوڑنے کا ارادہ کر لیا۔ آخر کار اس ارادے کو ترک کرنا پڑا اور ہمہ تن اپنے آپ کو حالات کی اصلاح کے لیے وقف کر دیا۔ جو کچھ 1857ء میں مسلمانوں پر بیتی تھی وہ اسے مرتے دم تک نہ بھول سکے۔

2.2- مسلمان اور حکمران قوم

بہت غور وفکر کے بعد انہوں نے یہ محسوس کیا کہ جنگ آزادی نے مسلمانوں کو پیس کر رکھ دیا ہے۔ حکمرانوں کی بے پناہ فوجی طاقت کے سامنے محکوم قومیں بے بس تھیں۔ تحریک جہاد کا انجام بھی ان کے سامنے تھا۔ انگریز سے ٹکر لینا ممکن نہ تھا۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے بہتر ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو بدلے ہوئے حالات کے سانچے میں ڈھالیں۔ اپنے حکمرانوں کے انداز فکر سے واقفیت پیدا کریں۔ انگلستان ان دنوں دنیا کا سب سے مقتدر ملک تھا۔ صنعتی اور اقتصادی طور پر اس کی قوت ناقابل شکست تھی۔ مغربی تعلیم سے نفرت کو چھوڑ دیں۔ خواہ مخواہ حکمرانوں کی بدگمانی کا نشانہ نہ بنیں۔ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر رکھنے میں کوئی تک نہیں۔

''1869ء میں انگلستان گئے تو سرسید کو یہاں کا نظام تعلیم قابل رشک نظر آیا۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ تعلیم صرف کتابوں کو رٹنے کا نام نہیں بلکہ بامقصد زندگی گزارنے کا ایک ذریعہ ہے''۔

وہ کہا کرتے تھے کہ کتابی تعلیم سے تربیت کہیں زیادہ لازمی ہے، مغربی تعلیم نے الحاد کو فروغ دیا تھا۔ اس لیے مغربی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم تریاق کا کام دے گی۔ حکومت وقت عیسائیت کی پیرو تھی۔ وہ اپنی غیر جانب داری کی آڑ میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی حوصلہ شکنی کرتی تھی۔ سرسید اس نتیجے پر پہنچے کہ شکوے شکایتوں کے دفتر کھولنے کی بجائے مسلمان اپنے قوت بازو پر بھروسہ کریں اور اپنی تعلیمی ضروریات خود پوری کریں۔

2.3- مسلمان اور مغربی تعلیم

سرسید کے دورہ انگلستان کا ذکر کیا جا چکا ہے، واپسی کے فوراً بعد انہوں نے ایک ماہنامہ تہذیب الاخلاق جاری کیا اور ساتھ ہی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی قائم کی جو زیادہ تر ان اسباب کو دریافت کرنے کے لیے وجود میں لائی گئی تھی جس سے مسلمان طلباء حکومت کے جاری کئے ہوئے سکولوں اور کالجوں سے گریز کرتے تھے۔ بہت سے سرکردہ مسلمانوں کی آرا حاصل کرنے کے بعد کمیٹی نے یہ نتیجہ نکالا کہ پرانے خیال کے مسلمان انگریزی تعلیم کو قوم کے حق میں مضر جانتے ہیں اس لیے مسلمان طلباء سرکاری درسگاہوں کا رخ نہیں کرتے۔ نیز سرکاری طریقہ تعلیم مسلمانوں کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتا یہاں اخلاقی تعلیم دی جاتی ہے نہ مذہبی تعلیم۔ اگر حکومت مسلمانوں کی خاطر اپنے طریقہ تعلیم میں کچھ تبدیلیاں بھی کر دے تو بھی مسلمانوں

کی تمام ضروریات رفع نہیں ہوسکتیں۔علوم جدیدہ سے فائدہ اٹھانے اور اپنی تمام ضرورتوں کے موافق اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت کرنے کے لیے اس امر کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ مسلمان اپنی تعلیم کا فکر آپ کریں اور اپنے ذرائع سے اپنے مطلب کے سکول اور کالج قائم کریں۔

یہ رپورٹ ایک اہم دستاویز ہے جو 1872ء میں شائع ہوئی تھی۔ ماہرین تعلیم کی رائے میں اس کی اہمیت اب بھی مسلم ہے۔اسی رپورٹ میں مجوزہ مثالی کالج کی سکیم اور طریقہ تعلیم بھی مندرج تھا۔

2.4- کالج کا قیام

اس سلسلے میں سب سے پہلا سوال یہ تھا کہ کالج کو کہاں قائم کیا جائے۔سرسید کے بہت سے دوست دہلی کے حق میں تھے۔لیکن سرسید کے رفقا میں زیادہ تعداد ان کی تھی جو علی گڑھ کو ترجیح دیتے تھے۔سرسید کو دہلی سے والہانہ محبت تھی وہ یہیں پروان چڑھے تھے انہوں نے اس شہر کا کونہ کونہ چھانا اور ناپا تھا اس کے آثار قدیمہ پر ایک مبسوط کتاب آثار الصنادید لکھی تھی،لیکن اس کے باوجود 1857ء کے ہنگامے کے بعد وہ دلی کو ترک کر دینے کا مصمم ادارہ کر چکے تھے۔ جنگ کے بعد یہاں کے مسلمانوں کی درد ناک حالت سرسید سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ دہلی والوں کو ایک اور سزا یہ دی گئی تھی کہ اس شہر کو حکومت پنجاب کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ جہاں کے افسر اپنے آپ کو قانون اور انصاف کے تقاضوں کا پابند نہیں سمجھتے تھے۔

2.5- علی گڑھ کالج کا کردار

کالج ''اپنی مدد آپ کرو'' کی درخشاں مثال تھا۔اطراف و جوانب سے مسلمان طلباء یہاں آ کر داخلہ لینے لگے۔اکٹھے رہنے سے ان میں یگانگت کا جذبہ پیدا ہوتا تھا۔وہ اپنے آپ کو بنگالی اور پنجابی بعد میں مسلمان پہلے سمجھتے تھے۔علی گڑھ میں ایسی فضا پیدا ہوئی جو بہت سی دوسری اسلامی درسگاہوں کے لیے قابل تقلید بنی۔ فاضل اساتذہ کی موجودگی، اقامتی طریقہ تعلیم، مردانہ کھیلوں کا انتظام اور یونین کی سرگرمیاں، علی گڑھ کی بے مثال سوشل لائف کی امتیازی خصوصیتیں تھیں۔ یہاں سے طالب علم نہ صرف کتابی کیڑے بن کر نہیں نکلتے تھے۔ بلکہ سنورے ہوئے اخلاق لے کر زندگی کی دوڑ کے لیے تیار کر کر نکلتے تھے۔اس کالج کی پیروی میں متعدد کالج اور بے شمار مدرسے انگریزی تعلیم کے لیے کھولے گئے۔علی گڑھ کالج میں ہی مسلم قومیت کا شعور پروان چڑھا۔ یہ کہنا تو درست نہ ہوگا کہ اس سے پہلے مسلم قومیت کا تصور موجود نہ تھا۔مسلمان خواہ شمال کے ہوں یا جنوب کے، اپنے آپ کو ایک قوم سمجھتے تھے،لیکن علی گڑھ کی اقامتی زندگی اور لازمی مذہبی تعلیم نے اس جذبے کو ابھارا اور تازہ رکھا، اسے ایک ناقابل تسخیر قوت بنایا۔سرسید نے ایک موقع پر طالب علموں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا، یاد رکھو سب سے سچا کلمہ **لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ** ہے اسی پر یقین کرنے سے قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے

ہو گئے تو کیا پس امید ہے کہ تم ان دونوں کی باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونے ہوئے اور یہی ہماری قوم کی عزت ہوگی۔

علی گڑھ نے تعلیمی لحاظ سے قوم کی جو خدمت کی وہ دو باتوں سے ظاہر ہے۔ اول 1925ء میں کل ہندوستان میں کالج کی تعلیم پانے والے مسلمان نوجوانوں کا 69 فیصد علی گڑھ میں ہی زیر تعلیم تھا۔ دوئم شروع سے لے کر آزادی تک علی گڑھ کے کل طلباء کی تعداد کا ایک تہائی کسی نہ کسی شکل میں یونیورسٹی سے مالی امداد حاصل کرتا تھا اور یہ مدد اس طرح پر دی جاتی تھی کہ حاصل کرنے والے کے علاوہ کسی دوسرے شخص کو مطلق علم نہ ہوتا تھا۔

2.6- کالج کی بعض مشکلات

ابتداء میں طالب علموں کی تعداد مختصر تھی۔ سرسید اور ان کے رفقاء جزئیات پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ کئی سال تک کالج بہت سے ضابطوں کے بغیر ہی چلتا رہا۔ جب حالات بہتر ہوئے اور کالج کی جائیداد میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا گیا تو سرسید کو خیال پیدا ہوا کہ کالج کی انتظامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بہت سے قواعد وضوابط بنائے جائیں اور جن اصولوں پر کالج کی بنیاد رکھی گئی تھی، ان کو قانونی شکل دے دی جائے۔ سرسید کے چند انگریز دوست بھی اس سے متفق تھے۔ اس لیے سرسید نے 1889ء میں ٹرسٹیوں کے تقرر اور دیگر امور کے انصرام کے لیے ایک کور بنایا اور بل کی صورت میں چھپوا کر اس کی کاپیاں تمام ممبروں کے پاس رائے کے لیے بھیجیں۔ مولوی سمیع اللہ خان نے (جو نزدیک دور سے سرسید کے عزیز تھے اور کالج کو بنانے اور چلانے میں ان کے دست راست تھے) بل کی بعض دفعات سے شدید اختلاف کیا۔ متنازع فیہ مسائل میں ایک یہ تھی کہ سرسید کے بیٹے سید محمود کو کالج کا جائنٹ سیکرٹری بنایا جائے اور اپنے نامور باپ کی وفات کے بعد یہی سیکرٹری بن کر کالج کا انتظام سنبھالیں۔ مولوی سمیع اللہ خان کے حامی اس اختلاف میں شریک ہو گئے۔ اس سے کالج کی انتظامیہ دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ فریقین کی باہمی نکتہ چینی جائز حدود سے بڑھ گئی اور ایک اصولی مباحثے نے ذاتی جنگ کی شکل اختیار کر لی۔

اصل معاملہ کیا تھا؟ کالج کے بنیادی مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ حتی الوسع مسلمانوں کو انگریزوں کی بدگمانی سے بچایا جائے اور دونوں کے باہمی تعلقات کو خوشگوار بنایا جائے۔ اس بات کے پیش نظر، شروع سے ہی کالج میں کم از کم چار انگریز پروفیسر ہوتے تھے اور سکول کا ہیڈ ماسٹر بھی انگریز ہوا کرتا تھا۔ سید محمود انگلستان میں تعلیم حاصل کر چکے تھے اور وہاں کے بعض تعلیمی حلقوں میں جاتے تھے۔ انگریز پروفیسروں کا تقرر ان کے مشورے سے ہوتا تھا۔ انہوں نے وقتاً فوقتاً انگلستان سے بہت سے لائق اور ہونہار نوجوانوں کو بلا کر کالج میں رکھا۔ پروفیسر معمولی تنخواہوں پر کام کرتے۔ کالج اور طلبہ کی بہبود کا خیال رکھتے تھے۔ ان میں سے چند اساتذہ نے بعد میں بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ یہ بات بھی درست ہے کہ چند انگریز پروفیسر حرص کے بندے تھے اور صرف اپنے ذاتی مفاد پر نظر رکھتے تھے اور اپنا بہت سا وقت ''چلت پھرت'' میں گزارتے تھے، مولوی سمیع اللہ خان انگریز اساتذہ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے وہ کہا کرتے تھے کہ عیسائی استاد مسلمان طالب علموں کی اخلاقی تربیت کے اہل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے

مولوی سمیع اللہ خان کا وجود بھی انگریز پروفیسروں کی نظر میں کھٹکتا تھا۔ اس بات کی توقع تھی کہ سرسید کی وفات کے بعد کالج کی باگ دوڑ مولوی سمیع اللہ خان کے ہاتھ میں چلی جائے گی اور وہ تو انگریز پروفیسروں کو زچ کریں گے یا ان کو اپنی اپنی ملازمتوں سے برطرف کر دیں گے۔ یہ خیال بھی عام تھا کہ سید محمود کی نامزدگی میں انگریز پروفیسروں کا ہاتھ تھا فی الحقیقت انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر سید محمود کو جانشین مقرر نہ کیا گیا تو ہم کالج سے علیحدگی اختیار کریں گے۔ غالباً مولوی سمیع اللہ خان کی ناراضگی کی بنیاد ہی یہی تھی۔ جھگڑے نے طول پکڑا جب معاملہ فیصلے کے لیے پیش ہوا تو سرسید نے اسے ذاتی وقار کا مسئلہ بنا لیا۔ ٹرسٹیوں کی اکثریت نے بل کے حق میں ووٹ دیا۔ اس پر مولوی سمیع اللہ خان اور ان کی پارٹی نے کالج سے قطع تعلق کر لیا، شروع سے لے کر آخر تک سرسید پر مولوی صاحب اور ان کے حامیوں کا رویہ شاق گزرا۔ وہ سمیع اللہ خان کو اپنا دست و بازو سمجھتے تھے اور عزیز دوست کی طرف سے سرسید کے لیے اس قسم کی مخالفت ناقابل برداشت تھی، اس ''خانہ جنگی'' سے کالج کی ترقی کی رفتار مدہم پڑ گئی۔ طلباء کی تعداد گھٹ گئی اور کئی لوگوں نے مالی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا۔

2.7- آل انڈیا محمڈن ایجوکیشن کانفرنس

علی گڑھ کالج کے بعد جس ادارے نے مسلمانوں کا قومی شعور بیدار کیا وہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشن کانفرنس تھی۔ سرسید کو اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ صرف ایک کالج کروڑوں مسلمانوں کی تعلیم کی کفالت نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ مسلمان جو ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں وہ سب ایک دوسرے کی حالت سے محض بے خبر ہیں اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں کہ مختلف صوبوں کے لوگ ایک جگہ جمع ہوں اور قومی تعلیم اور قومی ترقی کے متعلق آپس میں اپنے اپنے خیالات کا تبادلہ کریں جس سے مسلمانوں میں یگانگت اور قومی ہمدردی پیدا ہو۔ ان باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے 1886ء میں سرسید نے ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ اس کے دو اہم مقاصد یہ تھے کہ مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجے تک پہنچایا جائے تا کہ مشرقی اور دینیات کی تعلیم کو تقویت دی جائے۔ ہر سال کسی مناسب مقام پر کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوتا۔ یہاں مختلف معاملات پر تجویزیں پیش ہوئیں بحث مباحثے کے بعد قراردادیں پاس ہوئیں اور قابل اجرا تجویزوں پر عمل درآمد کرانے کی کوشش کی جاتی۔

دس سال تک کانفرنس کے اجلاس متواتر ہوتے رہے۔ سالانہ کارروائی کتابی صورت میں چھپ کر ممبروں میں تقسیم کر دی جاتی تھی۔ کانفرنس نے بہت سی مفید تجویزوں پر غور کیا اور عمل کے بہت سے راستے دکھائے، لیکن ان سے براہ راست حسب توقع نتائج برآمد نہ ہو سکے۔ سب سے بڑا فائدہ جو کانفرنس کے انعقاد سے ہوتا تھا وہ یہ تھا کہ ہر سال مسلمانوں کی ایک کثیر جماعت دور دراز کا سفر طے کر کے اور اپنا خرچ برداشت کر کے، قومی بھلائی کے اس مجمع میں شریک ہوتی۔ شرکاء ایک دوسرے سے ملتے۔ ایک جگہ رہتے، قومی معاملات پر گفتگو کرتے۔ انجانوں میں تعارف ہوتا۔ دوستوں میں خلوص پیدا ہوتا اور منتشر قوم کے اجزاء میں ربط باہمی پیدا ہوتا۔ کچھ حالات کے تقاضے اور کچھ کانفرنس کی بدولت مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیم کی طرف رغبت پیدا ہوئی۔ یہاں قوم

کے عمائدین نے ایسے معرکتہ الآرا لیکچر دیے جس سے اردو ادب میں معقول اضافہ ہوا۔ کانفرنس نے چند ایسی تاریخی کتابوں کو نصاب سے خارج کرایا جو مسلمانوں کے لیے آزادی کا سبب بنتی تھیں۔ اس کانگریس کے پلیٹ فارم سے ہی سرسید نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ سیاست سے دور رہیں اور کانفرنس کے مطالبات سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔ سرسید کی وفات کے آٹھ سال یعنی 1906ء میں مسلم لیگ کا قیام اسی کانفرنس کے پلیٹ فارم پر عمل میں آیا۔

2.8- مغربی تعلیم اور کانگریس کا قیام

انگریزوں کی حکومت کے باقاعدہ قیام کے بعد ہندوستان میں طرز جادید کی کمزور سیاست کا آغاز ہوا۔ اس سیاست کی بنیاد ان تصورات پر رکھی گئی جو مغربی تعلیم کے ذریعے اور حکمران طبقے کے ساتھ میل جول کی وجہ سے رواج پا گئے تھے۔ 1856ء میں کلکتہ، بمبئی اور مدراس کی یونیورسٹیوں کی بنیاد رکھی گئی۔ پہلے پہل ان میں انگریز اساتذہ کی غالب اکثریت تھی۔ وہ اپنے طالب علموں کو مغربی جمہوریت اور قومیت کے تصورات کا درس دیتے تھے اور ان کو ریڈیکل مضامین کی کتابیں پڑھنے کے لیے دیتے تھے ۔نتیجہ یہ نکلا کہ کئی حالتوں میں ان یونیورسٹیوں سے تعلیم پائے ہوئے نوجوان اپنے خیالات کی جولانی اور جذبات کی تندی میں انگلستان کی یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل طلبا سے کہیں آگے ہوتے تھے۔ اس تعلیم سے فائدہ اٹھانے والے زیادہ تر ہندو تھے۔ 1875ء میں جب یونیورسٹیوں کی کارکردگی کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ مجموعی طور پر چھ سو گریجویٹوں میں صرف 19 مسلمان گریجویٹ تھے۔ مغربی تصورات ہندوؤں میں پہلے ہی تھے اور انہی تصورات کی مقبولیت سے 1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس پیدا ہوئی۔ اس جماعت کے قیام کی وجوہات کی توضیح کا یہ موقع نہیں۔ صرف اسی قدر بتا دینا ضروری ہے کہ اس کا بانی سول سروس کا ایک ریٹائرڈ رکن ہیوم تھا جس نے وائسرائے لارڈ کرزن کے مشورے سے کانگریس کی بنیاد رکھی تھی۔ کانگریس کے سالانہ جلسوں میں برطانیہ کی ملکہ سے والہانہ عقیدت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ بہت سے انگریز بھی اس مجمعے میں شمولیت کرتے تھے۔ انگریزی حکومت کے قیام کے بعد ہندوؤں میں بہت سی سماجی مذہبی اور سیاسی تحریکیں شروع ہوگئیں۔ ان میں بنگال میں برہموسماج پنجاب میں آریہ سماج خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انفرادی سطح پر بمبئی میں بال گنگادھر تلک نے مرہٹوں کے قومی شعور کو (جو اورنگ زیب کے زمانے میں ہی پیدا ہو چکا تھا) مسلمانوں کے خلاف اور بھی بھڑکا کر ان میں لڑنے مارنے کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ آریہ سماج کا بانی سوامی دیانند کہا کرتا تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اس طرح کانگریس جلد ہی ہندوؤں کی قومی تحریکوں کا متحد محاذ بن گئی۔ کہنے کو تو یہ نیشنل کانگریس کہلاتی تھی اور اکا دکا مسلمان بھی اس میں شریک ہوتے تھے۔ لیکن اس کی روح تمام تر ہندوانہ تھی اور یہ شروع ہی سے لے کر آخر تک ہندوؤں کے مفاد کی نگہداشت کرتی تھی۔ ملک کی دو بڑی قوموں کے مفاد سے اس کو کوئی غرض نہ تھی۔ سر سریندر ناتھ بینر جی نے 1907ء کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو کانگریس کے جلسوں میں لانے کے لیے بہت سی کوششیں کی جاتی تھیں۔ ان کو ریل کا کرایہ بھی دیا جاتا تھا اور دوسری آسائشیں مہیا کی جاتیں لیکن یہ تدبیر

کارگر نہ ہوئی کانگریس کو مسلمانوں میں کبھی قابل ذکر مقبولیت حاصل نہیں ہوئی اور 1928ء کے بعد تو یہ خالص ہندووانہ جماعت تھی، لیکن یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔

2.9- کانگریس کے مطالبات

اپنی عمر کے ابتدائی سالوں میں ہی کانگریس نے مطالبات کی ایک طویل فہرست مرتب کر لی تھی، جو سال بہ سال حکومت کے روبرو پیش کئے جاتے تھے۔ان میں دو مطالبات خاص طور پر توجہ کے قابل ہیں۔

☆ اوّل ہندوستان میں برطانیہ کے طرز پر نمائندہ حکومت کی جائے جس میں حکومت کے تمام اختیارات ایک منتخب پارلیمینٹ کو حاصل ہوں۔

☆ دوسرا تمام سرکاری ملازمتوں کو مقابلے کے امتحان کے ذریعے بھرتی کیا جائے۔

دیکھنے میں یہ دونوں مطالبات بظاہر خوشنما اور بے ضرر دکھائی دیتے تھے لیکن ان کی اصلیت کچھ اور ہی تھی، ان مطالبات کو دُھرا دُھرا کر انگریزوں کی ہمدردی حاصل کر لینا آسان تھا۔لیکن ان کی منظوری کی صورت میں مسلمانوں کے مفاد پر کاری ضرب لگتی۔اگر یہاں نمائندہ حکومت قائم ہو جاتی تو ظاہر ہے کہ پارلیمینٹ میں ہندوؤں کو غالب اکثریت حاصل ہوتی اور مسلمان ہمیشہ کے لیے اقلیت میں بدل جاتے اور محروم اقتدار رہتے۔ پبلک پلیٹ فارموں پر کانگریس لیڈر جس قسم کے جذبات کا اظہار کرتے تھے ان سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ سارے ملک میں بلاشرکت غیرے حکومت کے دعوے دار ہیں۔سرکاری عہدوں کو پر کرنے کے لیے مقابلے کے امتحان کا طریقہ رائج ہو جاتا تو ظاہر ہے کہ سارے امتحان حکمرانوں کی زبان میں لئے جاتے اور مروجہ یونیورسٹی ایجوکیشن کے خطوط پر ہوتے۔مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کی وجہ سے سرکاری ملازمتوں میں ان کا حصہ پہلے کی نسبت کہیں گھٹ جاتا۔اس لیے کانگریس کے مطالبات خواہ کتنی ہی دل آویز زبان میں پیش کئے جاتے وہ مسلمانوں کے لیے کسی صورت بھی قابل قبول نہ تھے۔اس نکتے کو پہلے پہل سرسید نے جانچا۔لیکن انہوں نے کانگریس کی مخالفت میں جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ بلکہ مسلمانوں کا موقف 1887ء اور 1888ء میں لکھنؤ اور مراد آباد کے جلسوں میں بیان کیا۔اس سے ہندو بہت برہم ہوئے اور خود کانگریس کے بانی ہیوم نے ناگواری کا اظہار کیا۔نکتہ چین یہ بات بھی لے اڑے کہ کانگریس کی مخالفت سرسید اپنے ارادے سے نہیں کرتے بلکہ ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کے انگریز پرنسپل تھیوڈ بیک کے سکھانے پڑھانے پر کر رہے ہیں۔سرسید نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت میں ایک مضمون لکھا جس میں بتایا کہ:

> ''میں ہندوستان میں نمائندہ حکومت کی موزونیت پر کانگریس سے پہلے غور کر کے اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ جس ملک میں لوگ مذہبی، نسلی اور لسانی طرز پر متحد ہوں وہاں نمائندہ حکومت کامیاب رہے گی اور جہاں ہندوستان کی طرح لوگوں میں ایسا اتحاد نہ پایا جائے وہاں نمائندہ حکومت کا قیام لوگوں کے

اختلافات شدید تر کر دے گا۔''

مسلمانوں نے سرسید کی نصیحت کو پلے باندھا اور کانگریس سے الگ رہے۔ بعض تحریکوں پر سرسید کی منفی سیاست نظر آتی ہے لیکن مشورہ مثبت بنیادوں پر قائم تھا۔ اس کی بنیاد یہ تھی کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان کے مسائل دوسری قوموں کے مسائل سے مختلف ہیں اور وہ کسی دوسری قوم میں جذب ہونے کو تیار نہیں۔ اگر اس مضمون پر سرسید کی تحریروں اور قائداعظم کی تقریروں کا موازنہ کیا جائے تو دونوں میں بہت سے نکتے مشترک نظر آئیں گے۔

2.10- اُردو زبان کی تاریخی اہمیت

1867ء میں شہر بنارس سے اُردو ہندی کا قضیہ اٹھا جس نے سرسید کے خیالات میں انقلاب پیدا کر کے مسلمانوں کی سیاست کا رخ متعین کیا جو کم وبیش 80 سال چلتا رہا۔

اُردو زبان اس سرزمین کی اسلامی حکومت کی یادگاروں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے، یہ زبان کہاں سے شروع ہوئی ان کے متعلق بہت سے نظریات پیش کئے گئے ہیں آج کل یہ دنیا کی مقبول زبانوں میں شامل ہے اس کے بولنے اور سمجھنے والے کم و بیش دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔ 1835ء میں جب سرکاری دفتروں میں فارسی زبان کا سرکاری اور دفتری رواج ختم کر دیا گیا تو شمالی ہند کے بیشتر علاقوں میں اس کی جگہ اُردو کو ملی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد حکومت میں اُردو زبان کی بعض مستند کتابیں شائع ہوئیں۔ 1857ء کے ہنگامے کے بعد اُردو کو جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی اور ہندوستانی کہلاتی تھی ہندوستان کی عام فہم زبان سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ملکہ وکٹوریہ نے یہاں کے باشندوں کی تالیف قلب کے لیے ہندوستانی زبان سیکھنا شروع کی تو ملکہ کے لیے آگرہ سے ایک صاحب منشی عبدالکریم ان کے ٹیوٹر بن کر انگلستان بھیجے گئے۔ وہاں وہ کئی سال رہے اور انہیں شاہی محل میں غیر معمولی اثر ورسوخ حاصل ہوا۔ ملکہ وکٹوریہ اُردو کی معمولی نوشت وخواند کر سکتی تھیں اور ان کے اُردو دستخط عام لوگوں کی نظر سے گزرے ہیں۔ ہندوؤں کو اُردو سے چڑ تھی۔ اس زبان کا وجود ان کو مسلمانوں کے دور حکومت کی یاد دلاتا تھا اور وہ اس کو جڑ سے اکھاڑنے پر تلے ہوئے تھے جیسا کہ ابھی بیان کیا جا چکا ہے۔ اس مہم کی ابتدا بنارس سے ہوئی۔ اُردو کے مقابلے میں ہندی کو کھڑا کیا گیا جو اس وقت اُردو کی نسبت کم ترقی یافتہ تھی۔ جلسے ہوئے، جلوس نکلے، قرار دادیں پاس ہوئیں گورنمنٹ کو بہت سی یادداشتیں پیش کی گئیں۔ سرسید اس وقت اپنی ملازمت کے سلسلے میں بنارس میں متعین تھے وہ اس کارروائی سے بہت پریشان ہوئے وہ اُردو کو مسلمانوں کی قومی زبان خیال کرتے تھے اور اسے مسلمانوں کے ثقافتی ورثے کی ایک قیمتی متاع کہتے تھے۔ انہوں نے اخباری سطح پر ہندی کے حامیوں سے بہت سے مباحثے کئے اور ان کے دلائل کے سکت جواب دیے۔ پہلے 1880ء میں اور پھر 1882ء میں وائسرائے رپن کی حکومت نے ایجوکیشن کمیشن مقرر کئے۔ ہندوؤں نے یہ قضیہ بھی کمیشن کے سامنے پیش کر ڈالا۔ ہندی کے حامی کہتے تھے کہ اُردو کا رسم الخط اجنبی زبان کے رسم الخط کی طرح پیچیدہ ہے اور اس خط میں جعل سازی کی بہت زیادہ

گنجائش ہے۔سرسید نے کمیشن کو باقاعدہ طریقے سے بتادیا کہ یہ مسئلہ دراصل لسانی نہیں سیاسی مسئلہ ہے۔سرسید کا اپنا اخبار علی گڑھ گزٹ اُردو میں چھپتا تھا اور سائنٹفک سوسائٹی کی تصنیفات بھی اسی زبان میں شائع ہوتی تھیں،بعض ہندوؤں نے مطالبہ کیا کہ اردو کی جگہ ہندی زبان استعمال کی جائے۔سرسید اس وقت یعنی 1869ء میں انگلستان میں تھے وہاں سے انہوں نے ایک خط کے دوران یہ لکھا کہ''اگر ہندو اسی طرح اُردو کی مخالفت کرتے رہے تو مجھے ڈر ہے کہ اس سے دونوں قوموں کے درمیان اختلاف بڑھے گا اور ہوسکتا ہے کہ دونوں ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں''۔اس سے چند سال پہلے صوبہ بہار میں اُردو زبان کو عدالتی زبان کے درجے سے محروم کر دیا گیا اور اس سے ہندی کے حامیوں کے حوصلے اور بھی بڑھے۔انہوں نے اس مسئلے کو زندہ رکھا اور حکومت کے کانوں تک متواتر اپنا مطالبہ پہنچاتے رہے۔جب تک سرسید جئے وہ اس جنگ میں ہندی کے حامیوں کے حملوں کا تابڑ توڑ جواب دیتے رہے۔

2.11- حکومت کا فیصلہ

ان کی موت کے تھوڑے عرصہ بعد شمال مغربی صوبہ (جو بعد میں یو پی کہلایا) کے حاکم اعلیٰ نے جس کا نام سر انٹنی میکڈانل تھا اُردو ہندی جھگڑے پر 1900ء میں اپنا فیصلہ صادر کیا جس کی رو سے ہندی زبان کو صوبائی عدالتوں میں پذیرائی ملی اور اُردو کا درجہ پہلے سے کم تر کر دیا۔کہا جاتا ہے کہ اس فیصلے میں بہت حد تک پنڈت مدن موہن مالویہ کا ہاتھ تھا جس نے دو سال کے لیے اپنی وکالت چھوڑ کر ہندی کے حق میں ایک رسالہ لکھ کر میکڈانل صاحب کے سامنے پیش کیا تھا کہا جاتا کہ میکڈانل کا فیصلہ اسی رسالہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا گیا تھا یہ پنڈت وہی ہیں جو 1920ء میں ہندو مہا سبھا اور سنگھٹن کی تحریک کے بانی ہوئے۔حکومت کا اُردو کش فیصلہ مسلمانوں پر بجلی بن کر گرا۔مسلمانوں کے مقتدر طبقوں نے محسن الملک پر زور ڈالا کہ اس معاملے میں مناسب کارروائی کر کے اُردو کی حق رسی کی جائے۔محسن الملک نے لکھنؤ میں ایک جلسے میں ایک پر جوش تقریر کی۔صوبائی گورنر اس پر بہت برہم ہوئے۔انہوں نے مسلمانوں کے عمائد کو بہت سی دھمکیاں دے کر خاموش کرا دیا۔

2.12- اُردو اور سیاست

جب اس محاذ پر شکست کے اسباب پر قوم کے سنجیدہ عناصر نے غور فکر کیا تو اس بات پر اتفاق ہوا کہ مسلمانوں کی آواز حکومت تک پہنچائی جائے۔مسلمانوں کی اپنی الگ سیاسی جماعت ہو۔سیاست سے علیحدگی کا مشورہ سرسید نے دیا تھا اور قوم نے اسے قبول کیا تھا لیکن بدلے ہوئے حالات میں اس فیصلے پر کاربند رہنا خودکشی کے برابر تھا۔تاہم سیاسی جماعت بنانے یا نہ بنانے پر مسلمان رہنماؤں میں اخباری سطح پر ایک طول طویل مباحثہ ہوا اس کے حق میں اور اس کے خلاف دلائل دیئے گئے اور بال آخر 1906ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔اگر ان حالات کا تجزیہ کیا جائے جن حالات میں اس جماعت کی بنیاد رکھی گئی تھی تو معلوم ہوگا کہ:

حکومت نے 1900ء میں اُردو کے خلاف جو فیصلہ دیا تھا وہی مسلم لیگ کی تاسیس کا اولین محرک تھا۔ اس لیے مولوی عبدالحق کا کہنا بالکل بجا ہے کہ پاکستان کی پہلی اینٹ جس نے رکھی وہ اُردو زبان ہی تھی۔

اُردو ہندی کا مباحثہ آزادی تک جاری رہا۔ 1937ء کے بعد گاندھی ہندی زبان کے پرجوش حامی نکلے۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اُردو مسلمان زبان ہے۔ یہ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے چاہے تو مسلمان اس کو رکھیں چاہے اس کو ترک کر دیں۔

2.13- خلاصہ

سرسید بہت متوازن دل و دماغ کے انسان تھے۔ شدید بحرانی دور میں انہوں نے مسلمانوں کی حالت پر گہرا سوچ بچار کیا اور قوم کو ایک نیا فلسفہ زندگی بخشا۔ انہوں نے بتایا کہ ہر قوم کی تقدیر اپنے ہاتھ میں ہوتی ہے۔۔ اگر حالات بدل جائیں تو کیا طرز فکر اور طرز عمل ضروری ہوتا ہے۔

کسی ایک ملک کا طرز حکومت کسی دوسرے ملک پر کامیابی سے نہیں ٹھونسا جا سکتا۔ انہوں نے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف بھرپور توجہ دینے اور سیاست سے دور رہنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔ انہوں نے یہ تعلیم بھی دی کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد مذہب پر استوار ہے۔ اگر مسلمانوں نے مذہب کو چھوڑا تو ان کی وحدت پارہ پارہ ہو جائے گی۔ انہوں نے اُردو نثر کو بہت وسعت دی اور اسے ایک نیا اسلوب بیان عطا کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید کے بہت سے تصورات انقلابی تھے اور انہوں نے مسلمانوں کی آئندہ جدوجہد کا رخ متعین کیا۔

2.14- خود آزمائی نمبر 2

سوال نمبر 2 کیا آپ سرسید کی شخصیت کے پہلوؤں کے بارے میں بتا سکتے ہیں؟

(جواب کا موازنہ 2.1 سے کیجئے)

سوال نمبر 3 سرسید کی ابتدائی کامیابیوں کے بارے میں بتائیے۔ انہوں نے مسلمانوں کی تعلیم کیا کردار ادا کیا؟

(جواب کا موازنہ 2.2 اور 2.5 سے کیجئے۔ اگر آپ پر واضح نہ ہو تو پھر یہ حصے دوبارہ پڑھیے۔)

سوال نمبر 4 علی گڑھ تحریک کے مقاصد کیا تھے؟ اس تحریک کا مسلمانوں کی سماجی اور تمدنی زندگی پر کیا اثر پڑا؟

(جواب کو 2.5 اور 2.6 کی روشنی میں پرکھئے۔)

مشغلہ: سرسید کے اصلاحی اقدامات تاریخی ترتیب سے درج کیجئے۔

3- تقسیم بنگال

3.1- مشرقی اور مغربی بنگال کے علاقے

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد برصغیر کی تاریخ کا اہم ترین واقعہ 1905ء کی تقسیم بنگال ہے۔ اس وقت برصغیر میں سات صوبے تھے اور برصغیر کی تمام آبادی کا ایک تہائی حصہ اس ایک صوبے میں رہتا تھا۔ صوبے کی تقسیم کا مقصد یہ تھا کہ بنگال کی حکومت کے انتظامی بوجھ کو ہلکا کیا جائے۔ تقسیم کی مختلف تجویزیں پچھلے تیس برس سے پیش ہو رہی تھیں لیکن کسی ایک تجویز پر بھی عمل درآمد نہ ہو سکا۔ بالآخر لارڈ کرزن وائسرائے ہند نے 1905ء میں بنگال کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک کا نام مغربی بنگال اور دوسرے کو مشرقی بنگال اور آسام رکھا۔ مشرقی بنگال میں مسلمانوں کو 66 فیصد اکثریت حاصل تھی، اس صوبے کی حدیں کم وبیش وہی تھیں جو بعد میں مشرقی پاکستان کو ملیں۔ یہ علاقہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے حکومت کی توجہ سے محروم تھا۔ سرکاری افسر اس کے دور دراز حصوں میں جانے سے خائف ہوا کرتے تھے۔ انگریزوں کو یہاں کے لوگوں کے طرز زندگی اور اقتصادی حالت سے بہت کم واقفیت تھی۔ جو انگریز افسران اضلاع میں متعین کئے جاتے ان کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوا کرتی تھی کہ جلد سے جلد یہاں سے تبادلہ کروائیں۔ یہ ایک طرح کی سرزمین بے آئین تھی۔ جہاں تعلیم کم، جرائم زیادہ اور ہر طرف زمینداروں کا ظلم انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ ان زمینداروں کا حکومت میں بہت اثر ورسوخ تھا۔ وہ سال کا زیادہ حصہ حکومت کے مرکز یعنی کلکتے میں گزارتے اور اپنی زمینوں کے کاشتکاروں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے داد عیش دیتے تھے۔ ان کی اپنی عدالتیں تھیں جو جرائم کی سزائیں دیتی تھیں۔ ان کے اپنے جیل خانے تھے جہاں ''مجرموں'' کو رکھا جاتا تھا۔ مجرم زیادہ تر وہی مسلمان کاشتکار ہوتے جو اکثر وبیشتر بلاوجہ ہندو زمینداروں کے غیض وغضب کا نشانہ بنتے تھے۔ نیا صوبہ بننے سے ان خرابیوں کا تدارک ہو سکتا تھا اور یہاں کی مسلم اکثریت کی حالت بہتر بنائی جا سکتی تھی۔ لیکن جب اس تقسیم پر عمل درآمد کیا گیا تو ایک غیر متوقع صورت پیدا ہو گئی اور تقسیم کا مقصد پورا نہ ہو سکا۔

3.2- تقسیم بنگال کی تنسیخ

1911ء میں دہلی دربار کے موقع پر تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان شاہ جارج پنجم کی زبان سے کرایا گیا۔ کلکتہ کی بجائے دہلی کو دارالسلطنت بنایا گیا۔ شاید اس سے مسلمانوں کی اشک شوئی مقصود تھی لیکن مسلمانوں کو تقسیم کی تنسیخ کا بہت قلق ہوا۔ انہوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ انگریز حکمران کسی طبقے کے جائز مطالبات پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں۔ البتہ اثر کسی غیر معقول مطالبے کے پیچھے زور وشور کا ایجی ٹیشن ہو تو وہ اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیں گے۔ تقسیم کے خاتمے کے بعد مسلمانوں کی سیاست ایک نئے

دور میں داخل ہوئی۔ قوم نے سرسید کی سیاست سے دور دور رہنے والے مسلک کو ترک کر دیا اور نوجوان طبقہ بے دھڑک سیاست کے میدان میں کود پڑا۔ تقسیم بنگال سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی کشیدہ تعلقات میں کشیدگی اور بھی بڑھی۔ اور ایسی بڑھی کہ دونوں کو تقسیم ملک تک لے گئی۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ 1905ء میں ہندوؤں نے تقسیم بنگال کی پرزور مخالفت کی تھی اور 1947ء میں زور وشور سے حمایت کی تھی۔

4- شملہ وفد اور جداگانہ انتخابات

4.1- عیسائی پادری اور مسلمان

1857ء میں جب مغلوں کی حکومت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی بجھ گیا تو مسلمان ہر طرف سے آلام ومصائب میں گھر گئے، قوم کی تعلیمی پسماندگی اور اقتصادی بدحالی کے کوائف اکثر دھرائے گئے ہیں اور عام طور پر معلوم ہیں۔ اِن حالات میں سے اہم مسئلہ جو عارضی طور پر لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھا وہ مسلمانوں کے قومی تشخص کا مسئلہ تھا۔ جنگ آزادی سے پہلے اس تشخص کو مٹانے کی بھرپور کوششیں شروع ہو چکی تھیں۔ 1837ء میں فارسی زبان اپنی سرکاری اور دفتری حیثیت سے محروم کر دی گئی تھی اور عیسائی پادریوں کی تبلیغی سرگرمیاں زور پکڑنے لگیں۔ وہ مسلمانوں کے مذہب پر طریقہ تعلیم، تاریخ، ثقافت، ادب اور ہر چیز کا کھلم کھلا مذاق اڑاتے تھے۔ پادریوں کو حکومت وقت کی چارحانہ تائید اور حمایت حاصل تھی۔ رہی سہی کسر 1857ء کی جنگ نے پوری کر دی اور حکومت نے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کا تہیہ کر لیا۔

4.2- ہندو اصلاحی تحریکوں کی مسلم دشمنی

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوؤں میں سماجی اصلاحی تحریکیں جاری ہوئیں، ان تمام تحریکوں میں مسلم دشمنی کا عنصر نمایاں تھا۔ آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند کا موقف یہ تھا کہ ''ہندوستان ہندوستانیوں کے لیے ہے''۔

4.3- مغربی تصورات اور ان کے مضمرات

ان سب خطروں کے علاوہ ایک نیا خطرہ جو مسلمانوں کے خلاف ابھر رہا تھا وہ ایک نظریاتی خطرہ تھا، یہ خطرہ ان تصورات سے پیدا ہوا تھا جو مغربی تعلیم کے ذریعے نوجوان نسل کے ذہنوں میں زہر گھول رہا تھا۔ یہ تصورات قومیت اور جمہوریت کے مغربی تصورات تھے۔ انقلاب فرانس کے بعد یہ تصورات یورپ میں مقبول ہوئے اور محکوم ملکوں میں بھی پھلنے پھولنے لگے۔ انہی تصورات نے کانگریس کی تحریک کو جنم دیا۔ اس کے جلسوں اور جلوسوں کی رونق کو بڑھایا۔ کانگریس کی کارروائی تمام تر انگریزی زبان میں ہوتی تھی۔ اس کے ابتدائی دور میں اس کے کرتا دھرتا بال گنگا دھر تلک، سریندر ناتھ بینرجی اور مدن موہن مالویہ جیسے ہندو لیڈر تھے۔ ان لیڈروں نے کچھ اپنی تعلیم اور کچھ اپنی انگریز شناسی کی بدولت مطالبات کی ایک فہرست تیار کر لی جو ہر سال کانگریس کی طرف سے حکومت کو پیش کی جاتی تھی۔ ان تمام مطالبات میں ''نمائندہ حکومت'' کا مطالبہ مرکزی حیثیت رکھتا

تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان میں برطانیہ جیسا طرز حکومت قائم کیا جائے اور حکومت کے تمام اختیارات ایک منتخب پارلیمینٹ کے سپرد کر دیئے جائیں۔ کانگریس کے انتھک مقرر اس بات پر بار بار زور دیتے تھے کہ انگریز جو اپنے ملک میں آزادی کی نعمت سے مالا مال ہیں وہ ہندوستان کے لوگوں کو آزادی کی نعمت سے محروم رکھ رہے ہیں۔ بظاہر اس سیدھی سادی منطق کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس سے بہت سے انگریز بھی متاثر ہوئے۔ ان کے ہاں نمائندہ حکومت کا مطلب یہ تھا کہ حکومت کی باگ ڈور بلا روک ٹوک اکثریت کے ہاتھ میں ہو اور اقلیتی قومیں ہمیشہ کے لیے اکثریت کے رحم و کرم کی محتاج ہو جائیں۔ اس نکتے تک سب سے پہلے سرسید احمد خان نے رسائی حاصل کی۔

تاہم انہوں نے اپنی رائے کا اظہار بہت غور وفکر کے بعد کیا۔ انہوں نے ''نمائندہ حکومت کے مطالبے کی پرزور مخالفت کی اور مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے سے روکا۔ کانگریس کے وجود میں آنے سے پہلے بھی انہوں نے 1883ء میں وائسرائے کی کونسل میں تقریر کرتے ہوئے اس بات کی وضاحت کی تھی کہ مغربی جمہوری ادارے نہ اس ملک کے مزاج کے مطابق ہیں اور نہ ہماری روایات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان سے اکثریت کو تو بلاشبہ فائدہ ہوگا لیکن وہ آبادی کے تمام طبقوں کی جائز خواہشات اور امنگوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ اگر انتخاب کا مغربی طریقہ یہاں رائج کرنا مقصود ہو تو اس میں پسماندہ طبقوں کے لیے موزوں تحفظات کو مدنظر رکھتے ہوئے مناسب تبدیلیاں کی جائیں'' ورنہ یہ طبقے تیزی کے ساتھ پستی کے غار میں گر جائیں گے۔

4.4- بلدیاتی انتخابات میں مسلمانوں کی ناکامی

لارڈ رپن ہندوستان کا ایک نیک نام وائسرائے تھا، وہ لبرل خیالات رکھنا اور مغربی جمہوری اداروں کا دلدادہ تھا۔ اس نے بڑے بڑے شہروں میں میونسپلٹیاں قائم کر کے جمہوری اداروں کی بنیاد رکھی۔ کمیٹیوں کے بہت سے ممبر انتخابات کے ذریعے چنے جانے لگے۔ اس زمانے کے انتخابات آج کل جیسے انتخابات نہ تھے اب تو ہر بالغ شہری کو رائے دہی کا حق حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ان دنوں میں حق صرف ان کو ملتا تھا جو صاحب جائیداد ہوں یا ایک مقررہ حد تک تعلیم یافتہ ہوں۔ مسلمانوں کی تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جن حلقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی وہاں بھی مسلمان رائے دہندے اقلیت میں ہوتے۔ یہ صورت حال اکا دکا حلقوں تک محدود نہ تھی بلکہ کم وبیش ہر جگہ پائی جاتی تھی۔ انتخابات کے نتائج یوں نکلتے کہ مسلمان اپنی اکثریت کے حلقوں میں بھی ناکام رہتے۔ اس طرح مغربی جمہوری اداروں کے قیام سے مسلمانوں کے مفاد کو ایک کاری ضرب لگی اور وہ عملی طور پر حق نمائندگی سے محروم ہو گئے۔ اپنے مضامین میں سید امیر علی نے

سلطنتوں کی اس محرومی کا جائزہ لیا اور سرسید نے اپنی پبلک تقریروں اور مضامین میں آنے والے خطرے کی واضح طور پر نشان دہی کی۔ انہوں نے کہا کہ اگر حالات کا رخ یہی رہا تو مسلمان مکمل طور پر ملک کی حکومت سے بے دخل ہو جائیں گے اور بال آخر ہندو اکثریت کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔ جب 1892ء کے ایک قانون کی رو سے کونسلوں میں توسیع ہوئی اور ان میں منتخب عناصر کے لیے گنجائش نکالی گئی تو یہ خطرہ اور بھی کھل کر سامنے آ گیا۔ انتخابات کا مجوزہ طریقہ مسلمانوں کے قومی تشخص کو ختم کرنے کا سب سے آسان راستہ تھا۔ چوہدری خلیق الزمان نے لکھا ہے کہ 1893ء میں سرسید نے اپنے بیٹے سید محمود کو کہہ کر ایک یادداشت تیار کروائی جس کا منشا یہ تھا کہ الیکشن کے طریقے میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں کہ مسلمانوں کی نمائندگی کا بندوبست ہو سکے۔

4.5- اکثریت کو مطمئن کرنے کی برطانوی کوشش

جب تک سرسید زندہ تھے تو وہ اپنی قوم کے نقطہ نظر کو کامیابی کے ساتھ حکومت تک پہنچاتے رہے۔ ان کے جانشین کو اتنا اثر و رسوخ حاصل نہ تھا۔ کانگریس کے پلیٹ فارم پر تند و تیز تقریریں کرنے والوں سے تو حکومت دبتی تھی، لیکن مسلمانوں کی ضروریات کو نا قابل التفات قرار دیتی تھی اور ان کی ہر بات سنی ان سنی کر دیتی تھی۔ حکومت کی ہندی پروری کی روش اس مسلک کی ایک روشنی مثال تھی۔ بعد کے پے در پے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ ہندو اپنی اکثریت تعلیم، ثروت اور اقتصادی برتری کی بنیاد پر اس ملک پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں اور بدیشی حکومت کے کل پرزے بھی ان پہ مائل بہ کرم ہیں۔ اپنے مستقبل کی تیاریاں کرتے کرتے ''جمہوریت'' اور ''نمائندہ حکومت'' کے تذکرے ہر وقت سرکردہ ہندوؤں کی زبان پر ہوتے تھے۔ مسلمان اس سارے منظر کو بے چینی سے دیکھ رہے تھے اور گومگو کے عالم میں تھے۔ تقسیم بنگال سے پیدا ہونے والی شورش نے ان کو ایک اور جھٹکا دیا پہلے پہل تو حکومت نے ہندوؤں کی ناراضگی کو اتنی اہمیت نہ دی لیکن جب حالات خراب ہوئے تو انگلستان کی لبرل حکومت کے وزیر ہند مارلے نے عافیت اسی میں دیکھی کہ ہندوؤں کے نمائندہ حکومت والے مطالبے کو کسی حد تک تسلیم کر کے ایجی ٹیشن کے زور کو توڑا جائے۔ مارلے نے اپنے اعلان میں بتایا کہ کونسلوں کی رکنیت کو بڑھا دیا جائے اور ان میں نمائندہ عناصر کو جگہ دی جائے گی۔ یہ بھی نظر آتا تھا کہ کونسلوں کے اختیارات کو وسیع کر کے ان کے ارکان کو حکومت کی پالیسیوں پر نکتہ چینی کرنے کا حق بھی دیا جائے گا۔ اس سے اکثریت کا دبدبہ اور بھی بڑھے گا اور اقلیت کی کمزور آواز اور بھی دب جائے گی۔

4.6- شملہ وفد

(الف) ابتدائی مراحل: مارلے کے خیالات سے مسلمان لیڈروں کو بہت پریشانی ہوئی اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ان میں باہمی گفت وشنید ہوئی۔ ابتدا علی گڑھ تحریک کے قائدین کی طرف سے ہوئی۔ انہوں نے دوسرے صوبوں کے سرکردہ مسلمان راہنماؤں کے ساتھ رابطہ قائم کیا اور قرار پایا کہ مسلمانوں کے خدشات سے حکومت کے سربراہ لارڈ منٹو کو آگاہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں محسن الملک نے علی گڑھ کالج کے پرنسپل آرچ بولڈ کو (جو تعطیلات کے دن حکومت کے گرمائی صدر مقام شملہ میں گزار رہا تھا) ایک چٹھی لکھی کہ وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری کرنل ڈنلپ سمتھ کے پاس جا کر دریافت کرے کہ اگر وائسرائے مسلمانوں کی جائز شکایات سننے کے لیے آمادہ ہو تو مسلمانوں کا ایک وفد ملاقات کے لیے ترتیب دیا جائے۔ ڈنلپ سمتھ سے تفصیلات طے کرنے کے بعد آرچ بولڈ نے محسن الملک کو اثبات میں جو خط لکھا اس کا اصل تو موجود نہیں لیکن اس کا اردو ترجمہ سید نفیس احمد بنگلوری کی کتاب ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' میں مل جاتا ہے۔ اس خط میں کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ تحریر کا انداز زمانے کے قاعدے کے مطابق ہے۔ البتہ اس میں ایک دو باتیں ایسی ہیں جن پر الزام تراشیوں کا ایک طومار باندھ دیا گیا ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ آرچ بولڈ نے اس بات کی پیش کش کی کہ وائسرائے کے روبرو پیش کیا جانے والا ایڈریس مجھ سے لکھوایا جائے کیونکہ میں سپاس نامے لکھنے کے فن میں طاق ہوں۔ اس کے علاوہ پرنسپل نے محسن الملک کو یہ سبق پڑھانے کی کوشش بھی کی کہ وفد انتخابی اصول پر زور نہ دے بلکہ یہ مطالبہ کرے کہ بننے والی کونسلوں میں مسلمانوں کی کمی کو حکومت اپنی پسند کے مطابق پورا کرے۔ نکتہ چینیوں کی صوابدید کے مطابق بھی دو باتیں سب سے اہم ہیں۔ ایڈریس کا مسودہ حسین بلگرامی (جن کو عام طور پر عماد الملک کہا جاتا ہے) نے تیار کیا۔ لکھنؤ میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں اس کی منظوری دی گئی۔ کسی مرحلے پر یہ ایڈریس آرچ بولڈ کے ہاتھ یا نظروں سے نہیں گزرا۔ بلکہ ایڈریس میں آرچ بولڈ اس مشورے کو کہ مسلمان الیکشنوں میں واقع ہونے والی کمی کو حکومت کی نامزدگی کے ذریعے پورا کرنے کی درخواست گزاریں، نظر انداز کر دیا تھا۔

(ب) وفد کے مطالبات.....وائسرائے کا جواب: جب ابتدائی مسائل طے ہو گئے تو وفد کے 35 ارکان نے جو مختلف صوبوں سے تعلق رکھتے تھے آغا خان کی سرکردگی میں پہلی اکتوبر 1906ء کو شملہ میں وائسرائے منٹو سے ملاقات کی۔ ایڈریس کسی قدر طویل تھا۔ اس میں اکثر و بیشتر وہی باتیں کہی گئی تھیں جو سرسید کے وقت سے مسلمان حلقوں میں گفتگو کا موضوع بنی ہوئی تھیں یعنی جمہوریت کے مغربی اداروں کو ہندوستان جیسے ملک میں مناسب تبدیلیوں کے بغیر رائج نہیں کیا جا سکتا۔ یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ

قائم ہونے والی کونسلوں کو مؤثر نمائندگی ملے اور مسلمانوں کے نمائندے صرف مسلمان ووٹروں کی رائے سے چنے جائیں۔ وائسرائے نے اس ایڈریس کا حوصلہ افزاء جواب دیا جس سے مسلمان حلقوں میں یہ امید بندھ گئی کہ شاید ان کی بات مان لی گئی ہے لیکن یہ خوش فہمی کسی قدر قبل از وقت تھی۔

4.7- مخالفوں کی کوشش

جب وائسرائے نے حکومت برطانیہ سے اس مطالبے کو قبول کرنے کی سفارش کی تو ایک غیر متوقع صورت حال پیدا ہوگئی۔ برطانوی پارلیمینٹ میں ایک درجن کے قریب حکومتی پارٹی کے ایسے ارکان تھے جو ہندوستان میں ملازمت کر چکے تھے۔ یہاں کے حالات پر اتھارٹی سمجھے جاتے تھے۔ ہندو رہنماؤں کے ساتھ دوستانہ تعلقات رکھتے تھے اور بعض حالتوں میں ان کے تنخواہ دار ایجنٹ بھی تھے۔ ان ممبروں نے پارلیمینٹ کے اندر اور باہر مسلمانوں کے لیے حق جداگانہ انتخاب کی سرتوڑ مخالفت کی اور بار بار اس مسئلے کو چھیڑ کر اپنی حکومت کو پریشان کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ کامیاب ہو جاتے لیکن ہندوستان کے اندر مسلمانوں نے اس رویے کے خلاف پرجوش احتجاج کیا۔

4.8- جداگانہ انتخاب کی منظوری

انگلستان میں سید امیر علی نے اپنی بے نظیر فراست اور اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے مخالفوں کے استدلال کو بے اثر بنایا اور برطانوی حکومت کو وائسرائے کے وعدے کا پاس کرنا پڑا۔ یہ بات یاد رکھنا از حد ضروری ہے کہ

''مسلمانوں نے نہایت استقلال کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اور یہ مہم تین سال کی جدوجہد کے بعد سر کی۔ 1909ء میں جو اصلاحات رائج کی گئیں ان میں جداگانہ انتخاب کا اصول شامل کر لیا گیا۔''

مسلمان اور ہندو ووٹروں کے نام علیحدہ علیحدہ رجسٹروں میں درج کئے گئے اور دونوں قوموں کے علیحدہ علیحدہ انتخابی حلقے بنائے گئے۔ یہ طریقہ انتخاب برطانوی دور حکومت کے آخر تک جاری رہا۔

4.9- ہندو اور جداگانہ انتخاب

جداگانہ انتخاب کا حصول مسلمانوں کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا جو حصول پاکستان کا ذریعہ بنا۔ اگر مخلوط انتخاب کا طریقہ جاری رہتا تو مسلم علیحدہ طور پر اپنے آپ کو منظم نہ کر سکتے اور جلدی یا بدیر اکثریت میں جذب ہو کر اپنا قومی تشخص کھو بیٹھتے۔ اس احساس کے ماتحت کہ جداگانہ طریق انتخاب سے قوم کو سیاسی تنظیم کے بغیر کوئی فائدہ نہ ہوگا، مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔ یہ بھی یاد رہے کہ 1906ء کا مطالبہ اسی بنیاد پر کیا گیا تھا کہ ہندو اور مسلمان دو علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں اور ان کے مفاد بھی بہت حد تک

علیحدہ علیحدہ ہیں۔ جداگانہ انتخاب کے اجرا سے ہندو بہت برہم ہوئے اور ان کے اہم ترین لیڈروں نے یک زبان اس کی مخالفت کی۔ صرف گوکھلے نے اپنی قوم کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر تم اس ملک میں اقلیت ہوتے تو تم بھی اپنی حفاظت کا انتظام اسی طور پر کرتے۔ لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا تھا۔ ہندو لیڈر یہ بات کہتے نہ تھکتے تھے کہ حکومت نے مسلمانوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے ہیں اور جداگانہ انتخاب کے بل پر مسلمانوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو جائے گی۔ یہ سارا شور شرابہ برطانوی حکومت کو دھمکانے کے لیے تھا ورنہ مسلمانوں کو 1909ء کے آئین کے تحت جو نفع پہنچا وہ صرف اتنا تھا کہ سارے ہندوستان کی ساری کونسلوں کی کل 214 نشستوں میں جداگانہ بنیاد پر مسلمانوں کو صرف 16 نشستیں دی گئی تھیں اس کا مطلب یہ نکلا کہ ہندو اس بات کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ کونسلوں کی رکنیت کا نو فیصد حصہ بھی مسلمانوں کو ملے۔

4.10- میثاق لکھنؤ (1916ء)

1911ء میں جب تقسیم بنگال کو منسوخ کیا گیا تو مسلمانوں کا مفاد بری طرح مجروح ہوا۔ حالات تیزی سے تبدیل ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں میں وقتی طور پر دوستانہ فضا پیدا ہوئی۔ میثاق لکھنؤ کی رو سے ہندوؤں نے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا اور ان کی جداگانہ حیثیت کو مان لیا گیا۔ ہندوؤں کا یہ موقف کہ جداگانہ انتخاب سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ قطعی طور پر غلط نکلا۔ جب ہندوؤں نے جداگانہ انتخاب کو مان لیا تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد کی فضا قائم ہوگئی تھی۔ اصل بات تو یہ تھی کہ جداگانہ انتخابات ہندو مسلم اختلافات کا نتیجہ تھے، ان کا سبب نہیں۔ معاہدہ لکھنؤ پر ہندو چند سال تک قائم رہے، یہی وہ سال تھے، جب کانگریس اور لیگ کے سالانہ اجلاس ساتھ ساتھ ایک ہی شہر میں منعقد ہوتے تھے۔

4.11- 1924ء کے بعد جداگانہ انتخاب کی مخالفت

1924ء میں ہندو مہا سبھا نے جداگانہ انتخاب کے خلاف بھرپور پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ 1916ء کے بعد عملی طور پر کانگریس ہندو مہا سبھا کی باندی بن گئی تو یہ بھی جداگانہ انتخاب کے خلاف ہندو مہا سبھا کی نعرے بازی میں شامل ہوگئی۔ جب ہندو جماعتوں نے اس مسئلے پر متحدہ محاذ قائم کر لیا تو مسلمانوں کا رویہ بھی مضبوط ہو گیا اور وہ بھی کسی قیمت پر جداگانہ انتخاب سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھے، واقعات بھی مسلمانوں کے اس رویے کی تصدیق کرتے تھے۔ جہاں جہاں چند مخلوط انتخابی حلقے برقرار رکھے گئے تھے وہاں کسی مسلمان امیدوار کا کامیاب ہونا ناممکن تھا۔ مثال کے طور پر 1916ء میں جب میاں فضل حسین نے پنجاب یونیورسٹی کے مخلوط حلقے سے پنجاب کونسل کا انتخاب لڑنا چاہا تو انہوں نے اپنے تیس قریبی ہندو دوستوں سے رابطہ قائم کیا۔ ان میں سے 27 ہندوؤں نے ان کو کہا کہ واقعی آپ بہت لائق و فائق آدمی ہیں اور ہر طرح سے کونسل کی رکنیت کے اہل ہیں لیکن ہم آپ کو ووٹ نہیں دے سکتے۔ اس حلقے سے ہندوؤں کی اکثریت تھی اور میاں فضل حسین کی کامیابی کی کوئی توقع نہیں

تھی۔ وہ صرف اس لیے منتخب قرار دے دیئے گئے کہ ان کے مدمقابل کی نامزدگی کے کاغذات ٹیکنیکل بنیاد پر نامنظور ہو گئے تھے۔ اسی طرح دہلی شہر کے مخلوط انتخابی حلقے میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ وہاں دسمبر 1926ء کے انتخاب میں مشہور و معروف مسلمان کانگریسی آصف علی مرکزی اسمبلی کی رکنیت کے امیدوار بنے۔ وہ چونکہ کانگریس کے سرکردہ لیڈر تھے اس لیے کانگریس نے ان کے مقابلے پر کوئی امیدوار کھڑا نہ کیا لیکن در پردہ سازش کر کے ایک ہندو مہاسبھائی کو ان کا حریف بنا دیا۔ جب نتیجہ نکلا تو کانگریس اور ہندوؤں کی قوم پرستی کا پول کھل گیا۔ مولانا محمد علی نے قرائن سے اندازہ لگایا کہ کسی ہندو نے بھی آصف علی کے حق میں ووٹ نہیں دیا تھا صرف اس لیے کہ وہ مسلمان تھے۔ اس موقع پر دہلی کے چیف کمشنر نے حکومت کو اپنی رپورٹ میں لکھا کہ اس حلقے سے کبھی کسی مسلمان کا منتخب ہونا غیر یقینی ہے۔

1940ء میں مسلمان جداگانہ انتخاب کے مطالبے سے اس لیے دست بردار ہو گئے تھے کہ اب مسلمانوں کا مقصد برصغیر میں اسلامی سلطنت قائم کرنا تھا۔

4.12- خود آزمائی نمبر 3

سوال نمبر 5 وہ کون سے محرکات تھے جنہوں نے مسلمانوں کو جُداگانہ انتخابات کی طرف گامزن کیا، واضح کریں۔

5- مسلم لیگ کی بنیاد اور ابتدائی سیاست

5.1- مسلم لیگ کا تاسیسی اجلاس

مسلم لیگ کی بنیاد دسمبر 1906ء میں ڈھاکہ میں رکھی گئی۔ اس سال مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسے کا انعقاد اسی شہر میں قرار پایا تھا۔ مندوبین کو پہلے سے اطلاع دی جا چکی تھی کہ کانفرنس کے اختتام پر ایک دن کے لیے سیاسی معاملات پر صلاح مشورہ ہوگا۔ 30 دسمبر کا دن اس مقصد کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ اس دن تمام صوبوں کے سرکردہ اور نمائندہ مسلمانوں کا ایک اجلاس کانفرنس کے پنڈال میں ہوا۔ رسمی کارروائی کے لیے کم وقت رکھا گیا تھا کیونکہ بہت سے ڈیلی گیٹ اسی دن دوپہر کو سپیشل گاڑی کے ذریعے کلکتہ کو واپس جا رہے تھے لیکن ایجوکیشنل کانفرنس کی نشستوں کے دوران ایک سیاسی جماعت کی تشکیل کے موضوع پر مندوبین کے درمیان بات چیت ہوتی رہی تھی۔ مقررہ وقت سے کچھ عرصہ بعد پٹنہ کے مسٹر مظہر الحق نے وقار الملک کا نام صدارت کے لیے تجویز کیا اور ایک مختصر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے نوجوان، سیاست کے میدان میں کودنے کے لیے بے تاب ہیں۔ ان کے گرم خون کی رہنمائی کا فریضہ وقار الملک کا تدبر اور توازن ہی انجام دے سکتا ہے۔

5.2- مسلمانوں کے خدشات

رسمی شکریہ ادا کرنے کے بعد وقار الملک نے حالات حاضرہ پر تبصرہ کیا اور مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق اپنے خدشات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

> ''مسلمانوں کی آبادی ملک کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہے۔ جب برطانوی حکومت یہاں سے رخصت ہوگی تو اقتدار اعلیٰ اس قوم کے ہاتھوں میں چلا جائے گا جو تعداد میں ہم سے چار گنا زیادہ ہے۔ اس وقت صورت حال کیا ہوگی؟ ہماری زندگیاں، ہماری املاک، ہمارا ناموس اور ہمارا مذہب سب خطرے میں پڑ جائیں گے۔ اس وقت جب کہ برطانوی حکومت جیسی قومی حکومت ہمارے درمیان موجود ہے تو ہم اپنے اقتدار کے بھوکے ہمسایوں کے ہاتھ ہر صوبے، ہر ضلعے اور ہر شہر میں پریشان ہیں جب یہ دور ختم ہو جائے گا تو ہم ان لوگوں کے رحم و کرم پر ہوں گے جو مسلمانوں سے اورنگ زیب اور اس سے پہلے کے مسلمان بادشاہوں کے حقیقی یا فرضی مظالم کا انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اسی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں اپنی قوت کو ایک مرکز پر لانا ہوگا۔ ہمی کانگریس سے کوئی عداوت نہیں ہم اپنے ہمسایوں کے ساتھ اخلاق، ہمدردی اور انصاف سے پیش آئیں گے۔ کانگریس نے چند ایسے کام کئے ہیں جن کا فائدہ ہم کو بھی پہنچا ہے۔

اعتدال ہماری طبیعت کا خاصہ ہے اور یہی ہماری جماعت کا امتیازی نشان ہوگا۔''

5.3- لیگ کا وجود میں آنا

حکیم اجمل خان نے قرارداد کی تائید کی۔ دوسری تقریریں ظفر علی خان، صاحبزادہ آفتاب احمد، شیخ عبداللہ اور مسٹر محمد علی کی طرف سے ہوئیں۔ جماعت کا نام مسلم لیگ رکھا گیا۔ اس کی رکنیت چار سو تک محدود کی گئی۔ محسن الملک اور وقار الملک اس کے جوائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے (بعد میں آغا خان اس کے صدر مقرر ہوئے) لیگ کا آئین بنانے کے لیے ایک مختصر سی کمیٹی نامزد کی گئی۔ چوتھی اور آخری قرارداد میں تقسیم بنگال کی حمایت کی گئی اس کو مسلمانوں کے حق میں مفید بتایا گیا اور اسکے خلاف برپا ہونے والی طوفانی شورش کی حوصلہ شکنی کا مطالبہ کیا گیا۔

5.4- لیگ کے ابتدائی سال

پہلے پانچ سالوں میں تو لیگ اپنے بیان کردہ مقاصد کے مطابق اپنے پروگرام پر کاربند رہی لیکن اپنی تمام اعتدال اور رواداری کے باوجود مسلم لیگ کے لیے بنگال کی شورش کے بارے میں منہ بند رکھنا مشکل تھا۔ 1908ء میں امرتسر میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے صدر منتخب سید امیر علی کی غیر حاضری میں سید علی امام نے جو خطبہ صدارت پڑھا اس میں کانگریس کی سیاست اور اس کے عزائم پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ برطانیہ سلطنت کے اندر رہتے ہوئے ہمیں خود اختیاری صرف اسی صورت میں حاصل ہوسکتی ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی بڑی قوموں کے باہمی اختلافات اس حد تک رفع ہو جائیں کہ ان کے دلوں میں متحدہ قومیت کا جذبہ بیدار ہو جائے لیکن موجودہ حالات میں یہ امر محال نظر آتا ہے۔ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ملک کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ صوبے یعنی بنگال کے اندر ایک دلازار اور تعصب سے بھرے ہوئے بندے ماترم کے نعرے کو قومی نعرہ بنایا جاتا ہے اور راکھی بندھن کی فرقہ وارانہ ریت کو قومی رسم کا درجہ دے دیا جاتا ہے تو میرا دل مایوسی کے جذبات سے بھر جاتا ہے اور میرا یہ شبہ کہ خاص ہندووانہ تصورات کو متحدہ ہندوستانی قومیت کے لبادے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یقین میں بدل جاتا ہے..... میں کلکتہ اور پونا میں بسنے والے قوم پرستوں سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ مسلمانوں سے یہ توقع کیوں کر لگائے بیٹھے ہیں کہ ہم آپ کے ساتھ مل کر بندے ماترم کا گیت گائیں یا سیواجی کے اعزاز میں منعقد ہونے والی تقریبوں میں شرکت کریں۔ جس جمہوریت کا راگ الاپا جا رہا ہے وہ مسلمانوں کے لیے صرف آقاؤں کی تبدیلی کا پیغام ہے، سر علی امام نے اس طرف بھی اشارہ کیا کہ مسلمانوں کو تو یہ طعنہ دیا جاتا ہے کہ ہم زندگی کے ہر پہلو میں اپنے اعمال اور افعال کے لیے مذہبی احکام کا جواز تلاش کرتے ہیں لیکن اس بات کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے کہ ہندوؤں کا سارے کا سارا نیشنلزم مذہبی بنیادوں پر استوار کیا گیا ہے۔ اسی جلسے میں ہی ایک طویل تقریر کے دوران محمد علی نے جو ابھی مولانا نہیں کہلاتے تھے، برطانوی حکومت کی ان خفیہ بلکہ سازشی کارروائیوں کو بے نقاب کیا جن سے

وائسرائے منٹو کے وعدے کے باوجود وہ نہایت چابک دستی سے مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کے حل سے محروم کرنا چاہتی تھی۔

5.5- 1911ء کے بعد لیگ کے رویے میں تبدیلی

1911ء کے بعد حالات نے پلٹا کھایا، دسمبر میں تقسیم بنگال منسوخ ہوئی۔ اس کی منسوخی، ایجی ٹیشن اور دہشت زدگی کی فتح تھی۔ ہندوؤں کو برطانوی حکومت کے اس اقدام سے بے پایاں مسرت ہوئی۔ انہوں نے شہروں بلکہ دیہات میں بھی چراغاں کیا۔ کھلے میدانوں میں ہزاروں من ایندھن جلایا اور روشنی کر کے فتح کا جشن منایا۔ مسلمانوں کو بھی اپنی بے حیثیتی کا اندازہ ہو گیا۔ وقار الملک (جو سرسید کے مکتبہ فکر کے اہم رکن تھے) نے لکھا کہ تنسیخ کا اعلان ایک توپ خانے کی مانند تھا جو ہماری زندہ لاشوں کے اوپر سے گزر گیا۔ مولانا محمد علی نے اس اعلان کو حکومت کی بدترین بدعہدی اور غداری سے تعبیر کیا۔ ملک کے مختلف حصوں کے مسلمانوں کا ردعمل اس سے مختلف نہ تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے مسلسل اور واضح احتجاج کے باوجود مچھلی بازار کا کانپور کی مسجد کا ایک حصہ گرائے جانے اور نہتے مسلمان مظاہرین پر فائرنگ ہونے سے مسلمانوں کی طرف انگریز حکام کی فرعونیت عیاں ہوگئی۔ مسلم یونیورسٹی کے مطالبے پر حکومت کے معاندانہ رویے نے قوم کو اور بھی مشتعل کیا۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں اور ان کے بارے میں برطانوی حکومت کے مسلم کش رویے نے جلتی پر تیل چھڑکا۔ ان اقدامات اور واقعات سے قوم کا انداز فکر یکسر بدل گیا۔ اس سے مسلم لیگ کے مسلک میں بھی تبدیلی آئی انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ عارضی طور پر مسلم لیگ کو کانگریس کے قریب لے گیا۔ 1911ء میں لیگ کے صدر نبی اللہ نے اپنی صدارتی تقریر میں ہندوستان کے انگریز حکام پر یہ الزام لگایا کہ وہ دو بڑی بڑی قوموں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکاتے ہیں۔ اس قسم کی گستاخی لیگ کے پلیٹ فارم پر پہلے کبھی نہیں کی گئی تھی۔ 1912ء کے سالانہ اجلاس میں لیگ کے پلیٹ فارم پر ہندو لیڈر بھی موجود تھے۔ ان کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ مسلمانوں میں گورنمنٹ کے خلاف بڑھتی ہوئی بے چینی کے جذبے کو کانگریس کا اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے استعمال کیا جائے۔

5.6- لیگ کے مقاصد میں تبدیلیاں

انہی دنوں مسلم لیگ نے اپنے اغراض و مقاصد میں بعض تبدیلیاں کر دیں۔ پہلی تبدیلی تو یہ تھی کہ آئندہ سے قوم کی وفاداری کا مرکز ی حکومت ہند نہیں بلکہ برطانیہ کے شہنشاہ کی ذات ہوگئی اس سے ''وفاداری'' کی پرانی پالیسی کا خاتمہ ہوا۔ دوسرے لیگ نے بھی کانگریس کی طرف سیلف گورنمنٹ کا مطالبہ کیا لیکن اس سلسلے میں جو محاورہ استعمال کیا گیا وہ سوٹ ایبل سیلف گورنمنٹ تھا اس سے لیگ دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ برق رفتار سیاست کے حامی اپنے آپ کو احرار کہتے اور سوٹ ایبل کے لفظ کا مذاق اڑاتے تھے۔ ان میں شبلی پیش پیش تھے۔ لیکن ''سوٹ ایبل'' کا لفظ بہت سے لیگی رہنماؤں کی نظر میں بہت اہم تھا۔ مولانا محمد علی اس کا یہ مطلب لیتے تھے کہ مسلمانوں کو بھی اس صف گورنمنٹ یعنی حکومت خود اختیاری میں اپنا مناسب حصہ ملے۔

5.7- لیگ میں جناح کی شمولیت

1913ء کے موسم گرما میں مولانا محمد علی اور سید وزیر حسن کانپور کی مسجد اور دوسرے قومی معاملات کے متعلق برطانوی حکومت تک مسلمانوں کے جذبات پہنچانے کے لیے انگلستان گئے۔ محمد علی جناح *بھی کانگریس کے ایک مشن کے سلسلے میں وہیں قیام پذیر تھے۔ محمد علی اور وزیر حسن دونوں جناح کے پاس پہنچے اور انہیں لیگ میں شریک ہونے پر آمادہ کر لیا۔ اس طرح پر مسلمانان ہند کے آئندہ قائداعظم، اس قومی تحریک میں شامل ہو گئے۔ مولانا محمد علی جس مقصد کے لیے انگلستان گئے تھے وہ تو پورا نہ ہوا لیکن ان کے اپنے الفاظ میں (میرے سفر کا ٹھوس نتیجہ) یہ نکلا ہے کہ میں جناح کو لیگ میں لے آیا ہوں۔ اس واقعے کی جولفظی تصویر کشی مسٹر نائیڈو نے کی وہ شاعرانہ مبالغے کی ایک عمدہ مثال ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ وزیر حسن اور محمد علی دونوں کو جناح نے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں لیگ کی رکنیت تو قبول کرتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ اگر کہیں کسی مرحلے پر لیگ اور کانگریس میں تضاد یا تصادم ہوا تو میری وفاداری کا مرکز کانگریس ہوگی لیگ نہیں۔ یہ قصہ ایسی دلآویز عبارت میں بیان کیا گیا کہ پڑھنے والا جھٹ پٹ ایمان لے آتا ہے۔ مسٹر نائیڈو کے الفاظ کو اتنی بار دھرایا گیا ہے کہ بہت سے لوگوں نے اس کو مسلمہ حقیقت کے طور پر قبول کر لیا ہے۔ لیکن جن لوگوں کو قائداعظم کے ارادے کی محکمی اور سیرت کی پختگی کا اندازہ تھا وہ اس روایت کو روایت کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیں گے۔ کانگریس اور لیگ کے درمیان مفاہمت کی جو کوششیں 1912ء میں شروع ہوئی تھیں، ان کا نتیجہ 1916ء میں لکھنؤ پیکٹ کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس معاہدے سے مسلمانوں کو کچھ خسارہ تو ضرور ہوا لیکن اس کا مثبت پہلو یہ تھا کہ کانگریس نے مسلمانوں کی علیحدہ قومی حیثیت اور جداگانہ طریق انتخاب کو قبول کر لیا۔ بدلی ہوئی فضا میں کانگریس اور لیگ کے سالانہ اجلاس 1915ء سے لے کر 1921ء تک ساتھ ساتھ ایک ہی مقام پر ہوتے رہے۔

5.8- خودآزمائی نمبر 4

سوال نمبر 8 مسلم لیگ کے معرض وجود میں آنے کے پیچھے کون سے محرکات کارفرما تھے، بحث کریں۔

سوال نمبر 9 1911ء کے بعد مسلم لیگ کے رویے میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ وجوہات بیان کریں۔

---

* جو ابھی قائداعظم نہیں بنے تھے۔

6- تحریک خلافت

6.1- تحریک خلافت کی بنیادیں

تحریک خلافت، اسلامی ہند کی تاریخ کا ایک طوفانی دور تھا۔ کہنے کو تو یہ تحریک پہلی جنگ عظیم کے بعد شروع ہوئی لیکن اس کی بنیادیں بہت پہلے سے موجود تھیں۔ یہ حالات اور واقعات کے دو دھاروں کے ملنے سے پیدا ہوئی۔

ہندوستان کے مسلمانوں کو دنیائے اسلام سے بے پناہ محبت تھی۔ اسی جذبے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے 1857ء کی جنگ کے دوران برطانوی حکومت نے، سلطان ترکی سے ہندی مسلمانوں کے لیے یہ فتویٰ حاصل کیا تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف جنگ بند کر دیں۔ اگرچہ اس وقت تو یہ فتویٰ موثر ثابت نہ ہوا لیکن اپنا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ترکی اور اس کی حکومت کے ساتھ یہاں کے مسلمانوں کا لگاؤ بڑھتا گیا۔

1895ء میں جب ترکوں نے یونانیوں کو شکست دی تو یہاں سے مبارک باد کے سینکڑوں تار سلطان کی خدمت میں بھیجے گئے اور فتح کی خوشی میں دکن تک دور افتادہ دیہاتوں میں چراغاں کیا گیا۔

1911ء میں طرابلس اور اس کے بعد بلقان کی جنگ میں، ہندوستانی مسلمانوں نے ترکوں کے ساتھ جذبہ اخوت کا بھرپور مظاہر کیا۔ ہر روز ترکوں کی فتح کے لیے مسجدوں میں دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ ترکوں کی امداد کے لیے بہت سا روپیہ اکٹھا کیا گیا۔ ایک طبی مشن ترکی بھیجا گیا۔ چند مسلمان راہنماؤں نے خود استنبول جا کر ترکی کی حکومت کو ہر ممکن امداد کا یقین دلایا۔ سینکڑوں پبلک جلسوں میں ترکی کے دشمنوں کی حوصلہ افزائی کرنے والی برطانوی حکومت کے رویے کی مذمت کی قراردادیں پاس کی جاتی تھیں۔

ان دونوں جنگوں میں شکست کھانے کے بعد ترکی کے اندرونی حالات بہت ابتر ہو چکے تھے۔ 1914ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ برطانیہ اور جرمنی اس جنگ کے دو بڑے فریق تھے۔ یہاں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ بہتر ہوگا کہ ترک اپنے آپ کو کسی نئی ابتلا میں نہ ڈالیں۔ بلکہ جنگ سے دور رہتے ہوئے پچھلے نقصانوں کی تلافی کریں۔ 1878ء سے ترکوں اور جرمنوں کا دوستانہ چلا آ رہا تھا۔ خدشہ تھا کہ ترکی، جرمنی کا ساتھ دیتے ہوئے اس جنگ میں کود پڑے گا۔ چنانچہ مولانا محمد علی نے ترکی کے وزیر اعظم کو ایک طویل تار بھیجا جس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ اپنے ملک کو جنگ میں جھونکنے سے پہلے ایک ہزار مرتبہ اس کے امکانی نتائج کا جائزہ لیں۔ یہ پیغام بے اثر رہا۔

6.2- ترکوں کا جنگ میں شامل ہونا

نومبر کے مہینے میں ترکوں نے برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس اعلان سے پہلے کے مسلمانوں کے لیے ایک

بہت بڑی آزمائش پیدا ہوئی۔ ایک طرف تو وہ برطانوی حکومت کی رعایا تھے اس کے قانون کے پابند، دوسری طرف خلیفتہ المسلمین کی اطاعت بھی ان پر واجب تھی۔ اور اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اس جنگ میں برطانیہ کی کوئی امداد نہ کریں۔ اس ذہنی کشمکش کی وجہ سے 1914ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد نہ ہو سکا۔ 1915ء کے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں اس مر پر تشویش کا اظہار کیا گیا کہ خلیفتہ المسلمین اور ملک معظم کی حکومتیں آپس میں برسر پیکار ہیں جزیرہ نمائے عرب ترکوں کی حکومت میں شامل تھا۔ اسلام کے مقامات مقدسہ، مکہ مدینہ اور بیت المقدس اسی سرزمین پر واقع ہیں۔ نظر آ رہا تھا کہ برطانوی حکومت ترکوں سے نبٹنے کے لیے اپنی جنگی سرگرمیوں کا رخ عرب علاقوں کی طرف موڑ دے گی۔ جنگ وہاں پہنچی تو مقامات مقدسہ کی بے حرمتی ہوگی۔ یہ بات مسلمانوں کے لیے نا قابل تصور تھی۔ حکومت کو ان جذبات کا بخوبی علم تھا۔ چنانچہ جنگ کے ابتدائی دنوں میں ہی برطانیہ اور فرانس کی حکومتوں نے مسلمانوں کو اطمینان دلانے کے لیے اس امر کا اعلان کر دیا کہ اتحادی فوجیں عرب علاقوں میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتیں۔ روس کی حکومت کو بھی اس اعلان سے اتفاق تھا۔ لیکن ایک طرف تو ہندوستان کے مسلمانوں کو یقین دھانی کے لیے اس مضمون کے اشتہار چھاپ کر تقسیم کئے جا رہے تھے اور دوسری طرف اتحادی فوجیں جزیرہ نمائے عرب کلیدی مقامات پر اتاری جا رہی تھیں۔ یہ سراسر فریب اور دھوکا تھا۔ اس وعدہ خلافی سے مسلمانوں کے دل پر گہرا زخم لگا۔ 1916ء میں لارنس جیسے برطانوی ایجنٹوں کے اکسانے پر شریف مکہ، حسین نے عثمانی حکومت کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا اور ترکوں پر لادینی کے الزامات عائد کئے۔ یہاں کسی کو اس معاملے میں کوئی غلط فہمی نہ تھی۔ شریف کے لگائے ہوئے الزامات بے بنیاد تھے اور وہ صرف انگریزوں کا پڑھایا ہوا سبق دھرا رہا تھا۔ لاہور کے مسلمانوں نے اس کارستانی پر احتجاج کرنا چاہا۔ پنجاب کے گورنر مائیکل اوڈوائر نے سنگین دھمکیاں دے کر غم و غصے کا اظہار کو روک دیا۔

6.3- برصغیر کے مسلمان اور حکومت

جنگ کے اس دور میں حکومت نے چن چن کر مسلمانوں سے بدلے لئے۔ بڑے بڑے اخباروں، زمیندار، الہلال، کامریڈ اور ہمدرد کی ضمانتیں ضبط کر لی گئیں۔ اس سے ان کی اشاعت بند ہوگئی۔ ترکوں سے پرجوش ہمدردی کا مظاہرہ کرنے والے سب لیڈروں، محمد علی، ظفر علی خاں، ابوالکلام آزاد اور ان جیسے بیسیوں کو یا تو گھروں میں نظر بند کر دیا گیا یا جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ فوج کی بھرتی جبری تھی۔ ناواجب ٹیکس وصول کئے جاتے تھے اور اظہار رائے پر ظالمانہ پابندیاں تھیں، ملک چھوڑ کر بہت سے نوجوان، ترکوں کی فوج میں شامل ہونے کے لیے چلے گئے۔ انگریزوں کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے کابل میں ایک منصوبہ تیار کیا جا رہا تھا جس کی تفصیلات ظاہر ہونے پر اس کو 'ریشمی رومال کی سازش، کا نام دیا گیا تھا۔ بیرون ملک کہیں کہیں برطانوی فوج کے مسلمان سپاہیوں نے ترکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا۔ جنرل ایلن ہی نے بیت المقدس کو فتح کیا تو برطانوی وزیر اعظم نے اس کو آخری صلیبی جنگ قرار دیا۔

6.4- جنگ کا خاتمہ اور ترکی کی حالت

جنگ نومبر 1918ء میں ختم ہوگئی۔ جرمنوں اور ان کے حلیفوں نے شکست تسلیم کر لی۔ جنگ کے دوران انگریزوں اور فرانسیسوں نے خفیہ معاہدوں کے ذریعے ترکوں کی سلطنت کے حصے بخرے کر لیے تھے۔ خود ترکی میں تھریس اور سمرنا کے صوبوں پر اتحادیوں کے اشارے پر یونانیوں نے فوج کشی کر دی، استنبول پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ خلیفۃ المسلمین ان کے ہاتھوں میں ایک بے بس قیدی بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے دستخطوں سے جبراً ایسے احکام جاری کرائے جا رہے تھے جو ترکوں کے قومی مفاد کیلئے تباہ کن تھے۔ دوسری طرف انگریز اور ان کے اتحادی، ترکوں کو انتہائی ذلت آمیز سلوک کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ترکوں کی سلطنت تو پہلے ہی جا چکی تھی۔ فاتحوں کا خیال تھا کہ تھریس اور سمرنا کے علاقے یونانیوں کے سپرد کر کے ترکی کی حدود کو صرف ایشیائے کوچک تک محدود کر دیا جائے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ایک طرف تو عثمانی خلافت ختم ہو جائے گی، دوسری طرف مقامات مقدسہ اتحادیوں کی گرفت میں چلے جائیں گے۔ اور کسی ایسے حکمران کو خلیفہ بنایا جائے گا جو انگریزوں کے لیے قابل قبول ہو۔ ان سب باتوں کا سدباب کرنے کے لیے خلافت کی تحریک پیدا ہوئی۔ اس موقع پر گاندھی نے مسلمانوں کے مطالبات کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ وہ کیوں؟ اس کا جواب دینے کے لیے تاریخ کے دوسرے دھارے کا جائزہ لینا ہوگا۔

6.5- لیگ اور کانگریس کی مفاہمت

تقسیم بنگال کی تنسیخ، کانپور کی مسجد کے المیے اور علی گڑھ کالج کو الحاقی یونیورسٹی کا درجہ دینے سے حکومت کے انکار نے مسلمانوں کے جذبات کو بہت مشتعل کر دیا تھا۔ بہت سے مسلمان اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ حکومت کے ساتھ دوستی اور رواداری کا مسلک اب فرسودہ ہو چکا ہے اور آگے چل کر قوم کے لیے نہایت خطرناک نتائج پیدا ہوں گے۔ مسلمانوں کے اس طرز فکر سے ہندوؤں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ کانگریس کے رہنماؤں نے مسلم لیگ کے جلسوں کی رونق بڑھانا شروع کر دی۔ 1912ء میں الہ آباد کے مقام پر ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس کا مقصد یہ تھا کہ دونوں قوموں میں اتحاد کی فضا قائم کی جائے۔ کانگریس اپنی قراردادوں میں سال بہ سال یہ مطالبہ دھرایا کرتی تھی کہ ہندوستان کو برطانوی نوآبادیات یعنی کینیڈا، آسٹریلیا جیسی سیلف گورنمنٹ دے دی جائے۔ سیلف گورنمنٹ کے مطالبے سے انگریز بدکتے تھے۔ 1913ء کی بدلی ہوئی فضا میں لیگ نے بھی کسی قدر مختلف انداز میں ''سیلف گورنمنٹ'' کی قرارداد پاس کر دی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سیاسی طور پر لیگ اور کانگریس ہم آہنگ ہیں۔ اس کے بعد محمد علی جناح کے لیے لیگ میں شمولیت کا دروازہ کھل گیا۔ اس زمانے کی کانگریس میں، اس کے سراپا ہندویت کے باوجود، چند اعتدال پسند اور آزاد خیال ہندو شامل تھے۔ جناح کی سیاسی رفاقت انہی عناصر کے ساتھ تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ ملک کو برطانوی تسلط سے آزاد کرانے کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات مٹ جائیں۔ اسی بات کو سامنے رکھتے ہوئے

انہوں نے لیگ اور کانگریس کے درمیان مفاہمت کی کوشش شروع کر دی۔ اس تگ و دو کا پہلا نتیجہ تو یہ نکلا کہ 1915ء میں دونوں جماعتوں کے سالانہ اجلاس ساتھ ساتھ بمبئی میں منعقد ہوئے اور دونوں کے صدارتی خطبوں کا لب ولہجہ ایک جیسا تھا، بلکہ مسلم لیگ کے خطبے کا انداز کسی حد تک جارحانہ تھا۔ اسی طرح 1921ء تک لیگ اور کانگریس اپنے اپنے سالانہ اجلاس باہمی مشورے سے ایک ہی شہر میں اور ایک ہی تاریخوں میں کرتی تھیں اور باہم مسائل پر ایک دوسرے کی ہمنوا تھیں۔

6.6- حکومت کا رویہ

1916ء میں لکھنؤ پیکٹ ہوا جس کی رو سے کانگریس نے مسلمانوں کی علیحدہ قومیت کو تسلیم کرتے ہوئے مسلم لیگ کو واحد نمائندہ جماعت مان لیا۔ اس معاہدے کو تکمیل تک پہنچانے والوں میں محمد علی جناح پیش پیش تھے۔

اس پر دستخط ہونے کے بعد کچھ عرصے کے لیے مسلمانوں اور ہندوؤں کی باہمی تلخیاں بہت حد تک کم ہو گئیں۔ جنگ کے سالوں میں بدیسی حکومت بہت سے اندرونی اور بیرونی خطروں سے گھری ہوئی تھی۔ ملک کے مختلف حصوں میں زیر زمین انقلابی تحریکیں پنپ رہی تھیں۔ جوں جوں ان کی سرگرمیوں کا پتہ چلتا جاتا تھا، حکومت کی سخت گیری بھی تشدد میں تبدیل ہوتی جاتی تھی۔ 1917ء میں ہوم رول لیگ بنی اور ملک کے تمام قابل ذکر لیڈر اس میں شامل ہو گئے۔ حالات سے خائف ہو کر اور اپنی گزشتہ پالیسی کے برعکس برطانوی حکومت کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ ہندوستان کو بتدریج حکومت خود اختیاری دے دی جائے گی۔ اس اعلان سے کوئی خوشگوار تاثر پیدا نہ ہوا۔ کیونکہ حاکموں کے قول اور فعل میں فرق تھا۔ آزادی کا وعدہ اور تشدد کی انتہا دونوں ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ عوام صبر آزما دقتوں سے دوچار تھے۔ روزمرہ ضرورت کی اشیاء کی قلت ہوشربا گرانی اور حکومت کے آمرانہ رویے نے، بلالحاظ مذہب وملت، سب طبقوں میں اشتعال پیدا کر دیا تھا۔ جنگ ختم ہوئی تو حالات کی بہتری کی توقع پیدا ہو گئی۔ لوگ حکومت کے رویے میں مناسب تبدیلیوں کے منتظر تھے۔ لیکن جلد ہی حالات نے ثابت کر دیا کہ حکومت لوگوں سے جنگ کے زمانے کے بدلے لینا چاہتی ہے۔

6.7- رولٹ بل

قاعدہ ہے کہ ہر جنگ کے ختم ہونے کے بعد دشمن کا خطرہ ٹل جاتا ہے تو لڑائی کے زمانے کے قوانین اور ضابطوں کو نرم کر دیا جاتا ہے اور عوام پر سے بہت سی پابندیاں اٹھا لی جاتی ہیں۔ لیکن حکومت کا ارادہ اس کے الٹ تھا۔ وہ زمانہ جنگ کے انتہائی تشدد آمیز ضابطوں کو روزمرہ کے ملکی قانون میں مستقل طور پر شامل کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس غرض سے مجلس قانون ساز میں دو سرکاری بل پیش کیے گئے جن کو عام طور پر رولٹ بل کہا جاتا ہے۔

اس کا ماحصل یہ تھا کہ شہری آزادیوں کو مکمل طور پر سلب کر لیا جائے۔ قانون کے اس مسلمہ اصول کو کہ ملزم کو جرم کو ثابت

کرنے کا فرض استغاثے پر عائد ہوتا ہے ختم کر کے یہ قرار دیا گیا کہ ہر ملزم کو مجرم تصور کیا جائے اور یہ اس کا اپنا فرض ہے کہ اپنی بے گناہی ثابت کرے۔ باغیانہ دستاویزیں رکھنے والوں کے لیے بھی کڑی سزائیں تجویز کی گئیں چنانچہ اس قانون کے ماتحت سودا سلف باندھنے والا ردی اخباری کاغذ بھی باغیانہ دستاویز شمار کیا جا سکتا تھا۔ نیز مرے ہوئے افراد کے حوالے سے دی ہوئی گواہی بھی عدالتوں کے لیے قابل قبول قرار پائی۔ مجوزہ قانون کی ان وحشیانہ دفعات سے لوگ تلملا اٹھے اور مرنے مارنے کے لیے تیار ہو گئے۔ (یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اسی کالے قانون کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے محمد علی جناح مجلس قانون ساز کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے تھے)۔

6.8- جلیانوالا باغ کا واقعہ

حکومت بھی اپنے مخالفوں کو مکمل طور پر کچلنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ پہلا تصادم دہلی کے ریلوے سٹیشن پر ایک معمولی جھگڑے سے ہوا۔ پولیس نے بے سوچے سمجھے گولی چلا دی۔ سب سے زیادہ دردناک واقعہ امرتسر میں ہوا جہاں 13 اپریل 1919ء کو جلیانوالہ باغ کے ایک جلسہ عام پر فوج کے ایک دستے نے جنرل ڈائر کے حکم پر گولی چلا دی اور گولیوں کی بارش اس وقت تک جاری رہی جب سپاہیوں کے پاس ایک کارتوس بھی نہ رہا۔ تو ساتھ ہی امرتسر میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ اس کے فوراً بعد لاہور اور پنجاب کے دوسرے بڑے شہروں کا نظم ونسق بھی فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ کیونکہ معاملات سول حکومت کے بس سے باہر تھے۔ انگریزوں کے لگائے ہوئے مارشل لاء میں عوام کو ہر طرح کے ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا۔ کرفیو آرڈر کی خلاف ورزی کرنے والوں کو فی الفور گولی سے اڑا دیا جاتا۔ بعض گلیوں میں لوگوں کو پاؤں پر چلنے کی ممانعت تھی۔ وہاں سے گزرنے والوں کو اپنے پیٹ کے بل رینگ کر راستہ طے کرنا پڑتا تھا۔ لاہور کے شہریوں سے ان کے بائیسکل اور بجلی کے پنکھے تک چھین لیے گئے۔ طالب علموں کو دن میں چار مرتبہ فوج کے روبرو حاضری دینا پڑتی تھی اور ہر انگریز کو آگے بڑھ کر سلام کرنا پڑتا تھا۔ معمولی معمولی خطاؤں پر لوگوں کو بجلی کے کھمبوں سے باندھ کر وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں۔ اخبارات پر سنسر تھا۔ پنجاب کی خبریں باہر نہیں نکلنے پاتی تھیں۔ تاہم کچھ عرصے کے بعد جب یہ پابندیاں بے کار ہو گئیں اور حکومت کے مظالم کی تفصیلات کا علم ہوا تو ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک غم وغصے کی لہر دوڑ گئی۔ انہی حالات میں گاندھی کی قیادت کا آغاز ہوا۔ گاندھی کا پہلا مطالبہ یہی تھا کہ پنجاب کے لوگوں پر جس قدر ظلم وستم ہوا ہے اس کی تلافی کی جائے۔ مالی اور جانی نقصان اٹھانے والوں یا ان کے وارثوں کو معاوضہ دیا جائے اور افسروں کو سزا دی جائے۔ یہ مطالبات روز بروز زور پکڑ رہے تھے۔

6.9- تحریک خلافت کا آغاز

دوسری طرف مسلمان بھی ترکی کی سب ابتلاؤں کا سارا الزام بجا طور پر برطانوی حکومت پر دھرتے تھے۔ ہندو اور

مسلمان دونوں بپھرے ہوئے تھے اور دونوں حکومت سے بیزار تھے لیکن دونوں کی وجوہات مختلف تھیں۔ مسلمان ترکوں کے مصائب سے پریشان تھے اور ہندو پنجاب کے مظالم کی تلافی چاہتے تھے۔ لیکن مسلمانوں میں غم و غصے کے جذبات شدید تر تھے۔ ایک انگریز نے لکھا کہ ''مسلم انڈیا اس وقت ایک بہت بڑے بارود خانے کی طرح ہے جس میں چنگاری لگنے سے سارا ملک بھک سے اڑ جائے گا'' مسلمانوں کے ہر گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ مسلمان اپنے گھروں میں بھی صرف ترکی اور خلافت پر گفتگو کرتے تھے۔ کسی دوسرے معاملے سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔

خلافت کی بقاء کے حق میں ایک ملک گیر تحریک وجود میں آ گئی اور اس کو منظم کرنے کے لیے (آل انڈیا خلافت کمیٹی) وجود میں آئی۔ اپنے حجروں سے نکل کر علماء بھی سیاست کے میدان میں آ گئے۔ چونکہ خلافت ایک مذہبی مسئلہ تھا اس لیے علماء نے بھی ضروری سمجھا کہ وہ اس نازک مرحلے میں قوم کی قیادت کریں۔

انہی دنوں اقبال نے بھی اپنی ایک تحریر میں اس بات پر زور دیا تھا کہ مسلمانوں کے دنیاوی اور سیاسی معاملات میں بھی علماء کی مداخلت ضروری ہے۔ ملک کے بہت سے قابل ذکر علماء اور سیاسی لیڈر تحریک خلافت میں شامل ہو گئے۔ اور اس کی سربراہی محمد علی اور شوکت علی کر رہے تھے۔ یہ دونوں بھائی 1919ء میں قید سے رہا ہو کر اپنے گھر کو جانے کی بجائے سیدھے امرتسر کے قومی جلسوں میں شریک ہونے کے لیے پہنچ گئے۔ یہیں اقبال نے محمد علی کی طرف منہ کر کے اپن اوہ مشہور و معروف قطعہ پڑھا جو یوں شروع ہوتا تھا:

''ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند''

(الف) تحریک خلافت کے مقاصد: تحریک خلافت کے تین بڑے بڑے مطالبات تھے۔

1- خلافت عثمانیہ کو قائم رکھا جائے۔
2- ترکی کی علاقائی سلامتی کا تحفظ کیا جائے۔
3- مقامات مقدسہ ترکوں کے پاس ہی رہیں اور جزیرہ نمائے عرب میں فرنگیوں کا تسلط ختم کیا جائے۔

ادھر روز بروز یورپ کے اخباروں میں چھپنے والی خبریں اور اتحادی ترجمانوں کے بیانات سے یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ ترکوں کی قومی ہستی ملیا میٹ کر دی جائے گی اور ان کو اتحادیوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا پورا پورا مزہ چکھایا جائے گا۔ اس قسم کی ہر خبر مسلمانوں کے لیے رنج و الم کا ایک نیا پیغام لاتی تھی۔ مسلمان، خلافت اور ترکوں کے لیے ہر ممکن قربانی دینے کو تیار تھے۔ لیکن برطانوی حکومت ان کے جذبات کو قطعی طور پر نظر انداز کرتی چلی جاتی تھی بلکہ اس بات سے برہم تھی کہ ہندوستان کے مسلمان ترکوں کے کیا لگتے ہیں جو اتنا شور مچا رہے ہیں۔ اس وقت حکومت ہند کا سربراہ اوسط درجے کی لیاقت کا ملک لارڈ چیمسفورڈ تھا۔ اس نے لندن کو اس مضمون کے بہت سے پیغام بھیجے کہ ترکوں سے نرم شرائط پر صلح کر کے مسلمانوں کے غصے کو ٹھنڈا کیا جائے لیکن

وائسرائے کی شخصیت میں وہ دبدبہ نہ تھا کہ وہ اپنی بات منوا سکتا۔ برطانوی حکومت اور اس کے حلیف فتح کے نشے میں چور تھے اور اس مشورے کو درخور اعتنا نہ سمجھتے تھے۔ چیمسفورڈ نے مختلف قوموں کے ایک نمائندہ وفد سے اس معاملے پر اظہار ہمدردی کیا لیکن اس کے پاس خالی خولی تسلیوں اور اپنی مجبوریوں کے اظہار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

(ب) ہندو مسلم اتحاد کی نوعیت: جو ہندو مسلم اتحاد ان غیر معمولی حالات میں وجود میں آیا، وہ سبھاشن چندر بوس کے الفاظ میں اس طرح پر تھا کہ گاندھی اور کانگریس مسلمانوں کے ترکی اور خلافت کے بارے میں مطالبات کی حمایت کریں گے اور خلافت والے گاندھی کی اس بات کی تائید کریں گے کہ جلیانوالہ باغ میں مرنے والوں کے جانی نقصان کی تلافی کی جائے۔ ان کی رائے میں یہ سمجھوتہ ایک طرح کا سودا تھا۔ ایک طبقے میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے گاندھی کی رہنمائی کو غیر مشروط طور پر قبول کر لیا تھا۔ اس زمانے میں مولانا محمد علی اور شوکت علی، گاندھی کے متعلق پبلک جلسوں میں جو غیر معمولی توصیفی کلمات استعمال کرتے تھے اس سے یہی تاثر پیدا ہوتا ہے لیکن جواہر لال نہرو کی روایت ہے کہ اس افراتفری کے اتحاد والے دور میں بھی ہندو اور مسلم نیشنل ازم کو علیحدہ علیحدہ شناخت کیا جا سکتا تھا اور بیرون ملک کے واقعات مسلم نیشنل ازم کی توجہ کا مرکز تھے۔

(ج) وفد خلافت: جب تحریک خلافت کے رہنماؤں نے محسوس کیا کہ یہاں بیٹھ کر ان کی شنوائی نہیں ہوتی تو انہوں نے مولانا محمد علی، مولانا سلیمان ندوی اور سید حسین پر مشتمل ایک وفد انگلستان کو بھیجا تا کہ برطانوی حکومت پر ہندوستان کے مسلمانوں کا نقطہ نظر واضح کر دیا جائے۔ اس وفد کے ارکان مارچ 1920ء کو بمبئی سے علیحدہ علیحدہ روانہ ہوئے اور آٹھ مہینے بعد ناکام لوٹے۔ اس دوران انہوں نے برطانیہ کی پارلیمنٹ، حکومت کے ارکان اور زندگی کے مختلف شعبوں کے عمائدین سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی۔ لیکن کسی کے منہ سے ترکوں کے لیے کلمہ خیر نہ نکلا۔ فرانس، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ میں بھی جا کر دیکھا۔ پوپ سے ملاقات کی اس بے نتیجہ تگ ودو کے بعد جب وطن واپس پہنچے تو مولانا محمد علی نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ہم خود آزاد ہوئے بغیر عملی طور پر کسی اسلامی ملک کی کوئی امداد نہیں کر سکتے۔ اب ان کا اولین مقصد یہ قرار پایا کہ سب سے پہلے آزادی کے لیے جدوجہد کی جائے۔ گاندھی بھی اس مقصد سے متفق تھے۔ انہوں نے آزادی کا نام سوراج رکھا۔ ملک میں طرف ''سوراج، سوراج'' کے نعرے لگنے لگے۔

6.10- عدم تعاون کی تحریک

سوراج حاصل کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل مرتب کیا گیا جس کے مصنف خود گاندھی تھے۔ اس کا منشا یہ تھا کہ تقسیم بنگال کے دنوں کی طرح برطانوی مال کا مکمل بائیکاٹ کر دیا جائے۔ باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کے لیے سرکاری عدالتوں سے رجوع نہ کیا جائے بلکہ ان کو پنچائتوں کے ذریعے نپٹایا جائے۔ سرکاری واجبات کی ادائیگی روک دی جائے۔ وکیل عدالتوں کے سامنے پیش نہ ہوں۔ سرکاری ملازم اپنے استعفیٰ داخل کر دیں۔ طالب علم سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں سے باہر نکل آئیں۔ نشہ آور چیزوں پر

مکمل پابندی لگا دی جائے۔غرضیکہ ہر محاذ پر انگریزوں کا بائیکاٹ کر دیا جائے۔اس سارے پروگرام کو''نان کوآپریشن'' کا نام دیا گیا۔''عدم تعاون'' اس کا اردو ترجمہ ہوا جو غالباً ابوالکلام آزاد کی اختراع تھی۔گاندھی کا اندازہ تھا کہ اگر اس پروگرام پر پورا ایک سال عمل کیا جائے تو''سوراج'' حاصل ہو جائے گا۔''عدم تعاون'' کا پروگرام پہلے خلافت کمیٹی والوں نے قبول کیا۔پھر کانگریس اور دوسری جماعتوں نے اس کو اپنایا۔نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریکیں دوش بدوش چلنے لگیں، بلکہ دونوں ایک ہی تحریک کا حصہ بن گئیں۔حکومت نے تشدد کی انتہا کر دی۔لوگوں کو ناحق بدنی سزائیں دی گئیں۔جیلوں میں بند کیا گیا ان کی املاک ضبط کی گئیں اس کے باوجود مسلمانوں میں قربانی کا جذبہ بڑھتا ہی گیا۔مولانا محمد علی کا یہ شعر شاید اسی موقع کے لیے لکھا گیا ہو:

تعزیر جرم عشق ہے بے حرفہ محتسب

بڑھتا ہے اور ذوق گناہ یہاں سزا کے بعد

تحریک کے دنوں میں گاندھی کے طول طویل دوروں کے اخراجات خلافت فنڈ سے ادا کئے جاتے تھے لیکن وہ اکثر و بیشتر ہندوؤں کے گھر میں رہتے تھے اور ان کے اثر میں آ گئے تھے۔شاید یہی وجہ تھی کہ جب سرکاری تعلیمی اداروں کے بائیکاٹ کا مسئلہ پیش ہوا تو علی گڑھ پر حملہ آور ہونے والوں اور اس کو توڑنے والوں میں گاندھی پیش پیش تھے لیکن بنارس ہندو یونیورسٹی کے معمولات میں انہوں نے دخل دینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔اس سے کئی مسلمان گاندھی کی طرف سے کھٹک گئے۔

6.11- چوراچوری کا حادثہ

گاندھی بار بار کہتے تھے کہ ان کی تحریک کبھی تشدد سے ملوث نہیں ہوگی لیکن اس آگ اور خون کے ماحول میں تشدد روزمرہ کا معمول بن گیا۔جب ایسے واقعات گاندھی کے نوٹس میں لائے جاتے تو وہ ان کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے۔حکومت نے بہت سے لیڈروں کو جیل میں بھیج دیا اس کے باوجود تحریک اتنی جاندار تھی کہ کامیابی سامنے نظر آتی تھی، حکومت نے اپنے اعتباری لیڈروں کی معرفت گفت وشنید کا دروازہ کھولنا چاہا لیکن بات آگے نہ بڑھی تا کہ گاندھی نے ازخود چورا چوری نام کے ایک گاؤں میں آتش زدگی کے ایک واقعہ کی (جس میں پولیس کے اٹھارہ سپاہیوں کو تھانے کی عمارت کے اندر زندہ جلا دیا تھا) آڑ لیتے ہوئے 4فروری 1922ء کو نان کوآپریشن کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔اس کے ساتھ ہی خلافت کی تحریک بھی ختم ہوگئی۔یہ بھی ایک معمہ تھا کہ گاندھی نے اپنے کسی مسلمان ساتھی سے مشورہ کئے بغیر ایک اچھی کامیابی کے دروازے تک پہنچی ہوئی تحریک کو یکا یک کیوں ختم کر دیا؟ اس معمے کے حل سے تاریخ کے بعض اہم گوشے بے نقاب ہوں گے۔انگلستان میں تحریک خلافت کی سربراہی سید امیر علی، آغا خان اور اصفہانی کر رہے تھے۔جہاں تک ہو سکا انہوں نے اخباری مضمونوں کے ذریعے اور اپنے ذاتی اثر ورسوخ کو استعمال کرتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کا نقطۂ نظر برطانوی حکومت تک پہنچایا۔

6.12- تحریک خلافت کے مثبت اور منفی پہلو

تحریک خلافت کے نکتہ چین اس زمانے میں بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ اپنی تمام خامیوں کے باوجود تحریک خلافت کے بہت سے مثبت پہلو بھی تھے۔ اس تحریک کی وساطت سے مسلمانوں کی سیاست میں آزادی کا تصور داخل ہوا۔ تحریک خلافت اسلامی یگانگت اور اخوت کے جذبے کا ایک بے پناہ مظاہرہ تھا۔ ترکوں کے لیے ہندی مسلمانوں نے ایسی قربانیاں دیں جن کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔

تحریک خلافت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ خلافت عثمانی کے ذریعے دنیائے اسلام کا ایک مرکز قائم رہے اور آئندہ اتحاد کی بنیادیں مسمار ہونے سے بچ جائیں۔ اس تحریک سے مسلمانوں میں پہلی مرتبہ ایسے لیڈر ابھرے جو عوام کے ساتھ گہرا رابطہ رکھتے تھے۔

ہزاروں کارکنوں نے سیاسی تربیت حاصل کی جو بعد میں تحریک پاکستان کے لیے قوت کا باعث بنی۔ اگر خلافت جتنی پرقوت تحریک کا وجود نہ ہوتا تو اتحادی ترکوں کو ملیامیٹ کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ تحریک خلافت کا سب سے اہم منفی پہلو یہ تھا کہ اس سے ہجرت کی تحریک نے جنم لیا۔ بعض علماء کا خیال تھا کہ انگریزی عملداری میں ہندوستان دارالحرب ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو یہاں سے ہجرت کر کے کسی قریبی اسلامی ملک میں پناہ لینا چاہئے۔ چنانچہ اسی دینی جذبے سے مغلوب ہو کر اٹھارہ ہزار سیدھے سادے مسلمانوں نے اپنے اثاثوں اور املاک کو کوڑیوں کے مول بیچ دیا اور اپنا گھر بار چھوڑ کر افغانستان کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہمسایہ ملک کے پاس اتنے ذرائع نہیں تھے کہ مہاجرین کی کفالت کا بوجھ اٹھا سکتا۔ چنانچہ جو پہنچ گئے تھے ان کو واپسی کا حکم ملا۔ جو راستے میں تھے ان کو روک دیا گیا۔ راستے میں سردی کی شدت تھی، خوراک بھی نہ ملتی تھی۔ سینکڑوں وہیں مر کھپ گئے جو واپس آئے ان کے واسطے سر چھپانے کو بھی کوئی جگہ نہ تھی۔ اس طرح ہزاروں خاندان تباہی کے منہ میں چلے گئے۔

6.13- خود آزمائی نمبر 5

سوال نمبر 11 تحریک خلافت کے اسباب و مقاصد بیان کریں نیز اس تحریک کی ناکامی کی وجوہات بیان کریں۔

7- 1920ء سے 1930ء تک

7.1- 1919ء کا ایکٹ اور مسلمانوں کے مسائل

20 اگست 1917ء کو برطانوی حکومت کی طرف سے پارلیمینٹ میں اعلان کیا گیا تھا کہ ہندوستان کو بتدریج سیلف گورنمنٹ یا حکومت خود اختیاری دے دی جائے گی۔ اس کے بہت جلد بعد وزیر ہند مانٹیگو نے یہاں آ کر سیاسی لیڈروں، اعلیٰ سرکاری افسروں اور صوبائی گورنروں سے ملاقاتیں کیں اور ملک کے لیے ایک دستوری خاکہ (جس کے خدوخال اس کے دماغ میں پہلے سے موجود تھے) تیار کیا۔ اس خاکے کی بنیاد پر 1919ء کا دستور بنا، جو متفقہ طور پر تجرباتی اور محض عبوری دور کے لیے تھا۔ اس میں صوبوں کو پہلے کی نسبت بہت وسیع اختیار سونپے گئے تھے اور جزوی طور پر جمہوری طرز حکومت کا ڈھانچہ تیار کیا گیا تھا۔ یہ وہی جمہوریت تھی جس کا گزشتہ تجربہ مسلمانوں کے لیے چنداں خوشگوار نہ تھا اور جس سے وہ جلد یا بدیر ایک بے حیثیت اقلیت میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ اس بات پر تو مسلمانوں کا اتفاق تھا کہ جمہوریت سے کوئی فائدہ نہیں وہ صرف یہی چاہتے تھے کہ اس جمہوریت کو ایسے تحفظات کے ساتھ نافذ کیا جائے جس کی مدد سے قوم کے جائز مفاد کا تحفظ ہو سکے۔ ان تحفظات میں سب سے اہم جداگانہ انتخاب کا طریق تھا۔ چونکہ مغربی جمہوریت میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے، مسلمانوں کے لیے یہ گھاٹے کا سودا تھا۔ مگر ہندوؤں کو اپنی اکثریت کی وجہ سے اس میں سراسر فائدہ نظر آتا تھا۔ اس لیے ان کی خواہش اور کوشش تھی کہ حکومت خود اختیاری کا نفاذ تدریجی نہیں بلکہ فوری ہو اور وہ جلد سے جلد بلاشرکت غیرے اقتدار کے مالک بن جائیں۔ نئے آئین کے ماتحت، مجالس قانون ساز کے انتخابات، انتہائی طور ناسازگار حالات میں ہوئے۔ عدم تعاون کا زمانہ تھا۔ بڑی بڑی پارٹیوں کے تمام اہم کارکنوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا اور بعض جگہوں پر چوہڑے اور نائی امیدوار کامیاب قرار دیئے گئے۔

7.2- فسادات کا دور

4 فروری 1922ء کو گاندھی نے کسی مسلمان لیڈر سے مشورہ کئے بغیر، عدم تعاون کی تحریک کا گلا گھونٹ دیا۔ اس سے تحریک خلافت بھی بے جان ہو کر رہ گئی۔ اس وقت بہت سے بااثر رہنما جیلوں میں تھے۔ گاندھی پر مقدمہ قائم ہوا۔ انہیں پانچ سال قید کی سزا ملی ابھی یہ مدت پوری نہ ہوئی تھی کہ انہیں رہا کر دیا گیا۔ عدم تعاون اور خلافت کی تحریکوں کے دوران تو ہندو مسلم اتحاد کے نعرے گونجتے تھے۔ لیکن ان کے اختتام پر ہندو مسلم کشمکش کئی گنا قوت کے ساتھ واپس آ گئی۔ 1922ء سے 1931ء تک کے زمانے کو عام طور پر فسادات کا دور کہا جاتا ہے۔

ابتداء 20 اکتوبر 1921ء کو مالا بار سے ہوئی جہاں ہندو مخبروں اور حکومت کے افسروں کی ملی بھگت سے مسلمانوں پر غیر انسانی تشدد کے تمام ریکارڈ مات کر دیئے گئے۔ ملتان، لاہور، کلکتہ، بمبئی اور دوسرے تمام بڑے بڑے شہروں بلکہ قصبوں میں بھی خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ سب سے زیادہ ہولناک فساد 1931ء میں کانپور میں ہوا جہاں مسلمانوں کے جان و مال کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا۔ فسادات کی ابتدا تو معمولی جھگڑوں اور رنجشوں سے ہوئی مگر ان کے نتائج نہایت سنگین ہوتے تھے۔

7.3- شدھی اور سنگھٹن

اسی مسموم فضا میں شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ ''شدھی'' کے لفظی معنی پاک کرنا ہے۔ اس تحریک کا بانی جالندھر کا ایک وکالت پیشہ سماجی کارکن منشی رام تھا جو بعد میں شردھانند کے نام سے مشہور ہوا۔ عدم تعاون کی تحریک کے پلیٹ فارم پر وہ دہلی میں پیش پیش نظر آتا تھا۔ ایک مرتبہ تو اس نے دہلی کی جامع مسجد سے بھی مسلمانوں کے ایک ہجوم سے خطاب کیا۔ وہ کسی سیاسی مقدمے میں ملوث ہو کر جیل بھیجا گیا لیکن معینہ مدت سے پہلے نامعلوم وجوہات کی بنا پر رہا کر دیا گیا۔ جیل سے باہر نکلا تو اس نے شدھی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو ہندو مذہب میں (جو کبھی تبلیغی مذہب نہیں رہا تھا) داخل کر لیا جائے بظاہر اس تحریک کے دو مقصد ہو سکتے تھے۔ پہلے تو یہ کہ اس تدبیر سے ہندوستان میں مسلمانوں کا خاتمہ کر دیا جائے اور اگر یہ منصوبہ پوری طرح کامیاب نہ ہو تو ہندو اکثریت اتنی غالب ہو جائے کہ مسلمان اقلیت کی آواز، مغربی جمہوری نظام کے ماتحت، مکمل طور پر دبا دی جائے۔

شدھی تحریک کی کامیابی یا ناکامی تو اپنی جگہ پر رہی۔ اس سے ہندوؤں کا بگاڑ بہت زیادہ بڑھا جو کئی جگہ پر (جہاں آریہ سماجی پر چارک مسلمان عورتوں اور بچوں کو اپنے اثر سے ورغلا کر ہندو بنا لیا کرتے تھے) ہندو مسلم فسادات کا باعث بنا۔ اسی دور میں ہندو قوم کا سب سے بااثر لیڈر اردو زبان کا جانی دشمن اور بنارس ہندو یونیورسٹی کا بانی پنڈت مدن موہن مالویہ تھا۔ وہ کھلم کھلا ہندوؤں کو کہا کرتا تھا کہ تمہیں اپنے تاریخی دشمن یعنی (مسلمان) سے نپٹنا ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ اپنے آپ کو مقابلے کے لیے تیار کرو۔ اکھاڑوں میں جا کر ورزش کرو۔ جسمانی صحت کو بہتر بناؤ۔ دست بدست لڑائی کا فن سیکھو تا کہ وقت پر اپنی اور اپنی عورتوں کی حفاظت کر سکو۔ وہ یہ بھی کہا کرتا تھا کہ تاریخی طور پر ہندوؤں کی نا اتفاقی ان کی غلامی کا سبب بنی ہے۔ ہندوؤں کی آئندہ کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ان کے باہمی اختلافات ہمیشہ کے لیے ختم کر دیئے جائیں۔ اس اتحاد کی تحریک کو سنگھٹن کہا جاتا ہے۔ اس اتحاد کا نشانہ صرف مسلمان تھے۔

7.4- ہندو مہا سبھا

اس کے علاوہ مالویہ ہندو مہا سبھا کا بانی بھی تھا۔ پہلے پہل تو یہ جماعت اپنے آپ کو غیر سیاسی کہتی تھی۔ لیکن جلد ہی سیاست

کے میدان میں کود پڑی اور اس نے جداگانہ انتخاب کی سرتوڑ مخالفت شروع کر دی۔ جداگانہ انتخاب کو مسلمان، سیاسی طور پر، اپنے قومی وجود کے تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ہندو مہاسبھا کے اس اقدام سے، ہندوؤں اور مسلمانوں میں منافقت کی خلیج اور بھی وسیع ہوگئی۔ 1925ء، 1926ء اور 1927ء میں ہندو مہاسبھا کے پلیٹ فارم پر ہونے والی تقریروں میں اس قسم کے خیالات ظاہر کئے گئے تھے:

''مسلمان باہر سے آئے تھے یہاں یہ ایک غیر قوم ہیں، ہندوستان کے ساتھ ان کا کوئی واسطہ نہیں، اگر وہ اس کو چھوڑنا چاہیں تو خوشی سے اپنی راہ لیں۔ اگر یہاں رہنا ہو تو ہندو بن جائیں اور ہندو معاشرے میں اپنے آپ کو جذب کر لیں۔ ورنہ ان کا وہی حشر ہوگا جو چند سو سال پہلے سپین میں مسلمانوں کا ہوا تھا۔ حکومت مسلمانوں پر متواتر مہربانیاں کرتی جاتی ہے۔ جو رعایتیں ان کو دیجاتی ہیں اس سے ہندوؤں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ ہندوؤں کے لیے لازمی ہے کہ انگریزوں اور مسلمانوں کے گٹھ جوڑ کے خطرناک نتائج سے خبردار رہیں۔''

7.5- کانگریس اور سوراجی دھڑا

تحریک عدم تعاون اور خلافت کے خاتمے پر کانگریس میں پھوٹ پڑ گئی۔ ایک طبقہ تو عدم تعاون کے مسلک پر مضبوطی سے قائم تھا۔ دوسرا اس بات پر اصرار کرتا تھا کہ کونسلوں کا بائیکاٹ ختم کر دیا جائے۔ ان کے اندر جا کر پارلیمانی حربوں سے کام لیتے ہوئے حکومت کے کاروبار کو مکمل بلکہ ناممکن بنا دیا جائے۔ دونوں فرقوں کے جھگڑے نے طول پکڑا۔ بالآخر مولانا محمد علی کی کوششوں سے ان کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا جس کی رو سے بعض شرائط کے ماتحت کانگرسیوں کو انتخابات لڑنے کی اجازت دے دی گئی۔ کونسلوں کے اندر پہنچنے والے کانگریسی سوراجی کہلاتے تھے اور ان کے سب سے اہم لیڈر موتی لال نہرو تھے جو مرکزی اسمبلی میں اپنی پارٹی کے قائد تھے۔ بنگال اور سی پی میں سوراجیوں نے اپنی جارحانہ تنقیدوں سے ہر محاذ پر حکومت کو شکست دی۔

7.6- مسلم لیگ کا اجلاس 1924ء

ادھر لیگ کے اندرونی حالات دگرگوں تھے۔ تحریک خلافت کی ناکامی نے قومی میں مایوسی، بے بسی اور بے دلی کا شدید احساس پیدا کر دیا تھا۔ 1922ء اور 1923ء میں لیگ کا کوئی اجلاس منعقد نہ ہو سکا۔ 1924ء کا اجلاس لاہور میں بلایا گیا۔ محمد علی جناح اس کے صدر تھے۔ ان کا خطبہ صدارت کا ایک ایک لفظ ہندوؤں اور دوسری ہمسایہ قوموں کے لیے خیر سگالی کا پیغام تھا۔ انہوں نے کانگریس کے رہنماؤں سے پرزور اور دردمندانہ اپیل کی کہ وہ بگڑتے ہوئے حالات کو سنوارنے کی کوشش کریں اس

معاملے میں انہوں نے لیگ کی طرف سے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ یہ اپیل اگلے دو سالوں میں بھی دھرائی گئی لیکن اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ بلکہ کانگریس نے ہندو مہا سبھا کے ساتھ اپنے تعلقات کو مستحکم کرنا شروع کر دیا۔

7.7- فسادات کی ذمہ داری

فرقہ ورانہ فسادات بار بار ہوتے۔ ہر فساد کے بعد بدلے کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ بدلے کا بدلہ چلتا رہا۔ ہندو مہا سبھا کے رہنما کھلم کھلا فسادات کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ فساد برپا کرتے اور ان کو طویل دینے سے ہندو نوجوانوں کو بہت سے کارآمد تربیت ملتی ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ خود تو ہندو ہر وقت فسادات کی تیاریوں میں مصرف رہتے یا فساد برپا کرنے کے لیے شوشے چھوڑتے رہتے، مگر جب فساد پھوٹ پڑتا تو اس کا سارا الزام مسلمانوں پر دھرتے اور مسلمان رہنماؤں سے مطالبہ کرتے کہ فسادیوں کی مذمت کریں۔ جب فسادات میں ہندوؤں کی زیادتی ثابت ہو جاتی تو منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالتے۔ 1925ء میں کوہاٹ میں ہندوؤں کی طرف سے ایک دلازار نظم شائع کی گئی اور ایک خونریز فساد ہوا۔ اس سے متاثر ہو کر گاندھی نے ایک طویل بیان شائع کیا جس میں بہت سی دوسری باتوں کے علاوہ یہ انکشاف بھی کیا: میرا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ہر ہندو بزدل ہوتا ہے اور مسلمان فسادی۔ اگر ایک فریق ونگٹی ہو تو دوسرا لازمی طور پر بزدل ہوتا ہے۔ ان الفاظ میں گاندھی نے فسادوں کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی اور ہندوؤں کو مشورہ دیا کہ اپنی بزدلی چھوڑ دو اور مقابلے پر آ جاؤ۔ گاندھی کی اس منطق سے بہت سے مسلمانوں کی خوش فہمیاں دور ہو گئیں۔ مولانا محمد علی جو گاندھی کی مہاتمائت کا راگ الاپتے نہ تھکتے تھے گاندھی سے کھٹک گئے۔

7.8- ہندو مہا سبھا، کانگریس اور جداگانہ انتخاب

1926ء کے آخر میں ہونے والے عمومی انتخابات میں ذلت آمیز شکست اٹھانے کے بعد کانگریس ہندو مہا سبھا کی باندی بن گئی۔ موتی لال نہرو کا اثر و رسوخ کم ہوا۔ کانگریسی ارکان سمیت اسمبلی کے تمام ہندو ممبروں نے مالویہ کی قیادت قبول کر لی۔ جو بات آج ہندو مہا سبھا کے لیڈر کہہ دیتے، کل کو کانگریس والے بھی بے سوچے سمجھے دھرا دیتے۔ اس سے کانگریس بدترین قسم کی فرقہ پرستی کی دلدل میں پھنس گئی۔ ہندو مہا سبھا نے جداگانہ انتخابات کے خلاف جس غوغا آرائی کا بندوبست کیا تھا، کانگریس بھی اس میں شریک ہو گئی۔ انہی دنوں برطانوی لیبر حکومت کے ایک اہم رکن نے مدراس کے سوراجی، سیتا مورتی کے نام اپنے ایک ذاتی خط میں جداگانہ طریق انتخاب کی پرزور مذمت کی اور بتایا کہ یہ طریقہ برطانوی طرز فکر کے خلاف ہے۔ اس حوصلہ افزائی سے جداگانہ انتخاب کے مخالفوں نے اپن مہم کو اور بھی تیز کر دیا، اسی نسبت سے مسلمانوں کو اور بھی تشویش ہوئی۔ ہر چند کہ برطانوی حکومت کا سرکاری موقف یہی تھا کہ جتنی دیر تک مسلمان جداگانہ انتخاب

کی ضرورت محسوس کرتے رہیں گے اتنی دیر تک ان کی آئینی حیثیت برقرار رہے گی۔لیکن تقسیم بنگال کے حشر سے ثابت ہو چکا تھا کہ انگریز حکمرانوں کے وعدوں پر اعتبار کرنا کبھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکتا۔کانگریس کے لیڈروں نے کم وبیش تیس چالیس سال سے برطانیہ کے بااثر حلقوں سے رابطہ قائم کر رکھا تھا اور ان کو ہندوستان کی خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔کانگریس والوں کا مقصد ہندوستان کے متعلق انگریزوں کو صحیح خبریں فراہم کرنا نہ تھا بلکہ اپنے نقطہ نظر کی اشاعت مقصود تھی۔ان خبرناموں میں مسلمانوں کے متعلق سفید جھوٹ اور نصف سچ ملا جلا کر پیش کیا جاتا ہے۔1922ء کے بعد کانگریسی لیڈروں نے ہر سال موسم گرما میں برطانیہ کے دورے شروع کئے۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ مرکزی اسمبلی کے صدر وی جے پٹیل (جن کو اپنے عہدے کے اقتضا سے سیاسی دھڑے بندیوں سے پرے پرے رہنا چاہئے تھا) 1927ء میں صرف اسی لیے انگلستان گئے تھے کہ برطانوی حکومت کو کانگریس کا یہ پیغام دیں کہ اگر آئینی کمیشن میں گاندھی کو مقرر کر دیا گیا تو سب معاملات خود بخود سلجھ جائیں گے۔

7.9- تجاویز دہلی

ملکی اور بین الاقوامی سطح پر جداگانہ انتخابات کے خلاف ہندوؤں کی مہم اتنی زبردست تھی کہ اس کی کامیابی کے امکانات بہت روشن نظر آتے تھے۔ ہندو اخبارات بھی روز بروز اس بات کی یقین دہانی کراتے رہتے تھے کہ جلد ہی مخلوط انتخاب ملک پر مسلط کر دیا جائے گا۔اس کا تدارک کرنے کے لیے بعض مسلمان لیڈروں نے 20مارچ 1927ء کو میڈن ہوٹل دہلی میں ایک اجلاس منعقد کر کے چند تجاویز مرتب کیں جن کو تجاویز دہلی کہا جاتا ہے۔ان کا ماحصل یہ تھا کہ مسلمان مخلوط انتخاب کو منسوخ کرنے کے لیے تیار ہوں گے۔ بشرطیکہ پنجاب اور بنگال میں ان کی اکثریت کا تحفظ کیا جائے۔سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر دیا جائے۔شمال مغربی سرحدی صوبے میں 1919ء کا نظام حکومت جاری ہو اور مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک تہائی نیابت ملے، گفت وشنید کے بعد ان تجاویز کی بنیاد پر کسی قسم کا ہندو مسلم سمجھوتہ ہوسکتا تھا۔خود کانگریس نے ان تجاویز کو سمجھوتے (Compromise) کا نام دیتے ہوئے دو فعہ قبول کر لیا۔لیکن بعد میں اپنے وعدے سے منحرف ہوگئی۔

7.10- سائمن کمیشن کا تقرر اور مسلم لیگ میں پھوٹ

نومبر 1927ء میں برطانیہ نے اپنے ایک گزشتہ فیصلے کے مطابق ہندوستان کے دستوری معاملات کی چھان بین کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جو اپنے صدر کے نام کی رعائت سے سائمن کمیشن کہلایا۔اس کا تقرر کرنے والوں نے کمیشن کے ذمے یہ فرض لگایا تھا کہ 1919ء کے آئین کے عملی پہلوؤں کا جائزہ لے اور ہندوستان کے لیے حکومت خود اختیاری کی اگلی قسط کے لیے سفارشات مرتب کرے۔ برطانوی حکومت نے اس کمیشن کا انتخاب کرتے وقت یہ فاش غلطی کی کہ کسی ہندو یا مسلمان کو اس میں

شامل نہ کیا۔ اس پر ایک ہنگامہ ہو گیا اور کمیشن کا بائیکاٹ کرنے کا نعرہ لگایا گیا۔ بہت سی سیاسی پارٹیاں اس موقف سے متفق تھیں۔ خود مسلم لیگ کے اندر دو دھڑے بن گئے۔ ایک تو اس بات کا حامی تھا کہ کمیشن سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے، جناح اس کے سربراہ تھے دوسرا گروہ میاں محمد شفیع کی زیر قیادت، اصرار کرتا تھا کہ کمیشن کے ساتھ تعاون کر کے مسلمانوں کا کیس مناسب طور پر کمیشن کے سامنے پیش کیا جائے۔ یہ بات اختلافات طے نہ ہو سکے۔ 1927ء کے آخر میں لیگ کے اول الذکر گروہ کا اجلاس کلکتہ میں اور دوسرے فریق کا اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔

7.11- آل پارٹیز کانفرنس اور نہرو رپورٹ

یہ کشمکش جاری تھی کہ برطانیہ کے وزیر ہند لارڈ برکن نے دارالامرا میں تند اور تلخ لہجے میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات ازلی اور ابدی ہیں۔ ان دونوں کے درمیان کسی مرحلے پر کوئی اتفاق نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ لوگ ہمارے متعلق بدگمانی رکھتے ہیں تو وہ خود اپنا متفقہ دستور بنا کر ہمارے سامنے لائیں۔ ہم اس کو بلا توقف قبول کر لیں گے۔ کانگریس کے لیڈر اس پر بہت تلملائے اور 1927ء کے آخر میں انہوں نے مدراس کانگریس کے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا کہ بدلگام وزیر ہند کے چیلنج کا جواب دیا جائے اور اسے ایک متفقہ دستور کا تحفہ پیش کیا جائے۔ اس مسئلے سے نپٹنے کے لیے ایک طریق کار بھی طے کیا گیا جس میں گاندھی اور موتی لال نہرو نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ ان کا تمام تر مقصد یہ تھا کہ تجاویز دہلی کو مسترد کر کے نئے آئین کا خاکہ تیار کیا جائے۔ اس نکتے پر ان کو ہندو مہاسبھا کی سو فیصد حمایت کا یقین تھا۔

ایک آل پارٹیز کانفرنس کے لبادے میں ہندو جماعتوں کا محاذ بنا جس نے دستوری تجاویز مرتب کرنے کے لیے موتی لال نہرو کے سربراہی میں ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کے دو رکن سر امام علی اور شعیب قریشی تھے، معلوم نہیں وہ کس کی نمائندگی کرتے تھے۔ یہ دونوں حضرات برائے نام ممبر تھے۔ انہوں نے کمیٹی کے کام میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ لیکن جب رپورٹ تیار ہو گئی اس پر چپکے سے اپنے اپنے دستخط ثبت کر دیئے۔

7.12- نہرو رپورٹ اور مسلمان

نہرو کمیٹی کی سفارشات کی شکل وصورت کچھ یوں تھی:

☆ جداگانہ انتخاب: نامنظور

☆ پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت: نامنظور

☆ وفاقی حکومت: نامنظور

☆ مرکز میں مسلمانوں کی ایک تہائی نمائندگی: نامنظور

☆ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی: ہاں، ناں اگر مگر۔

ان سفارشات کا ردعمل مسلمانوں میں بہت شدید ہوا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ راج انگریز کا ہوگا۔ حکومت کی باگ ڈور ہندو مہاسبھا کے ہاتھ میں ہوگی۔ دوسری طرف ہندو لیڈروں نے دھڑوں کی پوری قوت سے نہرو رپورٹ کے حق میں پروپیگنڈہ شروع کر دیا، گاندھی اور جواہر لال نہرو اس میں پیش پیش تھے۔ اس پروپیگنڈہ کی توپوں کا رخ بیرونی دنیا کی طرف تھا۔ نہایت بے تکلفی بلکہ ڈھٹائی کے ساتھ کہا جاتا تھا کہ نہرو رپورٹ کا تجویز کیا ہوا دستور ہندوستان کی ساری قوموں کا متفقہ مطالبہ ہے یہ بات حقیقت سے دور تھی۔

7.13- کلکتہ کنونشن

مولانا محمد علی اور محمد علی جناح دونوں نہرو رپورٹ کی اشاعت کے وقت ملک سے باہر تھے۔ واپس آئے تو انہوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ ہندو مسلم مفاہمت کا جو فارمولا دہلی تجاویز کی صورت میں نہایت جانفشانی سے مرتب کیا گیا تھا ملیا میٹ ہو چکا ہے، لیکن دونوں میں سے کسی نے بھی جلد بازی سے کام نہ لیا۔ 8 دسمبر 1928ء کے آخری دنوں میں آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس کلکتے میں نہرو رپورٹ پر آخری فیصلہ کرنے کے لیے بلایا گیا۔ اس کنونشن میں صرف دو مسلم پارٹیوں نے اپنے نمائندے بھیجے۔ مولانا محمد علی اور محمد علی جناح بالترتیب خلافت اور مسلم لیگ کے وفدوں کی قیادت کرتے تھے۔ دونوں نے باری باری نہرو رپورٹ میں چند معتدل ترمیمیں پیش کیں تاکہ ان کو تجاویز دہلی سے ہم آہنگ کر دیا جائے۔

اس موقع پر جناح کی تقریر ان کی زندگی کی بہترین تقریروں میں شمار ہوتی ہے۔ انہوں نے نہایت جچے تلے اور جذبات میں ڈوبے ہوئے الفاظ میں ملک کے مستقبل کا واسطہ دیتے ہوئے، اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت پر زور دیا۔ لیکن کنونشن کا سارا ماحول معاندانہ تھا۔ ہندو مہاسبھا اس پر چھائی ہوئی تھی۔ سکھ اس کی حمایت پر تھے۔ گاندھی گم سم ہو کر بیٹھے ہوئے تھے۔ محمد علی جناح پر آوازے کسے گئے۔ جناح ایک بگڑا ہو بچہ ہے،''.....آخر یہ کس کی نمائندگی کرتا ہے''۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ کنونشن نے نہرو رپورٹ کو من وعن قبول کر لیا، جن مسلمانوں نے قوم کی منشا کے خلاف کنونشن کا دروازہ کھٹکھٹا کر اقلیتوں کے لیے انصاف کی بھیک مانگی تھی، ان کی سبکی ہوئی۔ جناح سمجھتے تھے کہ ملک کی آزادی حاصل کرنے کے لیے انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کا جو مشن سامنے رکھا تھا وہ دور سے دور تر چلا گیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک دوست کو بتایا کہ:

''اب سے ہمارے اور ان کے (یعنی ہندوؤں کے) راستے جدا جدا ہیں''۔

7.14- چودہ نکات

کنونشن کی ناکامی کے فوراً بعد دہلی میں آغا خان کی سربراہی میں مسلمانوں کا ایک نمائندہ اجتماع منعقد ہوا اور اس نے تازہ ترین معاملات پر غور وفکر کرنے کے بعد مسلمانوں کے متفقہ مطالبات کی ایک فہرست مرتب کی جس میں وفاقی حکومت کا قیام اور جداگانہ انتخاب بہت اہم تھے۔ مارچ 1929ء میں قائداعظم نے اپنے چودہ نکات کا اعلان کیا جن میں کئی مطالبات تو وہی تھے جو مسلم کانفرنس میں دہرائے تھے لیکن اقلیتوں اور ان کے تہذیبی اور ثقافتی حقوق پر بہت زیادہ زور تھا۔ کئی سال تک انہی مطالبات کو مسلمانوں کے قومی مطالبات سمجھا جاتا رہا۔

7.15- سول نافرمانی

کنونشن کے فوراً بعد ہی کلکتہ کے شہر میں ہی کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا۔ اس میں حکومت کو الٹی میٹم دیا گیا کہ ایک سال کے اندر نہرو رپورٹ کو قبول کر لیا جائے یعنی برطانیہ کے زیر سایہ ملک کی حکومت اکثریت کے سپرد کر دی جائے ورنہ حکومت سول نافرمانی کی مہم کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہے، الٹی میٹم کی معیاد 1929ء کے آخر میں ختم ہوگئی۔ اس موقع پر کانگریس کے اجلاس نے جو لاہور میں دریائے راوی کے کنارے ہو رہا تھا، آزادی کامل کی قرارداد منظور کی اور مارچ 1930ء میں گاندھی کی سرکردگی میں، ملک کے قوانین کو توڑ کر سول نافرمانی کی ابتدا کر دی۔ جلد ہی یہ تحریک تشدد اور خون ریزی میں شریک ہوگئی اور اس نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، چونکہ کانگریس کئی مرتبہ مسلمانوں کے مطالبات سے بے زاری کا اظہار کر چکی تھی، مسلمان اس تحریک سے 'بحیثیت مجموعی' علیحدہ رہے۔

7.16- سائمن رپورٹ اور پہلی گول میز کانفرنس

اس ماحول میں سائمن کمیشن کی رپورٹ جون کے مہینے میں شائع ہوئی۔ مختلف وجوہات سے اس کی سفارشات، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لیے ناقابل قبول تھیں۔ بعض لوگوں کو سائمن کمیشن رپورٹ کے نام سے وحشت تھی، برطانیہ کے وزیراعظم نے اعلان کیا کہ تمام دستوری معاملات پر از سر نو غور کرنے کے لیے جلد ہی مختلف قوموں اور برطانوی حکومت کے نمائندوں کی ایک گول میز کانفرنس لندن میں بلائی جائے گی۔ کانگریس سول نافرمانی کی تحریک چلا رہی تھی، اس نے کانفرنس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ کانفرنس کا اجلاس نومبر کے مہینے میں شروع ہوا اور جنوری 1931ء کے وسط تک جاری رہا۔ اس میں شریک ہونے والوں کی تعداد نوے کے قریب تھی۔ آغا خان کو پہلے مسلمانوں نے اپنے ڈیلی گیشن کا سربراہ چنا۔ بعد میں سارے ہندوستان ڈیلی گیشن نے ان کی قیادت قبول کر لی۔ شاہ برطانیہ نے کانفرنس کا افتتاح کیا، کھلے اجلاس میں مندوبین نے

بہت گرما گرم تقریریں کیں، مولانا محمد علی نے کہا کہ مجھے آزادی دو۔ میں غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا۔ محمد علی جناح نے کہا، ہم سب اس موقع پر اس لیے اکٹھے ہوئے ہیں کہ ایک آزاد مملکت کے آغاز کا منظر دیکھیں۔ اس موقع پر ایک غیر متوقع بات یہ ہوئی کہ ریاستوں کے حکمرانوں اور ان کے نمائندوں نے بیک زبان برطانوی ہند کے ساتھ فیڈریشن میں شامل ہونے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ یہ بات ہندوؤں کے لیے بہت خوش آئند تھی کیوں کہ اس طرح انہیں مرکزی حکومت میں بے پناہ غلبہ حاصل ہو جاتا تھا۔ کانفرنس کے پیش نظر مسائل کو حل کرنے کے لیے بہت سی سب کمیٹیاں بنائی گئیں۔ ان کے اجلاس بند کمروں میں ہوتے تھے ان کمیٹیوں کے ارکان کے بعض لوگوں کی سرگرمیاں نا قابل فہم تھیں اور ان پر کسی گہری سازش کا گمان ہوتا تھا۔ ماحول پر شکوک و شبہات کی فضا غالب تھی۔ سب سے اہم کمیٹی اقلیتوں کے حقوق کی سب کمیٹی تھی۔ اگر یہ کسی نتیجے پر پہنچ جاتی تو دستور سازی کا کام آسان ہو جاتا لیکن صوبائی اور مرکزی مجلس قانون ساز میں مختلف قوموں کی نمائندگی کا مسئلہ الجھ گیا اور بہت سے مذاکرات کے بعد بھی حل نہ ہو سکا۔ برطانوی حکومت اور ہندو مندوبین کا گٹھ جوڑ روز بروز نمایاں ہوتا جاتا تھا۔ آخر وسط جنوری میں ایک ایسا مرحلہ بھی آ گیا کہ نمائندگی کے ایک فارمولے پر مفاہمت یقینی ہوگئی۔ جب کمیٹی کے ارکان اپنے اپنے قلم اٹھا کر سمجھوتے پر دستخط کرنے لگے تو ایک سکھ ممبر نے پنجاب کی مجلس قانون ساز میں اپنی قوم کے لیے ایک زائد نشست کا مطالبہ داغ دیا۔ اس نکتے پر بہت سی بحث بے نتیجہ رہی اور محض ایک شخص کے رویے سے بنی بنائی بات بگڑ گئی اور سمجھوتے کا امکان ختم ہو گیا۔ اس سے پہلے 4 جنوری 1931ء کی صبح کو مولانا محمد علی انتقال کر گئے۔ قائداعظم نے اس کانفرنس میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا، کانفرنس کا صدر لارڈ سانکے ان کی فراست کا بہت معترف تھا اور تمام اہم امور پر ان کا مشورہ طلب کرتا تھا۔ قائداعظم اس کانفرنس کے واحد رکن تھے جنہوں نے انڈین آرمی کو فوری طور پر قومیانے کے حق میں آواز بلند کی تھی۔ انہوں نے اس بات پر بھی بہت زور دیا کہ گوری نسل کے مجرموں سے برطانوی ہند کی عدالتوں میں جو ترجیحی سلوک کیا جاتا ہے اسے ترک کر دیا جائے۔ جنوری کے وسط میں کانفرنس ختم ہوگئی۔ اس سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ نشستند و گفتند و برخاستند والا مضمون رہا۔ کانفرنس کا آئندہ اجلاس ستمبر 1931ء میں قرار پایا۔

7.17- دوسری گول میز کانفرنس

اسی دوران گاندھی نے وائسرائے ارون کے ساتھ ایک سمجھوتہ کر کے سول نافرمانی کی تحریک کو ختم کر دیا تھا۔ معاہدے کی شرائط تو کوئی اہم نہ تھیں۔ لیکن ان کے مضمرات مسلمانوں کے لیے بہت خطرناک تھے۔ اس لیے کہ برطانوی حکومت کے سب سے بڑے نمائندے نے گاندھی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تھے اور دن رات اس کی خوشامد کرتا رہتا تھا۔ کانگریس کا بھرم بڑھا، گاندھی کے وقار میں اضافہ ہوا، اسے وہ حیثیت مل گئی جو اس سے پہلے کسی ہندوستانی کو برطانوی راج میں حاصل نہ ہوئی تھی۔ جب دوسری گول میز کانفرنس کے انعقاد کا وقت آیا تو حکومت نے کانگریس کو شرکت کی دعوت دی۔ بہت سی رد و کد اور

موشگافیاں کرنے اور یقین دہانیاں حاصل کرنے کے بعد گاندھی کانگریس کے واحد نمائندے کی حیثیت سے انگلستان پہنچے۔ وہاں پر وارد ہوتے ہی انہوں نے برطانوی حکومت کے ساتھ سمجھوتے کے امکانات پر نہایت گرمجوشی سے تبصرہ کیا لیکن یہ موڑ عارضی ثابت ہوا۔ کانفرنس میں داخل ہونے کے بعد گاندھی نے مطالبہ کیا کہ ان کے چیلے مسلمان نیشنلسٹ ڈاکٹر انصاری کو مندوب کی حیثیت سے طلب کیا جائے۔ کیونکہ ان کی عدم موجودگی میں وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکیں گے۔ یہ پوزیشن مسلمانوں کے لیے نا قابل فہم تھی۔ ڈاکٹر انصاری کو مسلمانوں میں کوئی نمائندہ حیثیت حاصل نہ تھی۔ یہ مطالبہ نہ مانا گیا تو گاندھی نے کانفرنس کی کارروائی سے ذہنی طور پر علیحدگی اختیار کر لی۔ یہ سبھاس چندر بوس کا بیان ہے کہ انہوں نے اس دورے کو ''پروپیگنڈا ٹور'' بنا لیا۔ گاندھی پر مالویہ کی شخصیت چھائی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ مسلمانوں کی ہر بات کی مخالفت کرتے تھے۔ ان کی موجودگی سے فرقہ وارانہ فیصلے کے راستے میں اور بھی دشواریاں حائل ہوگئیں۔ ایک موقع پر بعض نا طرف دار مبصروں کی طعن و تشنیع سے متاثر ہو کر گاندھی نے مسلمانوں کے مطالبات پر ہمدردی سے غور کرنے کا وعدہ کیا لیکن شرط یہ لگائی کہ مسلمان ڈیلی گیٹ اچھوتوں کے کسی مطالبے کی حمایت نہ کریں۔ اس سے بھی مسلمانوں کو بہت مایوسی ہوئی۔ بالآخر گاندھی کی سربراہی میں ایک کمیٹی اس لیے قائم کی گئی جو ہندو مسلم سمجھوتے کی امکانات کا جائزہ لے۔ کئی دن تک گفتگو ہوئی، لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ گاندھی نے اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا، لیکن اپنے بیان میں برطانوی حکومت، مسلمانوں، اور حکومت کے مقرر کئے ہوئے مندوبین کو مورد الزام ٹھہرایا۔ کانفرنس تو جلد ہی ختم ہوگئی لیکن فرقہ وارانہ فیصلہ صادر کرنے کا فرض برطانوی حکومت پر جا پڑا۔ اگست 1932ء میں انگلستان کے وزیر اعظم نے اپنا ایوارڈ دے دیا۔ اس ایوارڈ میں

- ☆ جداگانہ انتخاب کو تو قائم رکھا گیا۔
- ☆ لیکن بنگال میں مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا اور پنجاب میں اسے مشکوک بنا دیا گیا۔
- ☆ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر دیا گیا۔
- ☆ صوبہ سرحد میں چند مہینے پہلے ہی آئینی اصلاحات جاری کر دی گئی تھیں۔

مشغلہ: 1920ء کے بعد 1930ء تک کے اہم واقعات تاریخی ترتیب سے لکھئے

7.18- خود آزمائی نمبر 6

سوال نمبر 13 شدھی اور سنگھٹن سے کیا مراد ہے؟ مسلمانوں پر ان کے اثرات پر بحث کیجئے۔

(جواب کا موازنہ 2.3 سے کیجئے)

سوال نمبر 14 ان حالات کا تجزیہ کیجئے جن کی بنا پر (قائداعظم) جناح کو کہنا پڑا کہ: ''اب ہمارے راستے جدا ہیں''

(جواب کو 7.11 تا 7.13 کی روشنی میں سے کیجئے)

سوال نمبر 15 گول میز کانفرنسیں کیوں ناکام ہوئیں؟ مختصراً تبصرہ کیجئے۔

(جواب کا موازنہ 7.16 اور 7.17 سے کیجئے)

سوال نمبر 16 سائمن کمیشن کی آمد پر مسلم لیگ کیوں بٹ گئی؟

(جواب کے لیے دیکھئے 7.10)

8- تشریحات

1-	آثارالصنادید	سرسید احمد خان کی پہلی تاریخی تحریر جس میں انہوں نے دہلی اور اس کے نواح کے تاریخی مقامات اور عمارتوں کی تفصیل بیان کی۔
2-	احمد آباد، امرتسر، بمبئی، لکھنؤ، شملہ	بھارت کے شہر جہاں اس دور میں اہم سیاسی واقعات رونما ہوئے۔
3-	آسٹریا	مرکزی یورپ کا ایک ملک۔
4-	اناطولیہ	ترکی کا وسطی علاقہ۔
5-	آئین اکبری	شہنشاہ اکبر کے عہد کی تاریخ جو اکبر کے وزیر ابوالفضل نے لکھی۔
6-	بلقان	جنوب مشرقی یورپ کا ایک جزیزہ نما جس میں یونان۔ البانیہ۔ یوگوسلاویہ کے مالک اور ترکی اور بلغاریہ کے کچھ حصے ہیں۔
7-	برلن	دوسری جنگ عظیم سے پہلے متحدہ جرمن کا دارالحکومت۔
8-	بغداد	اسلامی ملک عراق کا دارالحکومت۔
9-	تہذیب الاخلاق	مسلمانوں کی اقتصادی، معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کے لیے سرسید کا رسالہ۔ یہ رسالہ 1870ء میں جاری ہوا۔
10-	سرسید احمد خان 1817 - 1898ء	انیسویں صدی میں مسلمانوں کے سیاسی و معاشرتی رہنما اور ماہر تعلیم جنہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی بنیادی ڈالی۔
11-	سلطنت عثمانیہ	جنگ عظیم اول (18 - 1914ء) سے پہلے ترکوں کی حکومت۔
12-	سلاؤنسل	ایک مخصوص نسل کے لوگ جو مشرقی یورپ اور یورپی روس میں آباد ہیں۔
13-	قسطنطنیہ	ترکی کے یورپی حصے میں تاریخی بندرگاہی شہر اور خلافت اسلامیہ کا دارالحکومت۔
14-	مہاسبھا	(ہندوؤں کی) ''بڑی پارٹی'' جس کا مقصد ہندو تمدن کا احیاء تھا۔ یہ 1920ء میں قائم ہوئی۔
15-	لندن	برطانیہ کا دارالحکومت۔
16-	مصر	شمال مشرقی افریقہ کا ایک اسلامی ملک۔

یونٹ.....4

دوقومی نظریہ اور تحریک پاکستان-II
(1930 - 1947ء)

تحریر:
ڈاکٹر عبدالحمید

فہرست مضامین

	یونٹ کا تعارف	133
	یونٹ کے مقاصد	133
1-	اقبال اور قائداعظم۔ ملی سیاست میں نمایاں کردار	134
1.1-	1935ء کے دستوری کی تیاری کے مرحلے	134
1.2-	خطبہ الہ آباد	134
1.3-	دستور کی مہم اور رجعت پسندانہ دفعات	134
1.4-	طرز حکومت: وحدانی یا وفاقی	135
1.5-	1935ء کا ایکٹ: اقبال اور قائداعظم کی نظر میں	136
1.6-	انتخاب میں کانگریس کی کامیابی	136
1.7-	وزارت سازی کے لیے کانگریس کا شرائط	137
1.8-	حکومت اور کانگریس کا معاہدہ	137
1.9-	کانگریس راج	138
1.10-	مسلمانوں کا ردعمل	138
1.11-	گاندھی کی آمریت	138
1.12-	اقبال اور قائداعظم	139
1.13-	لیگ کا لکھنؤ اجلاس	139
1.14-	جنگ کا آغاز.....لیگ اور کانگریس کا ردعمل	140
1.15-	کانگریسی حکومت کا استعفیٰ اور یوم نجات	141
1.16-	خود آزمائی نمبر 1	141
2-	قرارداد پاکستان: پس منظر اور صوبوں پر اثرات	142
2.1-	تحریک پاکستان کا پس منظر	142

-2.2	تقسیم ہند کے تصور کی تاریخ	142
-2.3	قرارداد پاکستان	147
-2.4	ہندوؤں کا ردعمل	147
-2.5	مسلمان صوبوں کی سیاست	148
-2.6	خودآزمائی نمبر 2	150
-3	قرارداد سے قیام تک	151
-3.1	لیگ عوامی جماعت کی حیثیت سے	151
-3.2	جنگ کی صورت حال	151
-3.3	کرپس مشن تجاویز	153
-3.4	اقتدار پر قبضہ کرنے کا کانگریس کا منصوبہ	155
-3.5	الزام اور جوابی الزام	156
-3.6	قائداعظم سے گاندھی کی ملاقاتیں	156
-3.7	ویول تجاویز	157
-3.8	شملہ کانفرنس	157
-3.9	1945-46ء کے انتخابات	158
-3.10	کابینہ مشن	158
-3.11	عبوری حکومت اور اس کی ناکامی	160
-3.12	کانگریس لیگ اختلافات اور برطانوی حکومت کا فیصلہ	160
-3.13	خودآزمائی نمبر 3	161
-4	انتقال اقتدار	162
-4.1	تمہید	162
-4.2	لیبر حکومت اور وائسرائے ویول	162

4.3-	20فروری1947ءکا اعلان	163
4.4-	ماؤنٹ بیٹن، اس کے مشیر اور اختیارات	163
4.5-	ماؤنٹ بیٹن کا طریقہ کار	164
4.6-	3جون کا اعلان	166
4.7-	قیام پاکستان کے راستے میں مشکلات	166
4.8-	ماؤنٹ بیٹن کے عزائم	167
4.9-	قائداعظم کا موقف	168
4.10-	پاکستان کی حد بندی میں بددیانتی	170
4.11-	خودآزمائی نمبر 4	171
5-	تشریحات	172

یونٹ کا تعارف

اس یونٹ میں آپ تحریک پاکستان کے آخری دور کا حال پڑھیں گے جو 1930ء سے 1947ء تک کا دور ہے۔ اس دوران حکومت برطانیہ نے بھی کوشش کی۔ مسلمان اور ہندو رہنماؤں نے بھی کوشش کی کہ برصغیر کے آئینی مسئلے کا کوئی حل تلاش کریں۔ ان تمام کوششوں کی تفصیل آپ اس یونٹ میں پڑھیں گے۔ یونٹ میں ان مسائل پر بحث کی گئی ہے جو مسئلے کے حل میں رکاوٹ تھے اور تحریک کی شخصیتوں کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ خاص طور پر آپ کو معلوم ہوگا کہ تحریک پاکستان اور حصول پاکستان میں علامہ اقبال اور قائداعظم نے کیا کردار ادا کیا۔

(بعض جگہ عنوانوں میں تکرار ہے اگرچہ واقعات کے تسلسل کے مطابق انہیں ترتیب دیا گیا ہے)

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد طلباء اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1- ان اقدامات کی وضاحت کر سکیں جو برصغیر کے آئینی مسئلے کو حل کرنے کے لیے کئے گئے۔

2- مسلمانوں اور ہندوؤں کے ان اختلافات کی وضاحت کر سکیں جو گول میز کانفرنسوں کی ناکامی کا باعث ہوئے۔

3- تحریک پاکستان میں قائداعظم کے کردار پر بحث کر سکیں۔

1- اقبال اور قائداعظم۔ملی سیاست میں نمایاں کردار

1.1- 1935ء کے دستور کی تیاری کے مرحلے

1935ء کا دستوری قانون تیار ہونے میں پورے آٹھ سال صرف ہوئے۔ 1927ء میں سائمن کمیشن کا تقرر ہوا جس کی رپورٹ تین سال بعد شائع ہوئی اور اشاعت کے ساتھ ہی نا قابل قبول قرار دے دی گئی۔ 1930ء، 1931ء، اور 1932ء میں گول میز کانفرنسیں بلائی گئیں۔ 1932ء میں برطانوی وزیراعظم نے اپنا فرقہ وارانہ (کمیونل) فیصلہ صادر کیا۔ پھر برطانوی حکومت نے اپنی تجاویز وائٹ پیپر کی صورت میں پارلیمینٹ کے سامنے پیش کیں۔ ان تجاویز کا جائزہ لینے کے لیے دونوں ایوانوں کی ایک مشترکہ کمیٹی بلائی گئی اس کی سفارشات پر کئی مہینے پارلیمینٹ میں بحث وتمحیص ہوئی۔ ان ہی مباحثوں کے درمیان 1935ء کے قانون کو آخری شکل ملی۔ اس قانون کے متعلق تمام بنیادی معلومات پارلیمینٹری کمیٹی کی ضخیم رپورٹ میں ملتی ہے۔

1.2- خطبہ الہ آباد

علامہ اقبال پہلی گول میز کانفرنس میں شریک نہیں تھے لیکن اسی دوران انہوں نے 1930ء کے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اپنا وہ معرکتہ الآرا خطبہ پڑھا جو خطبہ الہ آباد کے نام سے مشہور ہوا جو ہماری قومی تاریخ کی ایک اہم دستاویز ہے۔ اس کے کچھ حصے تاریخی ہیں اور کچھ فلسفیانہ اور بعض عصری مسائل سے متعلق، اس کے علاوہ علامہ نے پورے وثوق کے ساتھ اس بات کی پیش گوئی کی تھی کہ تاریخی عمل کے سیاق و سباق میں، برصغیر کے شمال مغرب میں ایک اسلامی مملکت کا قیام ناگزیر ہے۔ اس مملکت کا بنیادی فرض ہوگا کہ اسلامی تہذیب اور ثقافت کی حفاظت کرے۔ تاریخ کے مطالعے سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دین اسلام نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک قوم بنانے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے اور اگر ہندوستان میں کوئی قوم صحیح معنوں میں ''نیشن'' کہلانے کی مستحق ہے تو وہ مسلمان ہی ہیں۔

ایک طرف تو انہوں نے ہندوستان کے متعلق برطانوی اہل فکر کی سیاسی خامیوں کی نشاندہی کی اور دوسری طرف انہوں نے قوم کو بتایا کہ ہمارے اندر اسلام کی روح کو سمجھنے والے اور قوم کے مستقبل پر ایمان رکھنے والے رہنماؤں کا فقدان ہے۔ لیڈر کہلانے والے لوگ، ذاتی مفاد کی خاطر، قوم کے مفاد کو بیچنے میں دریغ نہیں کرتے۔ اس خطبے کا ایک ایک لفظ آج بھی پڑھے جانے کے قابل ہے۔

1.3- دستور کی مہم اور رجعت پسندانہ دفعات

1935ء کے ایکٹ کو پارلیمینٹری ڈرافٹنگ کا شاہکار کہا جاتا ہے۔ لیکن اہم مقامات پر وہ ابہام کا مجموعہ ہے، گورنر اور

گورنر جنرل کے غیر محدود اختیارات اور اقلیتوں سے متعلق دفعات کی زبان بے حد لچک دار ہے۔ تشریح کرنے والا آزاد ہے کہ ان کے اندر جو معنی چاہے ڈال دے۔ اگرچہ اس دستور کے مضمون نے واشگاف طور پر اس بات کا اعتراف کر لیا تھا کہ مستقبل میں ہندوستان کو متحد رکھنے کے امکانات بہت محدود ہیں۔ تاہم انہوں نے آئین میں وہ سب کچھ شامل کر دیا۔ جس سے برطانوی اقتدار کو کوئی گزند نہ پہنچے اور ہندوستان کے غیر تاریخی اور غیر منطقی وحدت قائم رہے۔ پہلے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے فیڈریشن کا ڈھونگ رچایا گیا اور اس میں والیان ریاست کی شمولیت کے لیے گنجائش نکالی گئی تھی۔ والیان ریاست کی پرتعش زندگی گزارنے کی عادی عماعت برطانوی اقتدار کا اہم ستون تھی، مرکزی حکومت میں ان کے داخلے سے غیر جمہوری عناصر کو تقویت پہنچانے اور برطانوی مفاد کی حفاظت مقصود تھی۔ چونکہ والیان ریاست میں مسلمان روسا کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی، س لیے یہ امر بھی یقینی تھا کہ مرکزی حکومت میں ہندوؤں کا غلبہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ بڑھ جائے گا۔

علامہ اقبال نے اس نکتے کو پہلے تو مسلم کانفرنس کے 1932ء کے صدارتی خطاب میں واضح کیا تھا اور بعد میں قائداعظم کو ایک خط میں لکھا تھا کہ نیا آئین انگریزوں نے محض ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وضع کیا ہے۔ اس کے اندر مسلمانوں کے کسی مسئلے کا حل موجود نہیں۔

1935ء کے ایکٹ میں، اقلیتوں کے تحفظ کا بندوبست بھی کیا گیا تھا۔ لیکن ایکٹ کے ان الفاظ سے کہ ''صوبائی گورنر اور گورنر جنرل اقلیتوں کے جائز حقوق اور مفادات کی نگہداشت کریں گے'' متضاد معنی اخذ کئے جا سکتے تھے۔ کیونکہ جائز حقوق اور مفادات کے الفاظ ان حقوق اور مفادات کا تعین نہیں کرتے۔ پورے قانون اور اس کے ماتحت نافذ ہونے والی ذیلی ہدایات میں بھی ان کے تمدن سے گریز کیا گیا تھا۔

علامہ اقبال کا خیال تھا کہ اقلیتوں کا تحفظ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس کے بہت سے پہلو ہیں جن کی تشریح اور توضیح اقلیتوں کا کام ہے۔ اتنے اہم مسئلے کو ایک فرد واحد یعنی گورنر یا گورنر جنرل کی صوابدید پر چھوڑ دینے سے، اصلاح احوال ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو جائے گی۔ بعد میں ان کے خدشات بالکل درست ثابت ہوئے۔

1.4- طرز حکومت وحدانی یا وفاقی

اس آئین کے بننے سے دس سال پہلے بہت سی آئینی بحثیں چھڑیں ان میں ہندوؤں کا موقف یہ تھا کہ برصغیر میں ایک بااختیار مرکزی حکومت قائم ہو اور صوبے صرف اس حکومت کی فرمانبرداری پر قناعت کریں۔ یہ موقف ناقابل تفہیم نہیں تھا۔ ہندو اپنی اکثریت اور اقتصادی برتری کے بل بوتے پر بھاری مسلم اکثریت کے علاقوں پر ایک مضبوط مرکزی حکومت کی وساطت سے اپنا تسلط قائم رکھنا چاہتے تھے۔ گزشتہ کئی سالوں سے مسلمان وحدانی نہیں، بلکہ وفاقی طرز حکومت کا مطالبہ

دہراتے آئے تھے۔ مطالبے کی بنیاد یہ تھی کہ وفاق کے اندر صوبوں کو حقیقی اختیارات حاصل ہوں گے اور ان کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے مسلمان اپنی اکثریت کے صوبوں میں اپنی معاشرتی اور روحانی قدروں کی حفاظت پر قادر ہوں گے۔ 1935ء کے ایکٹ میں فیڈریشن کے قیام سے مسلمانوں کا مطالبہ بظاہر پورا کر دیا گیا لیکن اس فیڈریشن کے اندر واحدنی حکومت کی روح موجود تھی۔ فیڈریشن کے مختلف اداروں کی ساخت، اختیارات اور طریق کار کی فہرست اس ڈھنگ پر تیار کی گئی تھی کہ حقیقی اختیارات مرکز کے پاس ہی رہیں اور اور گورنر جنرل کی آمریت بھی جوں کی توں ہی قائم رہے۔ البتہ اس کو بروئے کار لانے کے طور طریقے بدل دیئے جائیں۔ قائداعظم پہلی دو گول میز کانفرنسوں میں شریک تھے۔ وہ متواتر گورنر جنرل کے وسیع اختیارات کی مخالفت کرتے رہے اور بار بار کہتے رہے کہ یہ فیڈریشن اصلی فیڈریشن نہیں ہے۔ اس کے اندر صوبے بے بس اور محض مرکزی حکومت کے رحم و کرم پر ہوں گے۔

1.5- 1935ء کا ایکٹ: اقبال اور قائداعظم کی نظر میں

اقبال فلسفی تھے۔ اسلام کی تاریخ اور ثقافت کے گہرے مطالعہ سے وہ قومی یک جہتی کے مسائل پر دور رس نظر رکھتے تھے۔ قائداعظم بیک وقت ایک عظیم قانون دان اور پارلیمینٹرین تھے۔ وہ عصر جدید کی عملی سیاست کے پر پیچ راستوں سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ دونوں نے 1935ء کے ایکٹ کا مختلف زاویوں سے مطالعہ کیا تھا لیکن دونوں یکساں نتیجوں پر پہنچے۔

☆ اول فیڈریشن کا عجوبہ مسلمانوں کے لیے پرفریب ہے جس میں مرکزی حکومت کے اختیارات کی فراوانی سے صوبائی خود مختاری ساقط ہو جاتی ہے۔

☆ دوم اس عجیب الخلقت دستور سے نہ مسلمانوں کے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور نہ دوسری اقلیتوں کے۔

اس ایکٹ کے پاس ہونے سے پہلے کی سیاست میں علامہ اقبال اور قائداعظم کے نقطہ ہائے نظر میں اختلاف رہ چکا تھا لیکن اس کے باوجود اقبال، قائداعظم کی دیانت فکر اور بلند کردار کے قائل تھے۔ گول میز کانفرنس کے دوران اقبال اور قائداعظم میں ملاقاتیں ہوئیں۔ قائداعظم نے اقبال کے اعزاز میں منعقد ہونے والی ایک تقریب کی صدارت بھی کی۔ اقبال نے قائداعظم کو خطبہ الہ آباد کی تجاویز سے بامشافہ آگاہ کیا ہوگا۔ قائد نے ان پر گہرا غور و فکر بھی کیا ہوگا لیکن اس سے جو نتائج برآمد ہوئے وہ کسی قدر بعد کی بات ہے۔

1.6- انتخابات میں کانگریس کی کامیابی

1935ء کا قانون تو اگست کے مہینے میں ہی توثیق کے مرحلے سے گزر چکا تھا لیکن بہت بڑی تیاری کے بعد اس کو اپریل 1937ء میں نافذ کیا گیا۔ اس سے پہلے تین مہینوں میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے اور چھ صوبوں میں کانگریس کو

غیر متوقع طور پر غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ ان دنوں کانگریس اور لیگ کے تعلقات بہت اچھے نہ سہی مگر کشیدہ بھی نہ تھے۔ کیونکہ ہوا کا رخ پہچانتے ہوئے کانگریس نے کیبنٹ مشن ایوارڈ کے متعلق کسی قدر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔ یو پی میں تو لیگ نے مسلمان کانگریسی امیدواروں کو ایسی امداد دی تھی کہ اس کے بغیر ان کی کامیابی کا کوئی امکان نہ تھا۔ دونوں جماعتوں کے انتخابی منشوروں میں بھی کوئی تفاوت نہ تھا۔ کم از کم یو پی میں یہ توقع تھی کہ دونوں جماعتیں باہمی افہام وتفہیم سے اقتدار میں شریک ہوں گی۔ انتخابی کامیابیوں کے بعد کانگریسی رہنماؤں نے انا لموجود ولا غیری کا نعرہ لگانا شروع کیا۔ جواہر لال نہرو نے اپنے ناسنجیدہ انداز میں کہہ ڈالا کہ ملک کے اندر صرف کانگریس اور حکومت ہی دو پارٹیاں ہیں۔ باقیوں کو چاہئے کہ اپنا بستر بوریا لپیٹ کر ایک کیمپ میں چلے جائیں یا دوسرے میں۔

1.7- وزارت سازی کے لیے کانگریس کی شرائط

انتخابات کی تکمیل کے جلد بعد ہی صوبائی گورنروں نے اپنے اپنے صوبوں میں اکثریتی پارٹیوں کے لیڈروں کو وزارت سازی کی دعوت دی۔ کانگریس ہائی کمان کے ایما پر کانگریس اکثریت کیے لیڈروں نے یہ موقف اختیار کیا کہ اس دعوت کو صرف اسی صورت میں قبول کیا جائے گا کہ گورنر وزارتوں کے کام میں کوئی دخل نہ دیں گے بلکہ اپنے خصوصی اختیارات سے بھی دست بردار ہو جائیں گے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ گورنروں کے خصوصی اختیارات میں اقلیتوں کے مفاد کا تحفظ شامل تھا۔ اگر گورنر اس شرط کو تسلیم کر لیں تو صوبے کے اندر اکثریت کو من مانی کرنے کا اختیار مل جائے گا اور اقلیتوں کا پرسان حال کوئی نہ ہوگا۔ کانگریس کی شرائط کڑی اور اس کے عزائم پیچیدہ تھے۔ لیکن اس وقت اس مسئلے کی طرف چنداں توجہ نہ دی گئی۔

1.8- حکومت اور کانگریس کا معاہدہ

کانگریس کے رویے نے ایک مشکل صورت حال پیدا کر دی۔ تین ماہ تک کانگریس اور برطانوی حکومت کے درمیان خفیہ اور اخباری سطح پر مباحثے ہوتے رہے۔ بالآخر دونوں کے درمیان ایک ''شریفانہ معاہدہ'' طے پایا جو یہ تھا کہ صوبائی گورنر صرف دستوری فرائض انجام دیں گے اور وزارتوں کو اپنی مرضی کے مطابق حکومت کا کاروبار چلانے کا موقع ملے گا۔ فیصلہ ہوتے ہی کانگریس چھ صوبوں میں برسر اقتدار آ گئی۔ اپنی قطعی اکثریت کی ''بدمستی'' میں کانگریس نے کسی دوسری جماعت کو اقتدار میں شریک کرنے سے انکار کر دیا۔ بالخصوص لیگ کے نمائندوں سے کہا گیا کہ لیگ کی جماعتی حیثیت ختم کر دو۔ اس کے پارلیمنٹری بورڈ کو توڑ دو۔ کانگریس کی رکنیت قبول کرو۔ اس کے حلف نامے پر دستخط کرو۔ تو تم کو وزارت میں شریک کیا جا سکتا ہے۔ عزت نفس رکھنے والی کسی بھی جماعت کے لیے ان شرائط کو قبول کرنا مشکل تھا۔ کانگریس نے اپنے آمرانہ رویے کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے برطانیہ کی پارٹی نے گورنمنٹ کے نظام کا سہارا لیا۔ لیکن وہ استدلال بے معنی تھی۔ برطانیہ اور ہندوستان کے معاشی اور سیاسی حالات

میں بڑا بُعد ہے۔ ایسی دلیلوں سے مسلمانوں کو قائل کرنا مشکل تھا۔

جواہر لال نہرو بھی ایک بار مسلمانوں پر یوں برسے ''میں نے ایک خوردبین کی مدد سے سارے ملک کو دیکھا ہے، مجھے تو اس میں اقلیتوں کا کوئی وجود نظر نہیں آتا''۔ گاندھی اس سے بھی آگے بڑھ گئے۔ انہوں نے فرمایا'' کانگریس کو جتنا بھلا برا کہہ دو حقیقت میں یہی ملک کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔''

1.9- کانگریسی راج

برسر اقتدار آتے ہی کانگریسی حکومتوں نے مسلمانوں پر انسانیت سوز مظالم ڈھانے شروع کر دیے اور اسلامی تہذیب کے خلاف ایک بہت بڑا محاذ کھول دیا۔ سید حسن ریاض کے الفاظ میں ''ہندوؤں نے سمجھ لیا کہ ان کا راج آ گیا'' یو۔ پی، بہار اور ہندو اکثریت کے دوسرے صوبوں میں اذان، نماز، قربانی اور محرم کے جلوس پر روک ٹوک اور حملے اپنے غلبے کے مظاہرے کے لیے انہوں نے ضروری قرار دے دیئے تھے۔ پولیس نے ان ہنگاموں میں لاپرواہی اختیار کی۔ اگر وہ دباتی بھی تھی تو مسلمانوں ہی کو۔ خود کانگریسی حکومتوں نے سرکاری عمارتوں پر کانگریس کے جھنڈے لگوا دیئے، بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دیا، سرکاری سکولوں میں کانگریس کے جھنڈے کی سلامی جاری کی۔ کانگریسی حکومتوں نے بڑے اہتمام کے ساتھ مسلمانوں کو یہ محسوس کرا دیا کہ ان کی رائے اور مرضی کوئی چیز نہیں۔ ان کو ملک میں ہندوؤں کے تابع ہو کر رہنا پڑے گا۔

1.10- مسلمانوں کا ردعمل

مسلمانوں میں غم و غصے کی ایک لہر اٹھی، تمام صوبوں نے صدائے احتجاج بلند کی۔ ہندو اپنی عددی قوت اور ذرائع ابلاغ پر اجارہ داری کے بل بوتے پر جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بناتے تھے۔ صوبائی گورنروں نے کانگریسی وزیروں کو نیک چلنی کے سرٹیفکیٹ دیئے اور کئی حالتوں میں پبلک پلیٹ فارموں پر ان کی قصیدہ خوانی کے مرتکب ہوئے۔ مسلمانوں کا یہ دیرینہ خدشہ کہ اکثریت کی حکومت ان کے لیے باعزت زندگی گزارنا مشکل بنا دے گی بالکل درست ثابت ہوا۔ قائداعظم نے کہا کانگریس کی ان کارروائیوں سے میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔

1.11- گاندھی کی آمریت

گاندھی تام مرگ کانگریس کے آمر متعلق رہے۔ اس بات کی تصدیق ایک مشہور و معروف کانگریسی سیٹھ گوبند دیس نے ان الفاظ میں کی:

''گاندھی کو کانگریس میں وہی مقام حاصل ہے جو ہٹلر کو نازیوں اور مسولینی کو قسطانیوں میں ہے''

گاندھی کے سامنے کسی کا چراغ نہ جلتا تھا۔ مخالفوں کی زبان جھٹ پٹ بند کر دی جاتی تھی، خود بہت سے مشکلوں سے بچنے کے لیے اور دوسروں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے لیے گاندھی اپنے اور کانگریس کے تعلقات پر تہ در تہ تاویلوں کے غلاف چڑھاتے تھے۔ کانگریسی وزارتیں روز بروز مسلمانوں پر زندگی تنگ کر رہی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی وسیع القلبی کا ڈھنڈورا بھی پیٹتی جاتی تھی۔ مسلمانوں پر کانگریسی حکومتوں کے مظالم کی تفصیلات میں کانگریس راج نامی کتاب * سے مل جاتی ہیں۔ 1940ء میں جب بنگال کے وزیر اعلیٰ مولوی فضل الحق نے کانگریسی حکومتوں کے خلاف اپنا چارج شیٹ شائع کیا تو ہندو اخباروں نے اسے چھاپنے سے انکار کر دیا، لیکن ایک مستقل عنوان کے تحت ہر اخبار میں جوابی الزام تراشی کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

1.12- اقبال اور قائداعظم

اسی فضا میں اقبال نے قائداعظم کو وہ خطوط لکھے جن میں کانگریس کے مظالم نیز مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی سے پیدا ہونے والے مسائل پر نہایت مختصر مگر جامع تبصرہ کیا۔ یہ بھی بتایا کہ ہندو مسلم مسئلے کا مستقل حل یہی ہے کہ مسلم اکثریت کے علاقوں میں ایک مسلم ریاست قائم ہو جائے۔ ایک خط میں انہوں نے قائداعظم کو یوں لکھا کہ:

> ''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے مسلمان آپ اور صرف آپ ہی کی طرف دیکھیں گے اور آپ ہی ان کی کشتی کو ساحل مراد تک لے جائیں گے۔''

مستقبل قریب میں یہ الفاظ من وعن پورے ہوئے۔ جب مسلم لیگ کی تنظیم نو ہوئی تو اپنے مرض الموت میں اقبال نے قائد کی قیادت میں صوبائی مسلم لیگ کی صدارت قبول کی اور فخر سے کہا کہ میں جناح کا ایک سپاہی ہوں۔ 21 اپریل 1938ء کو علامہ اقبال نے انتقال کیا۔ یوم اقبال کے ایک اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا:

> ''اقبال میرا پرانا دوست تھا..... جب میں اپریل 1936ء میں پنجاب میں آیا تو پہلا شخص جس سے میں ملا وہ اقبال تھا، میں نے اپنے خیالات اس کے سامنے پیش کئے۔ اس نے فوراً لبیک کہی اور اس وقت سے تادم مرگ اقبال میرے ساتھ مضبوط چٹان کی طرح کھڑا رہا..... بلاشبہ اقبال بہت بڑا شاعر تھا۔ جب تک مشرقی زبانیں موجود رہیں گی، اقبال کا کلام زندہ رہے گا۔ اقبال نے ملی شعور پیدا کرنے میں گراں بہاں خدمات انجام دیں۔..... گو میرے پاس سلطنت نہیں ہے لیکن اگر سلطنت مل جائے اور اقبال اور سلطنت میں کسی ایک کو منتخب کرنے کی نوبت آئے تو میں اقبال کو منتخب کروں گا۔''

1.13- لیگ کا لکھنؤ اجلاس

اکتوبر کے وسط میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ہوا۔ یہاں قائداعظم نے اپنی صدارتی تقریر میں کانگریسی

* کتاب کے مصنف اسرار احمد ہیں۔

وزارتوں کی مسلم کش کارروائیوں کا ذکر نہایت واشگاف الفاظ میں کیا اور انہیں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے ایک منظم خطرہ بتایا۔ لیکن ساتھ ہی کانگریس کی طرف دوستی اور تعاون کا ہاتھ بڑھایا۔ اس فراخ دلانہ پیش کش کو گاندھی نے اعلان جنگ قرار دیا۔ اخباری بیانوں اور مباحثوں سے ملک کی فضا اور بھی بگڑی اور ہندو مسلم کشیدگی میں اضافہ ہوا۔ کانگریس کی زیادتیوں کا خاتمہ ہونے میں نہ آتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ 1938ء کے آخر تک قائداعظم اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ دونوں قوموں کے درمیان فیصلہ کن تصفیہ صرف تقسیم ہند سے ہوسکتا ہے۔ یہ بات اس خطبۂ صدارت سے عیاں ہے جو انہوں نے اسی سال دسمبر کے مہینے میں لیگ کے پٹنہ اجلاس میں پڑھا۔ انہوں نے اور باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ گاندھی ملک کو مکمل ہندومت کے راستے پر لے جا رہے ہیں اور مسلم ثقافت اور طرز زندگی کو ملیامیٹ کر رہے ہیں۔

1.14- جنگ کا آغاز۔ لیگ اور کانگریس کا ردعمل

ستمبر 1939ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی۔ جرمن کی ہیبت ناک جنگ تیاریوں سے پورا یورپ لرزہ براندام تھا۔ قرائن سے نظر آتا تھا کہ اپنی شدت میں یہ لڑائی پہلی عالمی جنگ کو مات کر دے گی۔ وائسرائے نے لارڈ لنتھگو نے تمام سیاسی جماعتوں کے نام تعاون کی اپیل کی اور کہا کہ وہ اپنی باہمی رنجشوں اور رقابتوں کو بھول کر برطانیہ کو جنگ جیتنے میں مدد دیں۔ اس اپیل کا متوقع اثر نہ ہوا۔ اگرچہ وائسرائے سے ملاقات کے دوران گاندھی نے برطانیہ کے ساتھ اس شدت سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے تھے۔ لیکن کانگریس کی انتظامیہ نے اس بات کا مطالبہ کیا کہ برطانوی حکومت جنگ میں اپنے اغراض و مقاصد واضح کرے اور کہہ دیا کہ اگر یہ جنگ صرف جمہوریت کی بقا کے لیے لڑی جا رہی ہے تو تعاون کی پہلی شرط یہ ہے کہ برطانیہ ہندوستان کو آزاد کر دے۔ ہندوستان کی آزادی سے کانگریس کی مراد ہمیشہ یہی تھی کہ غیر مشروط طور پر حکومت کو اکثریت کے حوالے کر دیا جائے۔ اسی بات کو دوسرے پیرائے میں بیان کرتے ہوئے کانگریس کے لیڈر نہایت دل آویز اور اخلاقی انداز میں قومی حکومت کے قیام پر زور دیتے تھے۔ مسلم لیگ کا موقف مختلف تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ 1935ء ایکٹ اقلیتوں کی حفاظت کرنے میں ناکام رہا ہے۔ گورنر جنرل اور صوبائی گورنروں نے کانگریسی حکومتوں کی زیادتیوں کو نظر انداز کر دیا ہے اور ان کو مسلمانوں کے مذہبی، سیاسی اور معاشرتی حقوق پامال کرنے کی کھلی چھٹی دے دی ہے۔ فلسطین کے معاملے میں بھی برطانوی حکومت کی روش انتہائی طور پر ناتسلی بخش ہے، اس لیے ضروری ہے کہ حکومت 1935ء کے ایکٹ کو اور اس کے ماتحت قائم ہونے والی فیڈریشن کو کالعدم قرار دے دے۔

1.15- کانگریسی حکومتوں کا استعفیٰ اور یوم نجات

غرضیکہ لیگ اور کانگریس میں سے کوئی بھی جماعت حکومت کے ساتھ غیر مشروط تعاون کے لیے تیار نہ تھی۔ وائسرائے نے اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے، ملک کی تمام پارٹیوں کے لیڈروں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا اور باون رہنماؤں سے بات چیت کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ ان میں آئندہ دستور کے خدوخال کے مطابق شدید اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اس لیے فی الحال کسی دستوری تبدیلی پر کوئی گفت وشنید نہیں کی جا سکتی۔ جنگ کے خاتمے پر ہی دستوری صورت حال کا جائزہ لیا جائے گا۔ کانگریس نے وائسرائے کے بیان کو ناتسلی بخش قرار دیتے ہوئے اپنی پارٹی کی صوبائی وزارتوں کو مستعفی ہونے کی ہدایات جاری کر دیں اور ممبروں کو اسمبلیوں کا بائیکاٹ کرنے کا حکم دے دیا، کانگریس ہائی کمان کا خیال تھا کہ اس اقدام سے حکومت کے ہوش ٹھکانے آ جائیں گے اور ان کو خوشامد کر کے دوبارہ واپس بلا لیا جائے گا۔ لیکن وائسرائے کانگریس کو ممنون کرنے کا کوئی ارادہ نہ رکھتا تھا۔ کانگریس کے رہنما مختلف طریقوں سے وائسرائے پر دباؤ ڈالتے رہے۔ مگر وائسرائے کو اس معاملے میں کوئی جلدی نہ تھی۔ 12 دسمبر 1939ء کو قائداعظم کی ہدایت کے مطابق تمام ہندوستان میں چھوٹے دیہاتوں سے لے کر بڑے شہروں تک مسلم لیگ نے کانگریس راج کے خاتمے پر یوم نجات منایا۔ جس میں دوسری اقلیتوں نے بھی شرکت کی۔

1.16- خود آزمائی نمبر 1

سوال نمبر 1 مسلم لیگ کی سیاست پر علامہ اقبال کے خیالات کا تجزیہ کیجیے۔

سوال نمبر 2 1935ء کے ایکٹ اور طرز حکومت پر اقبال اور قائداعظم کے خیالات پر بحث کیجئے؟

سوال نمبر 3 اقبال کے متعلق قائداعظم کے خیالات پر نوٹ لکھئے۔

سوال نمبر 4 1937ء کے انتخابات میں کامیابی کے بعد کانگریس نے مسلمانوں کے ساتھ جو ظالمانہ رویہ روا رکھا۔ اس پر بحث کیجیے۔

2- قرارداد پاکستان: پس منظر اور صوبوں پر اثرات

2.1- تحریک پاکستان کا پس منظر

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تحریک پاکستان کا آغاز 1940ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس لاہور میں پاس ہونے والی قرارداد سے شروع ہوتا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی کتاب (Discovery of India) میں لکھا ہے کہ دو قومی نظریہ اور تقسیم ملک کے تصورات قائداعظم کے اختراع تھے اور اس سے پہلے ان کا کوئی وجود نہ تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ تحریک پاکستان کا آغاز 1937ء سے ہوا جب یو پی کانگریس نے مسلم لیگ کے دو رہنماؤں کو صوبائی وزارت میں لینے سے انکار کیا تھا۔ یہ دونوں باتیں حقیقت سے بعید ہیں۔ تحریک پاکستان کی جڑیں بہت گہری ہیں اور اس کا پس منظر بہت وسیع ہے۔ ایک مرتبہ قائداعظم سے کسی نے اسی نکتے پر استفسار کیا تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ پاکستان کی تحریک اسی دن سے شروع ہوئی جب اس برصغیر میں پہلا ہندو مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔

2.2- تقسیم ہند کے تصور کی تاریخ

جن معنوں میں گاندھی اور نہرو وحدت ہند کا پرچار کیا کرتے تھے، اس وحدت کا وجود واقعاتی طور پر ثابت نہیں۔ تاریخ میں بہت کم مواقع ایسے آئے ہیں جن میں ہندوستان کو ایک سیاسی وحدت کہا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر ان اداوار کی مدت بھی طویل نہیں۔ یہ کہنا کہ ہندوستانی قوم میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے اور دو قومی نظریہ بے بنیاد ہے، حقائق سے روگردانی کے مترادف ہے۔

ہندو اور مسلمان معاشرے اس برصغیر میں ایک ہزار سال تک ایک دوسرے کے ساتھ رواں دواں رہے۔ ایک دوسرے پر دونوں کے اثرات سطحی اور منفی تھے، ہندو، ہندو رہے اور مسلمان، مسلمان رہے، دونوں کے تصورات زندگی اور طرز زندگی ایک دوسرے سے بالکل جدا تھے۔

(الف) بھائی پرمانند

آریہ سماج کے صف اول کے لیڈروں میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے تاریخ ہند کا مطالعہ ایک مخصوص زاویۂ نظر سے کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی تاریخ صرف اسی طویل اور جانگداز جدوجہد کی داستان ہے جو ہندوؤں نے صدیوں تک اپنی آزادی حاصل کرنے کے لیے مسلمان حکمرانوں کے خلاف جاری رکھی۔ بعض ہندو امرا مسلمان بادشاہوں کی ملازمت کرتے اور ان

کی اطاعت کا دم بھرتے تھے اور بعض ہندو روسا سالہا سال تک ان کے خلاف لڑتے رہے۔ بھائی پرمانند کہتے ہیں کہ ہندو خواہ اول الذکر جماعت کے ساتھ تعلقات رکھتے تھے اور یا ثانی الذکر گروہ کے ساتھ، دونوں کا مقصد ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ اس سرزمین سے اسلام اور مسلمان کا خاتمہ کیا جائے۔ مسلم لیگ سے بہت پہلے تقسیم ملک کا تصور مسلمانوں اور غیر مسلموں، دونوں نے اپنے اپنے علم، ماحول اور فہم کے مطابق پیش کیا تھا۔

(ب) جان برائٹ

انیسویں صدی کے نصف آخر میں جان برائٹ انگلستان کی پارلیمینٹ کا ایک ریڈیکل رکن تھا۔ اس نے اپنی ایک مشہور تقریر میں جس کا حوالہ اکثر قائداعظم دیا کرتے تھے یہ کہا تھا کہ ہندوستان پر جو وحدت انگریزوں نے مسلط کی ہے وہ برطانوی حکومت کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گی۔

(ج) مارلین

تھیوڈور مارلین علی گڑھ کالج کے پرنسپل تھے۔ وہ سرسید کو ذاتی طور پر جانتے تھے اور ان کی شخصیت سے بہت متاثر تھے، ان کی ایک کتاب 1818ء میں شائع ہوئی اس کے آغاز میں ہی انہوں نے ہندوستان کے سب سے بڑے مسئلے (یعنی قومیت کے جذبے کے فقدان) کی طرف اشارہ کیا تھا ان کی تحریر کا مفہوم یوں تھا:

> ''اگر ہندوستان برطانیہ سے کچھ مراعات حاصل کرنے پر تلا ہوا ہے، تو سب سے پہلے اسے ایک قوم بننا ہوگا۔ قومیت کا جذبہ بذات خود ایک بے پناہ قوت ہے، لیکن یہاں اس جذبے کو بروئے کار لانا ناممکن ہے کیونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تاریخی اور معاشرتی اختلافات اس قدر گہرے ہیں کہ دونوں کی دنیا اپنی اپنی ہے۔ ہندوستان میں قومیت کا جذبہ پیدا کرنے کا ایک ہی طریق ہے، ہندوستان کے سارے مسلمانوں کو لا کر پشاور اور آگرہ کے درمیان آباد کر دو۔ اگر یہ ہو جائے تو اس علاقے میں مسلم قومیت پنپ سکتی ہے اور باقی ماندہ ہندوستان میں ہندو قومیت''۔

مارلین نے بات کو آگے نہیں بڑھایا کیونکہ اس وقت برطانوی اقتدار کا سورج نصف النہار پر تھا اور انگریزی حکومت کا خاتمہ دور کی بات نظر آتی تھی۔

(د) تقسیم بنگال

آنے والے سالوں میں ہندو اور مسلم قومیت کے جذبے کے ساتھ ساتھ پرورش پاتے رہے، مسلمانوں کے نزدیک تو مذہب اسلام ہی ان کی قومیت کی بنیاد تھی، لیکن انیسویں صدی کی ہندو اصلاحی تحریکوں، نیز تقسیم بنگال کے خلاف جو احتجاج ہوا، دونوں مل کر ہندوؤں کے قومی جذبے کو شعوری سطح پر اجاگر کیا۔ برطانوی دور میں تقسیم بنگال کی تنسیخ اس جذبے کی بہت بڑی فتح تھی،

1911ء کے بعد مسلمانوں کے ہاں جو سیاسی تحریکیں شروع ہوئیں ان پر بھی مذہب کا بہت گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ بعض مبصرین کے نزدیک تحریک خلافت میں احیائے اسلام کے کئی عناصر صاف صاف نظر آتے تھے۔ تحریک خلافت ختم ہوئی تو دفعتاً ہندوؤں اور مسلمانوں کے شدید قومی جذبات کے دھارے جو پچھلے دس سالوں میں، وقتی طور پر ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے، مخالف سمتوں میں بہنے لگے۔

(ر) محمد گل خان

1922ء میں حکومت ہند نے سرڈینس برے کی زیر صدارت ایک تحقیقاتی کمیٹی اس غرض سے مقرر کی تھی کہ صوبہ سرحد میں اصلاحات کے نفاذ کے سوال کا جائزہ لے۔ اس کمیٹی کے سامنے محمد گل خان نے شہادت دیتے ہوئے کہا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں۔ بہت بہتر ہوگا کہ شمالی ہندوستان کو مسلمانوں اور جنوبی ہندوستان کو ہندوؤں کا علاقہ قرار دے دیا جائے۔ اگرچہ خان موصوف کے سامنے آبادی کے اعداد و شمار نہیں تھے لیکن ان کے بیان میں تقسیم ملک کا واضح تصور موجود تھا۔

(س) بھائی پرمانند

1922ء اور 1923ء میں بھائی پرمانند کی دو کتابیں شائع ہوئیں، پہلی کا نام ''آپ بیتی'' اور دوسری کا ''آریہ سماج اور ہندو سنگھٹن'' تھا۔ ان دونوں کتابوں میں مصنف نے ہندو طرز فکر کی عکاسی کی ہے۔ ''آپ بیتی'' میں وہ کہتے ہیں کہ 1913ء سے ہی میرے ذہن میں یہ تجویز گردش کر رہی تھی کہ ہندو مسلم مسئلے کا مستقل حل یہی ہے کہ دونوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔ دوسری کتاب میں اسی تصور کو کسی قدر مختلف الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ شاید کوئی ایسی سبیل نکل آئے کہ ہندوستان کے ہندو اور مسلم منطقوں کو اس طرح ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا جائے کہ دو علیحدہ علیحدہ ملک بن سکیں، جو مسلمان ہندوستان میں نہ رہنا چاہیں وہ اسلامی علاقے میں آ کر بس جائیں اور جو ہندو مسلمانوں کی قیادت گوارہ نہ کریں وہ ہندوستان کی راہ لیں۔

(ش) لاجپت رائے

سی آر داس بنگال کے ایک مقتدر اور بے تعصب رہنما تھے۔ 1925ء میں لالہ لاجپت رائے نے ان کو ایک خط لکھ کر ہندو مسلم اتحاد کے مسئلے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا، ان کی تحریر کا ماحصل یوں ہے:

> ''میں نے گزشتہ مہینوں میں جیل کے اندر اسلامی قانون اور اسلامی فلسفے کا مطالعہ کیا۔ میں تو اس سے یہی سمجھ سکا ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مستقل مفاہمت کی کوئی راہ نہیں نکل سکتی۔ میں اس بات کو مانتا ہوں کہ بہت سے خلافتی رہنما بھی ہمارے ساتھ تحریک آزادی میں دوش بدوش کام کرتے رہے ہیں، میں ان کے اخلاص کا معترف ہوں۔ لیکن میں اس بات کو بھی پیش نظر رکھتا ہوں کہ وہ قرآن کے واضح احکام سے

منہ نہیں موڑ سکتے۔ ہماری اور ان کی کیسے بن آئے گی؟ ہوسکتا ہے کہ ہندو اور مسلمان متحد ہو کر انگریزوں کو ملک سے باہر نکال دیں لیکن آزاد ہندوستان میں دونوں مل جل کر جمہوری حکومت نہیں چلا سکتے''۔

آخر میں انہوں نے کہا کہ میں انہی خیالات سے مضطرب رہا ہوں اور امید ہے کہ آپ اپنی دانشمندی اور پیش بینی سے اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کر لیں گے۔ معلوم نہیں سی آر داس نے اس خط کو کیا اہمیت دی۔ قیاس ہے کہ یہ خط ان کو زندگی کے آخری دنوں میں ملا ہوگا۔

(ل) آغا خان

1924ء کے بعد ملکی فضا میں ہندو مسلم اختلافات دن بدن وسعت اختیار کر رہے تھے، فسادات کا دور دورہ تھا۔ کسی آئینی سکیم پر ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتفاق نہ ہوسکتا تھا۔ اسی ماحول میں نہرو رپورٹ تیار ہوئی جس کی سفارشات نے فرقہ وارانہ مسئلے کو سنگین ہی نہیں بلکہ آتشیں بنا دیا۔ نہرو رپورٹ کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے کے لیے آغا خان سوئم نے 1928ء میں لنڈن ٹائمز میں دو مضمون لکھے۔ ان میں مضمون نگار نے کہا کہ آزاد ہندوستان کا متحد رہ سکنا محال ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہندوستان کو لسانی، ثقافتی اور نسلی بنیادوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح موجودہ ہندوستان پانچ آزاد مملکتوں میں بٹ جائے گا۔ صاحب مضمون نے ان ریاستوں کے جو حدود اربعہ تجویز کئے تھے اس میں کم وبیش دو ریاستیں وہی تھیں جو شمال مغرب میں مسلم اکثریت کے علاقے تھے۔

(م) خطبہ الہ آباد

دسمبر 1930ء میں علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں جو خطبہ پڑھا اس میں انہوں نے بہت سے مسائل پر بحث کی تھی۔ کچھ مسائل وقتی نوعیت کے تھے اور کچھ دائمی اہمیت کے حامل تھے۔ انہوں نے تاریخی عمل کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کی پیش گوئی کی تھی کہ برصغیر کے شمال مغربی علاقوں میں ایک اسلامی سلطنت کا قیام ناگزیر ہے، یہی مملکت اسلامی اقدار کی حفاظت کرے گی اور مسلمانوں کے لیے اسلامی طرز زندگی کو ممکن اور سہل بنائے گی۔ جس وقت یہ خطبہ الہ آباد میں پڑھا گیا تھا لندن میں گول میز کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا، علامہ اس میں شریک نہ تھے، اگلے سال وہ دوسری گول میز کانفرنس میں شامل ہونے کے لیے انگلستان گئے۔ وہاں ان کی ملاقاتیں قائداعظم کے ساتھ ہوئیں۔ ان ملاقاتوں میں تقسیم ملک کا ذکر بھی آیا ہوگا لیکن اس کا فوری نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اسی دوران علامہ کی ملاقاتیں پنجاب اور سرحد کے ان مسلمان طالب علموں کے ساتھ بھی ہوئیں جو ان دنوں انگلستان میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

(ن) چوہدری رحمت علی

ان طالب علموں میں جنہوں نے اقبال کا گہرا اثر قبول کیا سب سے زیادہ شہرت رحمت علی کو ہوئی۔ انہوں نے 1933ء کے شروع میں ایک پمفلٹ لکھا جس کا عنوان تھا (Now or Never) اس کتابچے میں انہوں نے تقسیم ہند کی ایک تجویز پیش کی

تھی اور پاکستان کا نام بھی خود ہی تجویز کیا تھا۔

(و) 1935ء کے ایکٹ کے تقاضے

1935ء کے ایکٹ کے متعلق علامہ اقبال اور قائداعظم دونوں کے دلوں میں شکوک وشبہات موجود تھے۔ سرسید کے زمانے میں اکثریت غلبے کا خدشہ کسی قدم مبہم تھا۔ اب وہ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ فیڈریشن حقیقی فیڈریشن نہ تھی۔ اس کا رنگ ڈھنگ وحدانی حکومت جیسا تھا اور اس میں اقلیتوں کے تحفظ کے انتظامات بھی بالکل غیر مؤثر تھے۔ کانگریس کی صوبائی حکومتوں نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اکثریت کے نزدیک مسلمانوں کے لیے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں تو وہ اپنی تہذیبی قدروں کو خیرآباد کہیں اور اپنے آپ کو اکثریت میں ضم کر دیں۔

(ہ) اقبال کے خطوط قائداعظم کے نام

انہی دنوں علامہ اقبال نے قائداعظم کو جو خطوط لکھے ان میں تقسیم ملک کی تجویز پیش کی۔ اس وقت کے حالات میں اس تجویز پر گہرا غور وفکر شروع ہوا اور مختلف سمتوں سے تقسیم ہند کی تجاویز پیش کی گئیں۔ علامہ اقبال تو 21 اپریل 1938ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ لیکن ان کے خیالات دن بہ دن مسلمانوں میں جڑ پکڑتے گئے۔ قائداعظم نے تقسیم ملک کی تجویز کو مکمل طور پر کب قبول کیا؟ اس کے متعلق مختلف آراء ہوسکتی ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ 1938ء کے آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مسلم ثقافت کے تحفظ کے لیے تقسیم ملک کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ یہ بات اس خطبہ صدارت سے عیاں ہے جو انہوں نے دسمبر 1938ء میں مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ پٹنہ میں پڑھا تھا۔ کانگریس وزارتوں کی کارروائیوں نے ملک میں خانہ جنگی کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ اس کے مستعفی ہونے کے بعد قائداعظم کی ہدایت پر 22 دسمبر 1939ء کو یوم نجات منایا گیا اور 23 مارچ 1940ء کو لیگ کے اجلاس منعقدہ لاہور میں قرارداد پاکستان پاس ہوئی۔

(ی) مسلم لیگ کے اجلاس کا پس منظر

اس وقت لاہور کی فضا انتہائی ناخوشگوار تھی، 19 مارچ کو خاکساروں کے ایک دستے پر حکومت کے اشارے پر پولیس نے ظالمانہ فائرنگ کی تھی، اس وحشیانہ طرز عمل سے مسلمانوں کو شدید دکھ پہنچا تھا۔ پنجاب کی یونینسٹ حکومت کے ارکان اپنے آپ کو مسلم لیگی بھی کہتے تھے۔ ان کے خلاف مسلمانوں میں زبردست ہیجان تھا۔ حکومت کی زبردست خواہش تھی کہ لیگ کے اجلاس کو ملتوی کر دیا جائے تاکہ عوام کو اپنے غم وغصے کے اظہار کا موقع نہ مل سکے۔ لیکن قائداعظم نے التوا کی تجویز کو ٹھکرا دیا۔ لاہور ریلوے اسٹیشن سے وہ سیدھے زخمی خاکساروں کو دیکھنے کے لیے ہسپتال گئے اس کے بعد اپنی قیام گاہ پر تشریف لائے۔

2.3- قرارداد پاکستان

لیگ کے اجلاس میں قائداعظم کا خطبہ صدارت ہنگامہ انگیز تھا۔ انہوں نے تاریخی شہادت کی روشنی میں متحدہ ہندوستان کے تصور کو غیر فطری قرار دیا اور کہا کہ مسلمان، قومیت کی ہر تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ اس لیے وہ اپنے علیحدہ قومی وطن کے مستحق ہیں۔ یہی بات ہندوؤں پر صادق آتی ہے، قرارداد پاکستان کا متن یوں تھا:

''قرار پایا کہ غور وخوض کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی رائے یہ ہے کہ کوئی آئینی منصوبہ بغیر اس کے کہ ملک میں قابل عمل اور مسلمانوں کے قابل قبول نہیں ہوگا جب تک وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی نہ ہو، یعنی یہ کہ حد بندی کر کے اور ملکی تقسیم کے اعتبار سے ردوبدل کر کے متصل واحدوں کو ایسے منطقے بنایا جائے کہ وہ علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ جیسے شمالی، مغربی اور مشرقی منطقوں میں، اس طرح یک جا ہو جائیں کہ وہ ایسی خودمختار ریاستیں بنیں جن کے واحدے یا یونٹ اندرونی طور پر بااختیار اور خودمختار ہوں۔

یہ کہ ان واحدوں میں اور ان علاقوں میں اقلیتوں کے لیے ان کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق و مفاد کے تحفظ کے لیے ان کے مشورے سے بقدر ضرورت موثر اور واجب التحصیل تحفظات معین طور پر دستور کے اندر مہیا کئے جائیں اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں حسب ضرورت موثر اور واجب التحصیل تحفظات ان کے اور دوسری اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، سیاسی انتظامی اور دوسرے حقوق و مفاد کی حفاظت کے لیے ان کے مشور سے معین طور پر دستور کے اندر رکھے جائیں۔

یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی کو یہ مزید اختیار دیتا ہے کہ ان بنیادی اصولوں کے مطابق دستور کی ایک ایسی سکیم مرتب کرے جس میں اس کا انتظام ہو کہ بال آخر یہ جداگانہ علاقے ایسے تمام اختیارات لے سکیں جیسے دفاع، امور خارجہ، رسل و رسائل، کسٹم اور دوسرے امور جو ضروری ہیں۔

مولوی ابوالقاسم فضل الحق نے اس قرارداد کی تحریک کی اور چوہدری خلیق الزمان نے تائید کی، مزید تائید جن حضرات کی طرف سے ہوئی وہ مولانا ظفر علی خان، سردار اورنگ زیب خان، حاجی عبداللہ ہارون، نواب محمد اسماعیل، قاضی محمد عیسیٰ، بیگم مولانا محمد علی وغیرہ ہیں۔

2.4- ہندوؤں کا ردعمل

قرارداد بہ اتفاق رائے منظور ہوئی، تہنیت اور تبریک کے نعروں کے ساتھ لوگوں کو اس قرارداد کے منظور ہونے پر بڑی

مسرت ہوئی، پہلی دفعہ ہندوستانی مسلمانوں کو وہ نصب العین ملا جس کا حصول ان کی جد جہد پر منحصر تھا، انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے ہاتھ پیر کھل گئے۔ یہ آزاد اور خود مختار مملکت انہی علاقوں میں بننے والی تھی جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اس قومی وطن میں اسلامی تہذیب وتمدن، ثقافت اور دین کو ترقی دینے کا موقع ملے گا۔ جو تقریریں اس موقع پر ہوئیں ان میں پاکستان کا قطعی طور پر کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس قرارداد کو محض تقسیم ہند کی قرارداد کہا گیا۔ چوہدری رحمت علی کی کوششوں سے پاکستان کا لفظ مشہور ہو چکا تھا۔ ہندو پریس نے طعن اور طنز کے طریق پر اس نام کو ایسا اچھالا کہ زبان زد عام ہوگیا۔ بال آخر مسلم لیگ نے بھی اس کو قرارداد پاکستان کا نام دے دیا، قرارداد کی منظوری کے بعد برصغیر کے ہندوؤں میں ایک شور وغوغا مچ گیا، اس کے خلاف ہر ہندو بول رہا تھا اور ہر ہندو اخبار لکھ رہا تھا۔

2.5- مسلمان صوبوں کی سیاست

قرارداد پاکستان کے پاس ہونے کے بعد مسلم اکثریت کے صوبوں میں یک تلاطم آنا لازمی تھا۔

(الف) پنجاب

پنجاب کی یونینسٹ وزارت نے مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے 1937ء کے لکھنؤ سیشن میں لیگ سے ناطہ جوڑا تھا۔ سردار سکندر حیات خان صوبے کے وزیر اعلیٰ تھے۔ وہ طبعاً معتدل مزاج اور شائستہ انسان تھے۔ انہوں نے ایک حد تک لیگ کے ساتھ اپنے عہد و پیمان کو نبھانے کی کوشش کی اور 1941ء میں قائداعظم کے حکم پر نیشنل ڈیفنس کونسل سے استعفیٰ دے دیا، لیکن دسمبر 1942ء میں ان کے انتقال کے بعد حالات بدلے، ان کے جانشین خضر حیات خان، لارڈ ویول کے قول کے مطابق، برطانوی تسلط کے خیر خواہوں میں سے تھے۔ ان کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہ تھی، وہ صوبائی گورنر اور وائسرائے کے اشاروں پر چلتے تھے۔ انہوں نے پے در پے لیگ کے احکام کو نظر انداز کرنا شروع کیا۔ اسمبلی کے حکام اس میں کچھ دیر تو ان کی حمایت کرتے رہے، لیکن مسلمانوں کی رائے عامہ نے لیگ کو عوامی جماعت بنایا، اس سلسلے میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔ فیڈریشن نے لیگ کے لیے ہراول دستے کا کام دیا۔ 1944ء میں خضر حیات خان کو لیگ سے نکال دیا گیا۔ ابتداء میں ان کے تقریباً بیس پیروکاروں نے پارٹی سے قطع تعلق کر کے اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی کا علیحدہ بلاک بنایا۔ لیکن ایوان سے باہر مسلم لیگ کو بے پناہ مقبولیت حاصل تھی، یہی وجہ ہے کہ 1946ء کے انتخاب میں مسلم لیگ نے ہر مخالف پارٹی کو فیصلہ کن شکست دی۔

(ب) سرحد

جنگ کے ابتدائی دنوں میں صوبہ سرحد کے کانگریسی وزارت نے استعفیٰ دے دیا اور گورنر راج قائم ہوا۔ 1943ء کے آغاز میں یہاں سردار اورنگ زیب خان کی سرکردگی میں مسلم لیگ کی وزارت بنی جو دو سال تک چلی، سرحد کی رائے عامہ مسلم لیگ

کے ساتھ تھی۔ لیکن کچھ تو انتخابی حلقوں کی تشکیل ایسے ہوئی تھی اور کچھ اقلیتوں کو اپنی تعداد کے مقابلے میں اتنی وافر نمائندگی ملی ہوئی تھی کہ کانگریس نے اس مسلم صوبے کو لیگ کے اقتدار سے بچانے کے لیے کامیابی کے ساتھ بہت سے ناواجب ذرائع استعمال کئے۔ اس لیے لیگ کو 1946ء کے انتخابات میں متوقع کامیابی حاصل نہ ہوئی، اس کے باوجود مسلمانوں کی رائے عامہ پاکستان کے حق میں سیسہ پلائی دیوار بن گئی۔ جب پنڈت نہرو نے 1946ء کے آخر میں صوبہ سرحد کا دورہ کیا تو ان کو عوامی غیض وغضب کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی طرح جب ماؤنٹ بیٹن نے اپنے آنے کے بعد صوبے کا دورہ کیا تو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ لوگ حصول پاکستان کے لیے کتنے مضطرب ہیں۔ ''فریڈم ایٹ مڈ نائٹ میں اس نظارے کا خاکہ نہایت جچے تلے الفاظ میں مصورانہ چابکدستی سے کھینچا گیا ہے، ماؤنٹ بیٹن کو خدشہ تھا کہ اس نے پاکستان کے خلاف ایک کلمہ بھی منہ سے نکالا تو وہ اپنی جان بھی سلامت لے کر نہیں جا سکے گا۔ 1947ء میں جب استصواب ہوا تو سرحد کے ووٹروں نے پاکستان کے حق میں رائے دی۔

(ج) سندھ

سندھ میں مسلمانوں کی اقتصادی پس ماندگی ضرب المثل تھی، ہندوؤں نے اپنی اقتصادی برتری کی بدولت صوبائی سیاست میں بہت عمل دخل حاصل کر لیا تھا، کانگریس نے یہاں بھی حصول اقتدار کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رکھی تھی، تعجب کی بات یہ ہے کہ جہاں کانگریس کو کسی صوبائی اسمبلی میں اکثریت حاصل ہوتی تو کانگریسی رہنما وزارت بناتے وقت کسی دوسری پارٹی کا تعاون ضروری نہ سمجھتے بلکہ جہاں کانگریس اقلیت میں ہوتی وہاں اسے وزارت میں شامل ہونے کی کھلی اجازت تھی۔ وزارت میں شامل ہونے یا اس کی تائید کرنے کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا تھا کہ ہر محاذ پر لیگ کو زک پہنچائی جائے۔ چنانچہ سندھ میں تین چار سال تک یہی ہوتا رہا۔ کیبنٹ ایورڈ کی روح سے اسمبلی میں مختلف قوموں کی نشستوں کا تعین اس طرح پر کیا گیا تھا کہ دس ہندو ارکان کے گروپ کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس چھوٹے سے گروپ نے اپنے ذمے یہ فرض لگا رکھا تھا کہ اسمبلی کے اندر مسلمان ممبروں کے اتحاد کے تمام امکانات کو ختم کر دے۔ کچھ عرصہ تک تو یہ کھیل نہایت کامیابی کے ساتھ کھیلا گیا، لیکن ایوان سے باہر رائے عامہ کی کیفیت مختلف تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے تو 1940ء میں قرارداد پاکستان منظور کی تھی۔ لیکن سندھ کی صوبائی لیگ کو یہ شرف حاصل ہوا تھا کہ اس نے 1938ء میں ہی اس مضمون کا ریزولیشن پاس کر دیا تھا۔ اسمبلی کے اندر جوڑ توڑ ہوتے رہتے تھے ان میں سب سے نمایاں کردار خان بہادر اللہ بخش نے ادا کیا جو کانگریس کے حکم پر اپنے قول سے پھر جانے پر تیار ہوتے تھے، انہی کی وجہ سے سندھ کی سیاست مدوجذر کا شکار ہوتی رہی۔ ان کے قتل کے بعد حالات بدلے اور کچھ عرصے کے بعد مسلم لیگ پارٹی کی قیادت غلام حسین ہدایت اللہ کے ہاتھ میں آئی۔ انہوں نے دو عمومی انتخابات میں مخالفوں کو شکست دے کر اس صوبے کے لیے پاکستان میں شمولیت کا راستہ صاف کیا۔ حاجی عبداللہ ہارون اس علاقے میں قائداعظم کے دست راست تھے۔

(د) بنگال

مسلمانوں کی اکثریت تو بنگال کے مشرقی علاقوں میں تھی، لیکن کلکتہ کا شہر، ہندو سیاست، ہندو اخباروں اور ہندو تحریکوں کا گڑھ اور تحریک پاکستان کی مخالفت کا مرکز تھا۔ 1941ء میں قائداعظم اور مولوی اے کے فضل حق کے درمیان ڈیفنس کونسل کی رکنیت کے سوال پر اختلاف پیدا ہوا۔ قائداعظم نے مولوی صاحب کو مستعفی ہونے کا حکم دیا۔ فضل الحق نے یہ بات تو مان لی لیکن ساتھ ہی لیگ کے ساتھ بھی اپنا تعلق قطع کر لیا۔ بنگال اسمبلی کے مسلمان ممبروں پر اس کا ردعمل بہت شدید ہوا اور ان کی اکثریت مولوی صاحب کی حمایت سے دست بردار ہوگئی۔ اپنی ڈوبتی ہوئی وزارت کو بچانے کے لیے فضل الحق نے ہندو مہا سبھا کے ساتھ مفاہمت کر لی، لیکن مسلمانوں کی رائے عامہ نے ان کا ساتھ نہ دیا، ان کی دست برداری کے بعد خواجہ ناظم الدین نے مسلم لیگی وزارت بنائی۔ اس وزارت کو ہر قدم پر ہندو پریس اور ہندو تاجروں کی طرف سے بے شمار رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بدقسمتی سے جنگی ضروریات اور رسد کی دقتوں کی وجہ سے بنگال میں قحط کی صورت پیدا ہوگئی۔ ہندو منافع خوروں کی ہوس زر نے اس قحط کو اور بھی بھیانک بنا دیا اور یہ قحط خدائی عذاب بن گیا۔ اس قحط کی تمام ذمے داری وزارت پر ڈال دی گئی۔ 1945ء میں خواجہ ناظم الدین مستعفی ہو گئے۔ 1946ء میں دہلی میں مسلم لیگ کنونشن میں حسین شہید سہروردی نے بہت نمایاں کردار ادا کیا۔ ڈائریکٹ ایکشن ڈے اور نواکھلی کے فسادات نے آئندہ تبدیلیوں کا راستہ ہموار کیا۔ بے لوث سیاسی کارکنوں اور طالب علموں کی کوششوں سے مسلم لیگ کو 1946ء کے انتخابات میں بے مثال کامیابی حاصل ہوئی۔

مشغلہ: 1930ء سے پہلے کس کس نے اور کب برصغیر کی تقسیم کی تجویز پیش کی؟ تاریخ وار فہرست بنائیے۔

2.6- خود آزمائی نمبر 2

سوال نمبر 5 تقسیم ہند کے تصور کی تاریخ کا مختصراً جائزہ لیجئے۔

(جواب کا موازنہ 2.2 سے کیجئے)

سوال نمبر 6 قرارداد پاکستان کے بنیادی نکات کی وضاحت کیجئے۔

(جواب کے لیے 2.3 کو پڑھیں)

3- قرارداد سے قیام تک

3.1- لیگ عوامی جماعت کی حیثیت سے

کانگریس وزارتوں نے اکتوبر 1939ء میں اپنے استعفے داخل کر دیے تھے۔ پارٹی کے لیڈروں کو پوری توقع تھی کہ ان کے اقدام سے برطانوی حکمرانوں کے اوسان خطا ہو جائیں گے اور منت سماجت کر کے ان کو واپس بلایا جائے گا اور اقتدار دوبارہ ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ جنگ کی غیر یقینی صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، کانگریس مرکزی حکومت پر قابض ہو جائے گی اور من مانی کر سکے گی۔ لیکن انگریز حکمرانوں نے کانگریس کے رویے کو غنیمت جانا۔ ان کے نزدیک کانگریس کو واپس بلانا، خانہ جنگی کو دعوت دینا تھا۔ اور جنگ میں ایسی صورت خطرے سے خالی نہ تھی، چنانچہ تمام کانگریسی صوبوں میں گورنر راج نافذ ہو گیا۔ 22 دسمبر 1939ء کو قائداعظم کے ارشاد کے مطابق نہایت جوش و خروش سے یوم نجات منایا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان اور دوسری اقلیتوں کے لیے، کانگریس کا محروم اقتدار ہونا کسی قدر اطمینان کا باعث بنا۔ قائداعظم نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، مسلم لیگ کی تنظیم کو مضبوط بنایا۔ اس کو عوامی جماعت کے رتبے تک پہنچایا اور اسے مکمل طور پر مسلمانانِ ہند کی نمائندہ جماعت بنا دیا۔ ان کی زیر قیادت، مسلم لیگ کو مسلمانوں میں وہی مقبولیت حاصل ہوئی جو کانگریس کو ہندوؤں میں تھی۔ لیگ اس سے پہلے بھی مسلمانوں میں کانگریس کی رابطہ مہم کو ناکام بنا چکی تھی، اپنی سیاسی بیکاری کے زمانے، کانگریسی لیڈر کبھی براہ راست، لیکن اکثر بالواسطہ، وائسرائے پر حصول اقتدار کے لیے زور ڈالتے رہتے تھے۔ لیکن وائسرائے نے (جس کا رویہ قائداعظم اور مسلم لیگ کے طرف کسی لحاظ سے بھی دوستانہ نہیں کہا جا سکتا) تمام ایسی تجویزوں کو ٹھکرا دیا۔ بالآخر کانگریسی لیڈر مایوس ہو گئے اور مناسب موقع کی تلاش کرنے لگے۔

3.2- جنگ کی صورتحال

(الف) ابتدائی دور اور کانگریس:

جنگ کے ابتدائی دنوں میں ہی جرمنی نے پولینڈ کی فوجی قوت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا تھا۔ جون 1940ء میں جرمنی کی فوجوں نے تین ہفتے کے اندر اندر ہالینڈ، بلجیم اور فرانس کو عبرت ناک شکست دے کر مغربی یورپ اور اس کے متصل سمندروں پر اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ یورپ میں مقیم برطانوی فوجیں نہایت بے سروسامانی کی حالت میں، بھاری مالی اور جانی نقصان اٹھانے کے بعد، بموں کی بارش کے نیچے سے گزرتے ہوئے، اپنے وطن کو واپس لوٹیں۔ یہ وقت برطانیہ کے لیے بڑا خطرناک تھا۔ جرمنی کے مقابلے

میں اس کی جنگی تیاری اور عسکری قوت نہ ہونے کے برابر تھی۔ یوں نظر آ رہا تھا کہ اگر فرانس کو شکست دینے کے بعد جرمنی انگلستان پر ہلہ بول دیتا تو اسے انگلستان پر قابض ہونے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔ سر انتھونی ایڈن نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں لکھا ہے کہ ملک میں اسلحہ کی شدید قلت کے پیش نظر ہوم گارڈ کے نوجوانوں کو بندوقوں کی بجائے لکڑی کے ڈنڈوں سے مسلح کیا گیا، گاندھی، جنہوں نے ستمبر 1940ء میں وائسرائے کے روبرو آنسو بہا کر انگلستان کے ساتھ اپنی ہمدردی کا اظہار کیا تھا، اب ذہنی طور پر بالکل بدل چکے تھے۔ انگلستان پر برے دن آئے تو انہوں نے اہل انگلستان کے آگے منصوبوں کے دفتر کھول دیئے اور کہا: کوئی پرواہ نہیں۔ جرمنی سے مت ڈرو۔ دشمن کے آگے ہتھیار ڈال دو۔ جب تمہارے ملک میں داخل ہوں تو عدم تشدد سے ان کا مقابلہ کرو۔ اسی طرح تم اپنی آزادی کی حفاظت کر سکو گے۔ معلوم نہیں کہ گاندھی یا ان کے کسی چیلے نے خود اپنے ملک کے لیے کبھی اس نسخے کو آزمانے کا خیال کیا ہے یا نہیں، کئی سال بعد اکالی سکھ لیڈر تارا سنگھ نے لاہور کے ایک غیر مسلم اخبار میں ایک سلسلۂ مضامین لکھ کر اس بات کا انکشاف کیا کہ جون 1940ء میں انگلستان کی شکست کے بعد برطانوی راج کا خاتمہ صاف نظر آ رہا تھا اور ہم نے لاہور پر بزور شمشیر قبضہ کرنے کے تمام انتظامات مکمل کر رکھے تھے۔

(ب) اگست 1940ء کا اعلان

اس مخدوش حالت میں برطانوی حکومت نے اہل ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانے کے لیے کہ حکومت کو اکثریت کے حوالے نہیں کیا جائے گا، اگست 1940ء میں ایک اعلان کیا جسے عام طور پر August Declaration کہا جاتا ہے۔ اس کا منشا یہ تھا کہ جنگ کے خاتمے پر آئین کے مسئلے کا از سر نو جائزہ لیا جائے گا اور ملک کے اہم اور بڑے عناصر کی خواہشات کے خلاف یہاں کسی حکومت یا آئین کو مسلط نہیں کیا جائے گا۔ اگرچہ اعلان میں قرارداد پاکستان کا اثر صاف نظر آتا ہے لیکن یہ نہ تو مسلمانوں کے لیے آزادی کا پیغام تھا، نہ ہی تقسیم ملک کے اصول کی تائید تھی، صرف مبہم الفاظ میں یہ بتایا گیا تھا کہ بعد از جنگ نیا آئین وضع کرنے میں مسلمانوں کی خواہشات کا احترام کیا جائے گا۔ اس طرح کے اعلان سے برطانوی فوجوں کے شانہ بشانہ لڑنے والے مسلمانوں کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی مقصود تھی۔ لیکن جنگ کا نقشہ انگریزوں کے لیے انتہائی طور پر ناسازگار تھا اور کسی کو اس بات کا یقین نہ تھا کہ برطانیہ اس طرح کے وعدے کرنے کے قابل بھی ہوگا یا نہیں۔ ملک میں بے چینی دن بدن بڑھ رہی تھی، گاندھی دن بہ دن انوکھا طرز گفتگو اختیار کر رہے تھے جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وقت آنے پر وہ حکمرانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ دقتیں پیدا کر دیں گے۔

(ج) روس اور جاپان کی جنگ میں شمولیت

جنگ کا ایک ایک ہفتہ اور ایک ایک مہینہ انگریزوں کے لیے نئی آزمائشوں کا پیغام لاتا تھا۔ انگلستان پر روز بروز جرمن بمبار طیارے آگ برساتے تھے۔ جون 1941ء میں ہٹلر نے امن اور دوستی کے معاہدے کو بالائے طاق رکھ کر اور اپنے ملک کے

مستقبل کو داؤ پر لگاتے ہوئے روس سے ٹکر لے لی۔ جرمنوں کی یہ توقع کہ روس بھی فرانس کی طرح لقمہ تر ثابت ہوگا۔ غلط نکلی۔ کچھ عرصہ تک تو جرمن فوجیں روس میں بلا روک ٹوک بڑھتی گئیں۔ لیکن آخر کار روسی مزاحمت نے جرمنوں کے دانت کھٹے کر دیے اور اس سلسلے میں سٹالن گراڈ کے شہر کا نام زندہ جاوید ہو گیا۔ اس سے جنگ کا خاتمہ دور کی بات ہوگئی۔ دسمبر 1941ء میں امریکہ اور جاپان بھی جنگ میں شامل ہو گئے۔ امریکہ تو برطانیہ کے حلیفوں کی صف میں کھڑا ہو گیا اور جاپان نے جرمنوں کی حمایت کا اعلان کر دیا۔

(د) ہندوستان پر جاپان کے حملے کا خطرہ

جاپان کے جنگ میں کود پڑنے سے جنوب مشرقی ایشیا میں، اتحادیوں کے لیے، جنگ کی صورت نازک ہوگئی۔ بجلی جیسی سرعت کے ساتھ جاپانیوں نے بحرالکاہل میں واقع، وسیع اور زرخیز ملکوں پر قبضہ کر لیا، جلد ہی ان کی جنگی سرگرمیوں کا رخ برما کی طرف مڑ گیا، یہ ملک 1935ء کا قانون پاس ہونے تک برطانوی ہند کا حصہ تھا اور ہندوستان کے صوبوں میں شمار ہوتا تھا۔ برما بھی انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گیا اور جاپانی فوجیں بڑھتے بڑھتے آسام کے دروازوں پر پہنچ گئیں۔ کلکتہ کے شہر پر بھی جاپانیوں نے بمباری کی۔ اندازہ کیا جاتا تھا کہ اگر جاپانیوں نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی تو وہ کسی روک ٹوک کے بغیر ہندوستان کے شمالی حصوں پر قابض ہو جائیں گے۔ ایک طرف تو برطانوی حکومت متوقع حملے کے پیش نظر اخلاء کے منصوبے بنا رہی تھی اور دوسری طرف ہندوستان کی اکثریت کی خوشنودی حاصل کرنے کی خواہاں تھی۔ برطانوی وزیراعظم چرچل، برسوں تک آزادی ہند کے انگریز مخالفوں کی صف اول کے سورما مانے جاتے تھے، لیکن روز افزوں ابتر حالات سے مجبور ہو کر انہوں نے اپنے پرانے سیاسی دشمنوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور سٹیفورڈ کرپس کو چند ایسی تجاویز دے کر بھیجا جن سے کانگریس اور اس کے حواری جماعتوں کا اعتماد حاصل کرنا مقصود تھا۔

3.3- کرپس مشن تجاویز

کرپس لیبر پارٹی کا ایک اہم اور وکالت پیشہ رکن تھا، کانگریس کے تمام اہم لیڈروں کے ساتھ اس کا پرانا دوستانہ تھا۔ یہ اہم مشن اس کے سپرد کرنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ اپنے ذاتی تعلقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، ہندوستان میں برطانیہ کے لیے سازگار فضا پیدا کرے۔ اس نے 22 مارچ 1942ء کو آتے ہی ریڈیو پر اپنی تجاویز کا اعلان کیا۔ بظاہر یہ تجاویز بہت خوشنما تھیں۔

(i) جنگ کے بعد کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ جیسی خودمختاری کا وعدہ تھا۔ اس بات کی تشریح کر دی گئی تھی کہ اگر ملک چاہے تو دولت مشترکہ سے علیحدہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں خودمختار حکومت قائم کرنے سے پہلے انگریز ایک دستور ساز اسمبلی کے ذریعے ملک کا آئین تیار کروائیں گے اور اس آئین کو نافذ کر کے رخصت ہو جائیں گے۔ یہ اسمبلی ترجیحاً متحدہ ہندوستان کے لیے آئین وضع کرے گی لیکن جس صوبے یا جن صوبوں کو یہ آئین قبول نہ ہو وہ وفاق

سے علیحدہ ہو سکتے ہیں بلکہ چاہیں تو اپنی علیحدہ فیڈریشن بنا سکتے ہیں۔

(ii) جنگ کے عرصے کے لیے ایک قومی حکومت بنے گی جو جنگی تیاریوں میں تو مدد دے گی لیکن اس کو جنگی معاملات پر کوئی کنٹرول نہیں ہوگا۔

ان تجاویز سے ہندو پارٹیوں کو خوش کرنا مقصود تھا۔ دولت مشترکہ سے علیحدگی کے اختیار پر گاندھی بے حد زور دیا کرتے تھے۔ ہندوستان کے اتحاد کو برقرار رکھنے کا منصوبہ بھی ہندو فلسفہ سیاست کا جزو اعظم تھا۔ متناسب نمائندگی کا مطلب یہ تھا کہ دستور ساز ادارے میں مسلمان ایک چوتھائی اقلیت میں ہوں گے اور رائے شماری کے وقت ان کا ہر مطالبہ رد کیا جا سکے گا۔ ان تجاویز میں تقسیم ملک کی طرف ایک خفیف سا یہ اشارہ موجود تھا کہ کسی صوبے کو اس کی منشا کے خلاف فیڈریشن میں شریک نہیں کیا جائے گا لیکن اس امر کا فیصلہ کون کرے گا؟ اس کے متعلق اور بہت سے دوسرے سوالوں پر ''تجاویز'' میں کوئی صراحت نہ تھی۔ کرپس نے سب سے اہم پارٹیوں کے نمائندوں سے طویل ملاقاتیں کیں ان کے اعتراضات کے جواب دیے۔ برطانیہ کی نیک نیتی کا یقین دلانے کی کوشش کی۔ چونکہ ان تجاویز کا مقصد محض سیاسی تھا۔ اس لیے ابتدائی مرحلے کے بعد کرپس نے مکمل طور پر کانگریس پر انحصار کرنا شروع کیا اور دوسری جماعتوں کو کم و بیش نظر انداز کر دیا۔ صدر امریکہ کا ذاتی نمائندہ کردل جانسن اس موقع پر دہلی میں موجود تھا۔ وہ ساری کارروائی میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ جواہر لال نہرو اور کرپس کے درمیان نامہ و پیام کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا لیکن ان تمام گفتگوؤں کے سرے چڑھنے کا انحصار اس بات پر تھا کہ جنگ کا رخ کس طرف ہے اور اس میں برطانوی حکمرانوں کی کامیابی کے کیا امکانات ہیں؟

(الف) کانگریس کا ردعمل:

گاندھی کو اس بات کا مکمل یقین تھا کہ انگریز جنگ میں ہار جائیں گے۔ اس لیے جنگ کے دوران اس سے کسی قسم کا عہد و پیمان دینے یا لینے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ان کے اپنے الفاظ یہ تھے کہ آزادی کا یہ پروانہ ایسے چیک کی مانند ہے جو اس بک پر کاٹا گیا ہے جس کا دیوالیہ نکل رہا ہے اور چیک کی ادائیگی کی تاریخ غیر معینہ عرصے کے لیے معرض التوا میں ہے۔ اگرچہ کانگریس کے اندر اہل سیاستدان ایسے بھی تھے جو کرپس تجاویز کو قبول کر لینے کے حق میں تھے لیکن گاندھی کے سامنے کسی کا چراغ نہ جلتا تھا۔ کانگریس نے کرپس پر وعدہ شکنی کا الزام دیتے ہوئے اس کی تجاویز کو رد کر دیا۔ ان قوانین سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کرپس نے دوسری پارٹیوں کے علم کے بغیر کانگریس والوں سے کسی قسم کے خفیہ وعدے کئے تھے۔

(ب) لیگ کا ردعمل

قائداعظم کا رویہ شروع سے ہی ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر تھا۔ ان کا سب سے پہلا اعتراض تو آئین ساز ادارے کی غالب ہندو اکثریت پر تھا۔ لیکن اس سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ کرپس کی تجاویز کے مطابق نیا آئین ترجیحی طور پر ہندوستان کے

لیے بنایا جائے گا۔ تقسیم ملک کا وعدہ مشروط اور مبہم تھا۔ اس کا پورا کرنا اکثریت کے ہاتھ میں تھا۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے لیگ نے بھی کرپس کی تجاویز کو منظور کرنے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔

3.4- اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے کانگریس کا منصوبہ

کرپس کے رخصت ہونے کے بعد گاندھی کے خیالات میں ایک اور تبدیلی آئی۔ جنگ کے پہلے دنوں میں جب تک برطانوی سامراج کو کوئی گزند نہ پہنچا تھا وہ برطانیہ کے ساتھ بھرپور ہمدردی کا اظہار کرتے رہے۔ جوں جوں برطانیہ کی جنگی پوزیشن کمزور ہوتی گئی وہ مخالفت کا پہلو اختیار کرتے گئے۔ شروع میں تو ان کے سُر دھیمے تھے لیکن بات 1941ء کی انفرادی سول نافرمانی سے شروع ہوکر، 1942ء کے اعلان جنگ تک پہنچی۔ اتحادیوں کی بگڑتی ہوئی حالت کو دیکھ کر انہوں نے حکومت پر جبری طور پر قبضہ کرنے کے لیے ایک نیا منصوبہ وضع کیا۔ اس منصوبے کے خدوخال آہستہ آہستہ ان کی تحریروں میں ابھرے۔ دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے لیکن بالغ نظر مبصرین کا اس امر پر اتفاق تھا کہ گاندھی کی نئی مہم بدترین قسم کی موقع پرستی تھی۔ اب وہ حرکت کے لیے بے تاب تھے اور مزید انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ برطانیہ چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں گھرا ہوا تھا۔ جاپانی ہندوستان کے دروازوں پر دستک دے رہے تھے۔ مسلمان اور انگریز دونوں سے نمٹنے کا یہی سنہری موقع تھا۔ چنانچہ 7 اگست 1942ء کو گاندھی کے ایما پر اور اس کی سرکردگی میں ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک شروع ہوگئی۔ گاندھی کا طرز استدلال یہ تھا کہ جاپانی ہندوستان پر صرف اس لیے حملہ کرنا چاہتے ہیں کہ برطانیہ سے برسرپیکار ہیں۔ اگر انگریز اس ملک کو چھوڑ کر چلے جائیں تو جاپانی اس پر قبضہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیں گے۔ یہ طرز فکر محض حقائق کا منہ چڑانے کے مترادف تھا۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہماری جنگ آزادی کا یہ مرحلہ کھلم کھلا بغاوت کا مرحلہ ہے۔ ہمیں بدامنی اور لاقانونیت منظور ہے لیکن موجودہ حکومت قبول نہیں۔ حکومت نے اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے معقول انتظامات کر رکھے تھے۔ کانگریس انتظامیہ کے تمام ممبروں کو حراست میں لے لیا گیا، اس کے فوراً بعد وسیع پیمانے پر غیر قانونی کارروائیاں شروع ہوگئیں۔ سرکاری عمارتوں کو نظر آتش کیا گیا، ٹیلی گراف کی تاریں منقطع کی گئیں۔ سرکاری خزانوں کو لوٹ لیا گیا۔ متوازی حکومتی دفتر کھولے گئے۔ ٹیکسوں کی ادائیگی روک دی گئی غرضیکہ کانگریسی صوبوں میں زندگی کا نظام معطل ہوکر رہ گیا۔ بعد میں حکومت کو کانگریس کے دفاتر سے جو دستاویزات ملیں ان سے معلوم ہوا کہ یہ سب تیاریاں بہت پہلے سے مکمل ہو چکی تھیں۔ معاشرے کے کاروبار کو معمول پر لانے کے لیے چد مہینے لگ گئے۔ اس بغاوت کے مقاصد کیا تھے؟ بظاہر ''ہندوستان چھوڑ دو'' کا نعرہ منصفانہ نظر آتا تھا۔ اگر یہ تحریک کامیاب ہو جاتی تو انگریزوں کے اخراج کے علاوہ، کانگریس کے دیرینہ ارادوں کے مطابق یہاں ایک ایسی ''قومی حکومت'' قائم ہو جاتی جس میں مسلمانوں کا کوئی مقام نہ ہوتا اور حصول پاکستان کے سلسلے میں جو کچھ ہو چکا تھا وہ ملیا میٹ ہو جاتا اور پاکستان کا وجود میں آنے کا مسئلہ ہی ختم ہو جاتا۔ اس لیے

قائداعظم نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک کی پرزور مخالفت کی اور اپنے موقف کو ثابت کیا۔ انہوں نے انگریزوں کو یہ مشورہ دیا کہ ملک کو ''پہلے تقسیم کرو اور پھر اسے چھوڑ دو''۔

3.5- الزام اور جوابی الزام

اس محل سرائے سے جسے گاندھی کا جیل خانہ کہا جاتا تھا گاندھی نے وائسرائے کے ساتھ متنازعہ فیہ معاملات پر مراسلات کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا جس میں تباہی کی ساری ذمہ داری حکومت کی انتظامی مشینری پر ڈال دی۔ وائسرائے نے اس یک طرفہ فیصلہ سے شدید اختلاف کیا۔ جنگ جاری رہی۔ کانگریس کے بہت اہم لیڈر زندان میں تھے کہ وائسرائے لن لیتھ گو کی جگہ 20 اکتوبر 1942ء کو کمانڈر انچیف ویول نے سنبھال لی۔ گاندھی نے اسے بھی کانگریس کی اصول پرستی اور بے گناہی کا یقین دلانے کی کوشش کی لیکن ویول نے اس عذر کو سننے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ پہلے اپنی خطا کا اعتراف کرو، آئندہ کے لیے اچھے چلن کا وعدہ کرو اور پھر ہمارے ساتھ گفت وشنید کا آغاز کرو۔

3.6- قائداعظم سے گاندھی کی ملاقاتیں

سیاسی میدان سے کانگریس کی اس طویل غیر حاضری سے خود تو کانگریس کو کوئی نقصان نہ ہوا کیونکہ اس کو ہندوؤں کی تائید حاصل تھی البتہ مسلم لیگ کی پوزیشن مستحکم ہوئی اور دوست دشمن اس کی نمائندہ حیثیت کو تسلیم کرنے لگے۔ برطانیہ کو بھی روز بروز اس کا احساس ہو رہا تھا متوازن ذہن رکھنے والے کانگریسی حلقے میں بھی پاکستان کے مطالبے کو حق بجانب قرار دیا جا رہا تھا۔ 1942ء کے آغاز میں یعنی ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک سے چند مہینے پہلے مدراسی لیڈر راج گوپال اچاریہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ پاکستان کا قیام ناگزیر ہے۔ اس حق گوئی کی پاداش میں گاندھی نے اس کو جی بھر کر کوسا اور کانگریسی حلقوں میں ذلیل کرنے کی مہم شروع کر دی۔ لیکن وہ اس سے نہیں دبے بلکہ انہوں نے تقسیم ملک کے لیے ایک فارمولا بھی وضع کر لیا جس کو عام طور پر راج گوپال اچاریہ فارمولا کہا جاتا تھا۔ 1944ء میں حکومت نے کچھ گاندھی کی ناسازی طبیعت اور کچھ ان کی اہلیہ کی وفات کی وجہ سے ان کو رہا کر دیا۔ شاید یہ وجہ بھی ہو کہ اب جنگ کا پانسہ برطانیہ کے حق میں پلٹ چکا تھا۔ رہائی کے بعد قائداعظم کے ساتھ ان کی طویل ملاقاتیں ہوئیں جو دو ہفتے سے اوپر جاری رہیں۔ اس گفتگو میں قرارداد پاکستان پر تفصیلی بحث ہوئی بعد میں جو کچھ ان دونوں رہنماؤں کی باہمی خط وکتابت کے شائع ہونے بعد معلوم ہوا وہ یوں تھا: گاندھی کا خیال تھا کہ قرارداد مبہم اور تفصیل طلب ہے۔ راج گوپال اچاریہ فارمولا نے اسے بامعنی اور کارآمد بنا دیا ہے۔ ہندو اور مسلمان ایک ہی ہندی قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور مذہب کا اختلاف ان کی ہندی قومیت کو باطل نہیں کرتا اگر ملک کو تقسیم کرنا لازمی ٹھہرے تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان فوج، مواصلات اور خارجہ معاملات مشترک رہیں گے۔ تقسیم ملک انگریزوں کے جانے کے بعد عمل میں آئے۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں یہ تمام نکات

قائداعظم کے لیے نا قابل قبول تھے۔ گاندھی نے خود اپنی ایک چٹھی میں لکھا کہ ہماری گفتگو ایسے دو متوازی خطوط کی طرح آگے بڑھتی رہی جو ایک دوسرے سے قطعی طور پر نہیں مل سکتے تھے۔ اگر ساری گفتگو کا حاصل صرف یہی تھا تو معلوم نہیں اس پر کیوں اتنا وقت صرف کیا گیا شاید گاندھی اپنی وسیع النظری دکھا کر رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنا چاہتے تھے۔

3.7- ویول تجاویز

1945ء کے آغاز میں جنگ کا خاتمہ صاف نظر آ رہا تھا۔ جاپان کی قوت پر تو ابھی تک کوئی مہلک ضرب نہیں لگی تھی البتہ جرمنی جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا تھا اور اس کے ابھرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ ویول اپنے دل میں آئندہ کے متعلق منصوبے مرتب کر رہا تھا وہ سمجھتا تھا کہ جنگ کے اختتام پر بہت سے حل طلب مسائل جمع ہو جائیں گے اور ان سب سے بیک وقت عہدہ برآ ہونا ممکن نہ ہوگا، اس نے ہوم ورک کی ٹھانی اور قومی حکومت کے گھڑے مردے نکال کر زندہ کرنے کی کوشش کی۔ اسمبلی میں کانگریس اور لیگ کے لیڈروں کی بیان کردہ افہام و تفہیم سے مرکزی حکومت کی تشکیل نو کے متعلق تجویزیں مرتب ہوئیں۔ ان کو ساتھ لے کر ویول انگلستان گیا اور برطانوی حکومت کی منظوری حاصل کرنے کے بعد واپس آتے ہی اس نے 27 مئی کو ان تجاویز کا ریڈیو پر اعلان کیا۔

3.8- شملہ کانفرنس

ان تجاویز کی منظوری کے لیے اس نے شملہ کے مقام پر ایک سیاسی کانفرنس طلب کی، تجاویز کی جزئیات پر بحث کا موقع نہیں، بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ مجوزہ حکومت کے مسلمان ارکان کس کی نمائندگی کریں گے۔ کانگریس سارے ملک کی نمائندہ ہونے کی دعوے دار تھی اور مجوزہ حکومت کے پانچ مسلمان ارکان میں سے دو نشستوں پر کانگریسی مسلمانوں کو نمائندگی دلوانا چاہتی تھی، ویول پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کا سرپرست ہونے کی حیثیت سے ایک یونینسٹ مسلمان کی نمائندگی اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔ باقی دو مسلمان لیگ کی نمائندگی کر سکتے تھے۔ قائداعظم کو اس طریق کار سے شدید اختلاف تھا۔ گزشتہ آٹھ سالوں کے ضمنی انتخابات کے نتائج سے یہ بات بالکل ثابت تھی کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ ویول کی نیت بھی صاف نہ تھی وہ ایک طرف تو کانگریس کی خوشامد میں مصروف تھا، دوسری طرف پنجاب کی یونینسٹ پارٹی جس کا وجود بھی متنازعہ تھا اور جو لیگ سے 1944ء میں بغاوت کر چکی تھی لیگ کے مقابلے میں کھڑا کر رہا تھا۔ کانفرنس ناکام ہوئی ویول نے جائز طور پر اس کی ناکامی کا ذمہ اپنے سر پر لیا۔ اس کانفرنس کا مثبت نتیجہ نکلا کہ ملک میں عمومی انتخاب کرانے کا فیصلہ ہوا تاکہ مختلف سیاسی جماعتوں کی نمائندگی کے دعویداروں کا امتحان ہو سکے۔ انہی دنوں ایٹم بم کے سامنے اپنے آپ کو بے بس پاتے ہوئے جاپان نے غیر مشروط طور پر شکست مان لی۔

3.9- 1945-46ء کے انتخابات

انتخابات 1945ء کے موسم سرما میں شروع ہوئے اور 1946ء کے آغاز میں ختم ہوئے۔ ان سے دو باتیں ثابت ہوئیں: اول لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور دوئم برصغیر کے مسلمان تقسیم ملک چاہتے ہیں۔ 1945ء کے وسط میں برطانیہ کے عمومی انتخابات میں لیبر پارٹی کو پہلی دفعہ پارلیمینٹ میں فیصلہ کن اکثریت حاصل ہوگئی اس کے پروگرام میں ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ بہت اہم بتایا جاتا تھا۔ یوں بھی لیبر پارٹی والوں کی کانگریس کے لیڈروں سے بہت اچھے مراسم تھے۔ لیبر پارٹی کے برسر اقتدار آنے سے کانگریس کے حوصلے اور بھی بڑھے۔ جواہر لال نہرو کو سخن سازی کا فن تو آتا ہی تھا، انہوں نے نہایت دیدہ دلیری سے کہنا شروع کیا کہ مسلمانوں کی رائے کی کوئی حیثیت نہیں لیکن حقیقت یہ تھی کہ الیکشن سے مسئلے کے تمام الجھاؤ ختم ہو چکے تھے۔ ملک میں دو ہی پارٹیاں تھیں کانگریس اور مسلم لیگ۔ کانگریس ملک کو متحد رکھ کر اکثریت کی حکومت قائم کرنا چاہتی تھی لیگ مسلم اکثریت کے علاقوں کو پاکستان میں تبدیل کرنا چاہتی تھی۔

3.10- کابینہ مشن

مارچ 1946ء میں برطانیہ کی لیبر حکومت نے تین وزراء (کرپس، پیتھک لارنس اور اے وی الیگزینڈر) پر مشتمل ایک مشن ہندوستان کو بھیجا تا کہ دونوں پارٹیوں کے درمیان افہام وتفہیم کی کوئی راہ نکلے، کرپس اور لارنس دونوں کانگریس کے خیر خواہ تھے۔ 1942ء میں کرپس کی تجاویز کے سلسلے میں برطانوی حکومت نے ایک غلطی یہ کی تھی کہ گفت وشنید کے تمام اختیارات کلی طور پر کرپس کے سپرد کر دیے تھے اور وائسرائے ان سے بالکل بے تعلق تھا۔ اس لیے وہ پس پردہ بیٹھ کر تاریں ہلاتا تھا اب کے وائسرائے ویول کو بھی اس مشن میں باقاعدہ طور پر شامل کر لیا گیا تھا اس لیے اس مشن کے متعلق اس کی چھپی ہوئی ڈائری میں بہت سی کام کی اطلاعات مل جاتی ہیں۔ مشن نے حسب معمول اپنی کارروائی کا آغاز پارٹی لیڈروں کی ملاقاتوں سے کیا۔ دو مہینے کے اندر ان پر حقیقت واضح ہوگئی۔ ایک طرف تو برصغیر کے مسلمانوں میں پورا پورا اتحاد تھا۔ قائداعظم کی قیادت مسلم تھی اور مسلمانوں کے حق خودارادیت کے متعلق کوئی اختلاف نہ تھا۔ دوسری طرف کانگریس کو ہندو رائے عامہ کی پوری پوری تائید حاصل تھی اور تقسیم ملک کے بارے میں اس کا رویہ بے لچک تھا، ان دو نقطہ ہائے نظر میں رابطہ پیدا کرنا مشکل تھا۔

(الف) مشن کی تجاویز

بہت غور وفکر کے بعد مشن نے 16 مئی 1916ء کو اپنی سکیم کا اعلان کیا جس میں تقسیم ملک کو ٹالنے کی خاطر ایک محدود اختیارات رکھنے والی ایسی مرکزی حکومت کی سفارش کی گئی تھی جو صرف دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کی نگرانی کرے۔ مرکز تو بہر حال اکثریت کی تحویل میں رہنا ہی تھا اسی لیے اسے دانستہ طور پر کمزور بنایا گیا تھا تا کہ یہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہو سکے اور مرکز سے

نچلی سطح پر ایک دومنزلہ وفاق قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ اس مقصد کے لیے گیارہ صوبوں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

☆ ایک گروپ میں مسلم اکثریت کے شمال مغربی صوبے یعنی پنجاب، سندھ سرحد اور بلوچستان

☆ دوسرے گروپ میں مسلم اکثریت کے شمال مشرقی صوبے یعنی آسام اور بنگال

☆ تیسرے گروپ میں ہندو اکثریت کے باقی ماندہ چھ صوبے

مجوزہ انتظام یہ تھا کہ ہر صوبے کی اپنی حکومت ہوگی اس کے اوپر ہر گروپ کی حکومت ہوگی اور سب سے اوپر یونین کی محدود حکومت ہوگی جس کا ذکر بھی کیا جا چکا ہے۔ غالباً مشن کا مقصد یہ تھا کہ گروپوں کی حکومتیں بہت بااختیار ہوں گی اور اس طرح اکثریت کے منطقوں کو دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کو چھوڑ کر باقی تمام معاملوں میں کلی اختیار ہوگا۔

دستور سازی کے لیے ایک دستور ساز اسمبلی کا انتخاب ہونا تھا جس کو علیحدہ علیحدہ گروپوں میں بیٹھ کر صوبائی دستور نیز گروپوں کے دستور بنانے تھے۔ مشن کی کا ایک حصہ یہ تھا۔

دوسرا حصہ یہ تھا کہ عبوری دور کے لیے ایک ایسی نمائندہ حکومت بنائی جائے گی جس میں بڑی بڑی پارٹیوں کے ساتھ اقلیتیں بھی شامل ہوں گی۔

ایک اہم شق یہ بھی تھی کہ دس سال کے عرصے کے بعد کوئی گروپ چاہے تو وہ انڈین یونین سے علیحدگی اختیار کر سکتا ہے۔

مشن کا اصرار یہ تھا کہ اس سکیم کے دونوں حصے باہم مربوط ہیں اس لیے دونوں کو قبول یا دونوں کو نامنظور کرنا ہے۔ جو پارٹی اسے نامنظور کرے گی اسے نظر انداز کر کے تعاون کرنے والی پارٹی کی مدد سے عبوری حکومت کی تشکیل کی جائے۔

(ب) مشن کی تجاویز کا حشر

دونوں کیمپوں میں مفصل بحثوں کے بعد کانگریس نے سکیم کا پہلا یعنی دستور سازی کا حصہ منظور کر لیا لیکن عبوری حکومت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ مسلم لیگ نے دونوں حصوں کی توثیق کر دی لیکن قبولیت کی وجہ یہ بتائی کہ صوبوں کی گروپنگ سے مسلمانوں کے حق خود ارادیت کو فوری طور پر بروئے کار لایا جا سکے گا اور اس سکیم کے اندر رہتے ہوئے دس سال کے اندر اندر پاکستان بن جائے گا۔

چاہئے تو یہ تھا کہ اپنے موقف کے مطابق، مشن کے ارکان کانگریس کو نظر انداز کر کے لیگ کو عبوری حکومت بنانے کی دعوت دیتے لیکن وہ اپنے وعدے سے پھر گئے۔

کانگریس نے سکیم کے پہلے حصے کی جو لنگڑی لولی منظوری دی تھی وہ اس طرح واپس لے لی گئی کہ جواہر لال نہرو نے اعلان کیا کہ گروپنگ کو مشن کی سکیم کا لازمی جزو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ کسی صوبے کو اس کے مقررہ گروپ میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ نیز دستور ساز اسمبلی ایک خود مختار ادارہ ہے۔ اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ساری

کی ساری سکیم مشروط تھی۔ اگر کانگریس کی اس توضیح کو مان لیا جاتا تو مسلمان کا حق خود ارادیت ساقط ہو جاتا اور دستور ساز اسمبلی کانگریس انتظامیہ کی تابع مہمل بن کر رہ جاتی۔ اس پر لیگی حلقوں میں شدید ردعمل ہوا اور لیگ نے بھی مشن کی سکیم پر از سر نو غور کرنے کے بعد اور مشن کی وعدہ خلافی پر احتجاج کرتے ہوئے اپنی منظوری واپس لے لی اور 16 اگست کا دن ڈائریکٹ ایکشن ڈے مقرر کیا۔ جون کے آخر میں مشن کے ارکان انگلستان واپس چلے گئے۔ انہوں نے گفت وشنید کے جو طریقے اختیار کئے تھے ان سے کانگریس اور لیگ کے اختلافات شدید تر ہو گئے۔ برطانوی حکومت کے خلاف مسلمانوں کی ناراضگی بہت بڑھی لیکن دستور ساز اسمبلی کے انتخابات بہت جلدی ہو گئے۔

3.11- عبوری حکومت اور اس کی ناکامی

کابینہ مشن کی روانگی کے بعد وائسرائے نے عبوری حکومت بنانے کی کوشش از سر نو کر دی۔ اس کی ڈائری کے بعض اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ لیبر گورنمنٹ اس سے اس لیے ناراض تھی کہ وہ سارا اقتدار کانگریس کے حوالے کرنے میں معترض تھا۔ وہ نہرو اور گاندھی کے ہتھکنڈوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس نے ایک انٹرویو میں ان دونوں کو یہ ڈانٹ پلائی: ''تم مجھے پیچ در پیچ قانونی موشگافیوں میں مت الجھاؤ۔ بلکہ دیانت دار آدمیوں کی طرح مجھ سے گفتگو کرو'' اسے پاکستان کے معاملے میں مسلمانوں کے شدید جذبات کا علم تھا۔ وہ کانگریس اور لیگ دونوں کے بین بین چلنا چاہتا تھا لیکن اپنے آقاؤں کی خواہشات کے سامنے بے بس تھا۔ چنانچہ اس نے دو ستمبر 1946ء کو کانگریس کے نامزد ارکان کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ وقت نہایت نازک تھا۔ 16 اگست کو ڈائریکٹ ایکشن ڈے کے موقع پر کلکتہ میں ہولناک فسادات ہو چکے تھے جن میں ہندوؤں نے دل کھول کر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی تھی۔ مسلمانوں نے دو ستمبر کو یوم احتجاج منایا۔ ویول لیگ کو بھی حکومت میں شریک کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ خانہ جنگی کا فوری خطرہ سر پر سوار تھا۔ آخر وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوا اور لیگ بھی حکومت میں آ گئی۔ کانگریس نے تمام اہم محکمے اپنے پاس رکھے اور لیگ کے پاس صرف مالیات کا محکمہ جانے دیا۔ خیال یہ تھا کہ مسلمان حساب کتاب میں کمزور ہوتے ہیں اس لیے مالیات کا محکمہ لیگ کے نمائندے سے نہیں چل سکے گا۔ یہ عبوری حکومت جس میں لیگ اور کانگریس دونوں شامل تھیں، بالکل بے کار ثابت ہوئیں، اس کے کسی اجلاس میں کسی مسئلے پر اتفاق رائے نہیں ہو سکتا تھا اور ہر میٹنگ تو تو میں میں پر ختم ہوتی تھی۔ معاملات پر حکومت کی گرفت کمزور سے کمزور تر ہو رہی تھی، بہار، مشرقی بنگال اور یو پی میں ہولناک فرقہ ورانہ فسادات ہوئے۔ مرکزی حکومت کے کانگریسی ارکان ہندو فسادیوں کی حوصلہ افزائی کرتے اور ان کے جرائم سے پردہ پوشی کرتے تھے۔ لیگی ممبر جواہر لال نہرو کو سربراہ حکومت تسلیم کرنے سے انکاری تھے۔

3.12- کانگریس لیگ اختلافات

برطانوی حکومت کا فیصلہ

سب سے اہم اختلاف صوبوں کی گروپنگ کے متعلق تھا۔ مسلمانوں کا حق خود اختیاری گروپنگ سکیم کی بنیاد پر قائم تھا۔

اگر گروپنگ کو ختم کر دیا جائے تو مسلمانوں کے نقطہ نظر سے ساری سکیم بے کار ہو جاتی تھی۔ کانگریس گروپنگ کو صوبوں کے لیے اختیاری قرار دیتی تھی۔ اس کا اصرار یہ بھی تھا کہ مسلم لیگ ان کی طے کی ہوئی شرائط کے ماتحت دستور ساز اسمبلی میں داخل ہو ورنہ حکومت سے مستعفی ہو جائے۔ آخر کار برطانوی حکومت، جو کئی مہینے اس بحث کو تماشائی کی حیثیت سے دیکھتی رہی تھی، حرکت میں آ گئی اور اس نے لنڈن میں لیڈروں کی ایک کانفرنس طلب کر کے یہ فیصلہ دیا کہ گروپنگ لازمی ہے، اختیاری نہیں۔ اس فیصلے سے کانگریس کے عزائم پر اوس پڑ گئی۔ لیکن دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شروع ہو گیا جس میں لیگ نے شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ اس سے پاکستان کا حصول یقینی بن گیا۔ عبوری حکومت کے اندرونی اختلافات سالانہ بجٹ کے موقع پر کھل کر سامنے گئے۔ وزیر خزانہ لیاقت علی خان کی نگرانی میں جو میزانیہ تیار ہوا اس میں صنعت کاروں اور تاجروں پر بھاری ٹیکس لگائے گئے۔ آج کل کے مقابلے میں تو یہ ٹیکس معمولی تھے لیکن ان دنوں کے معیار سے ان کو بھاری سمجھا جاتا تھا۔ بات یہ تھی کہ دوران جنگ کی صنعتی ترقی سے بے شمار لوگوں نے بے اندازہ دولت کمائی تھی۔ وہ مختلف حیلوں اور بہانوں سے حکومت کو دھوکہ دیتے تھے اور سرکاری واجبات کو روک لیتے تھے۔ بجٹ میں ایسے نادہندہ ٹیکس گزاروں کا جو زیادہ تر ہندو تھے، اچھی طرح تدارک کیا گیا تھا۔ حکومت کے ہندو ارکان اس بات کو لے اٹھے کہ یہ بجٹ ایک انتقامی بجٹ ہے۔ حالانکہ معاملہ اصلاحی اور انتظامی نوعیت کا تھا۔ اس سے ہندوؤں کو مسلم لیگ کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے کے لیے ایک اور ہتھیار مل گیا، آخر کار ''کچھ دو اور کچھ لو'' کے اصول پر حکومت کے دونوں دھڑوں میں مفاہمت ہو گئی۔ عبوری حکومت کا کھوکھلا پن ظاہر ہو گیا اس کا ناکام تجربہ قیام پاکستان کے ساتھ ختم ہو گیا۔

3.13- خود آزمائی نمبر 3

سوال نمبر 7 دوسری جنگ عظیم کے اسباب بیان کریں۔

سوال نمبر 8 کرپس تجاویز کیا تھیں نیز ان تجاویز پر مسلم لیگ اور کانگریس کا ردعمل کیا تھا، تفصیل بیان کریں۔

سوال نمبر 9 ویول کی تجاویز اور شملہ کانفرنس کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

(جواب کا تجزیہ 3.7 اور 3.8 کی روشنی میں کیجئے)

سوال نمبر 10 کابینہ مشن کی تجاویز کیا تھیں؟ مشن کیوں ناکام ہوا؟ لیگ کانگریس اختلاف پر حکومت برطانیہ کا فیصلہ کیا تھا؟

(جواب کا موازنہ 3.10 اور 3.12 سے کیجئے)

4- انتقال اقتدار

4.1- تمہید

دو ستمبر 1946ء کو جواہر لال نہرو کی سرکردگی میں عبوری حکومت قائم ہو چکی تھی چند ہفتے کے بعد لیگ بھی اس میں شریک ہوگئی لیکن اس مشترکہ حکومت سے کوئی اچھے نتائج برآمد نہ ہوئے بلکہ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ فساد اور تشدد کے واقعات روزمرہ کا معمول بن گئے۔ دسمبر 1946ء میں برطانوی حکومت نے اس امر کا فیصلہ کر دیا وہ صوبوں کی گروپ بندی، کیبنٹ مشن کی سکیم کا لازمی جزو ہے اس فیصلے کے فوراً بعد ہی کانگریس نے دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شروع کرا دیا لیکن وہ اپنے اس موقف پر پہلے کی طرح قائم رہی کہ ہر صوبے کو اپنے گروپ میں شامل ہونے یا نہ ہونے کی پوری آزادی ہے۔

4.2- لیبر حکومت اور وائسرائے ویول

1946ء کے آغاز میں حالات اس طرح تھے، جنگ نے برطانیہ کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی اب اس کے لیے ہندوستان پر قبضہ رکھنا مشکل تھا۔ ملک میں لیبر پارٹی کی حکومت برسر اقتدار تھی، اس کے سربراہ ایٹیلی، سائمن کمیشن کے ممبر رہ چکے تھے اور پارٹی میں ہندوستان کے معاملات میں ایکسپرٹ سمجھے جاتے تھے۔ پتھک لارنس اور سر سٹیفورڈ کرپس اس جماعت کے صف اول کے رہنماؤں میں شمار کئے جاتے تھے۔ کانگریس والوں کے ساتھ ان کا پرانا دوستانہ تھا اور دونوں کے درمیان اکثر نامہ و پیام ہوتے رہتے تھے وہ کانگریس کے بہت سے ناواجب مطالبات کی ڈٹ کر تائید کرتے اور وقت پر اپنے سب وعدوں سے پھر جاتے تھے، ان سے ہو سکتا تو ملک کی حکومت اکثریت کے سپرد کر کے ایک طرف ہو جاتے۔ ان دونوں لیگ کو مسلمانوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی ویول ہندوستان کا وائسرائے تھا وہ اپنے ذاتی تعصّبات تو رکھتا تھا لیکن یہاں کے حالات سے بخوبی واقف تھا، اسے بہت اچھی طرح معلوم تھا کہ ملک کے اندر رائے عامہ کی کیا کیفیت ہے اور مختلف پارٹیوں کو کتنی کتنی قوت حاصل ہے وہ اس بات کو بھی دیکھ چکا تھا کہ کانگریس کے لیڈر کسی نکتے پر بھی لیگ سے سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں کیونکہ ان کا مقصد حالات کو سلجھانا نہیں بلکہ الجھانا تھا، اگر اس سے بن پڑتا تو وہ کانگریس کو اس کے جائز مقام پر رکھتا اور اس کی ناز برداری نہ کرتا لیکن آخر کار وہ برطانوی حکومت کا ایجنٹ اور اپنے آقاؤں کا حکم بردار تھا اگر وہ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے کوئی منصفانہ فیصلہ کرنا چاہتا تو اسے لندن سے ڈانٹ پڑتی اس لیے اس کی قوت فیصلہ مفلوج ہو چکی تھی، اس بارے میں اس پر الزام دینا درست نہیں۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو وہ بھی اپنے آپ کو انہی حالات کے شکنجے میں کسا ہوا محسوس کرتا۔ اپنے طور پر برطانوی حکومت، کانگریسی لیڈروں کی خواہش کے مطابق ویول کو واپس بلانے کا فیصلہ تو دسمبر 1946ء میں ہی کر چکی تھی لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر اس فیصلے کو انتہائی راز میں رکھا گیا تھا اور

دو مہینے کے بعد 20 فروری 1947ء کو اس کا اعلان ہوا۔

4.3- 20 فروری 1947ء کا اعلان

اسی اعلان میں برطانوی حکومت کے دو اور فیصلے بھی منظر عام پر آئے: اول برصغیر کی حکومت سے برطانیہ جون 1948ء میں قطعی طور پر دست بردار ہو جائے گا۔ دوم کسی اقلیت کو یہ حق نہیں دیا جائے گا کہ اکثریت کے فیصلوں کے خلاف اپنی رائے منوا سکے۔ اس اعلان پر کسی لمبی چوڑی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں ویول کی واپسی، کانگریس کے رہنماؤں کی منشا کے عین مطابق تھی اور ان کی سفارش پر عمل میں آئی تھی، ویول نے بجا طور پر اس کو اپنی برطرفی سمجھا، برصغیر کی حکومت سے دست برداری کا فیصلہ تو 1942ء میں ہوا چکا تھا لیکن برطانیہ نے حتمی تاریخ کا تعین پہلی بار کیا۔ اقلیتوں کو اکثریت کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کی پالیسی نئی تو نہ تھی لیکن اس کا واشگاف اقرار 20 فروری کے بیان میں ہی کیا گیا۔ گزشتہ کئی سالوں سے برطانیہ کے نمائندے یہ تکرار کر چکے تھے کہ آبادی کے ''اہم عناصر'' کی مرضی کے خلاف کوئی آئین یا کوئی حکومت مسلط نہیں کی جائے گی لیکن اب اس اصول کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ اعلان کا اصل مقصد یہ بتایا تھا کہ آئندہ کے لیے برطانوی حکومت، ہندوستان کی ہندو اکثریت کی مرضی کے تابع ہوگی اور اسی کی خواہشات کے مطابق انتقال اقتدار عمل میں آئے گا۔ جواہر لال نہرو اور کانگریس کے دوسرے رہنماؤں نے ایٹلی پر تحسین کے پھول برسائے۔ نئی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کا کام ویول سے نہیں لیا جا سکتا تھا اس کام کے لیے ماؤنٹ بیٹن کو منتخب کیا گیا۔

4.4- ماؤنٹ بیٹن، اس کے مشیر اور اختیارات

ماؤنٹ بیٹن کی عمر اس وقت 46 برس تھی ۔ وہ انگلستان کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران وہ جنوب مشرقی ایشیا میں اتحادی فوجوں کا سپریم کمانڈر رہ چکا تھا۔ اپنے فرائض کی بجا آوری میں وہ اکثر دہلی آتا جاتا رہتا تھا۔ یہاں کے حالات کا اپنے نقطۂ نظر سے تجزیہ کر سکتا تھا اور حکومت ہندوستان کے اعلیٰ ترین افسروں سے واقفیت پیدا کر سکتا تھا۔ یہاں آنے سے کچھ عرصے پہلے وہ سنگاپور میں نہرو سے ملاقات کر کے اس کی میزبانی کر چکا تھا اور اس نے حکومت ہند کی خواہشات کے خلاف نہرو کو سنگاپور میں تقریر کی آزادی دے دی تھی۔ اس سے دونوں کے درمیان دوستی کا آغاز ہو چکا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ماؤنٹ بیٹن ایک خودسر انسان تھا۔ زبان سے تو وہ جمہوریت کا دم بھرتا تھا لیکن عملاً اس کی طبیعت میں بدترین قسم کی آمریت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی وہ باتیں بنانے کا فن جانتا تھا اور لوگوں کو اپنی دلکش گفتگو سے موہ لینے کی کوشش کرتا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ وائسرائے کا کثیر ذاتی سٹاف اس کی شاہانہ ضروریات کے لیے ناکافی ہوگا وہ انگلستان سے اپنے ساتھ مشیروں اور مداحوں کی ایک فوج لے کر آیا۔ ان میں سے دو کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

اول: لارڈ اسمے جو دوران جنگ برطانیہ کا چیف آف سٹاف رہ چکا تھا۔ اس نے آتے ہی اس بات پر اظہار اطمینان کیا کہ ماؤنٹ بیٹن کی ہندونوازی کے متعلق یہاں کے مسلمانوں کو کوئی علم نہ تھا۔

دوسرے شخص کا نام کیمپبل جانسن تھا جو اس کا تعلقات عامہ کا انچارج تھا۔

ماؤنٹ بیٹن نے آتے ہی وی پی مینن کو بھی اپنے مشیروں میں شامل کرلیا۔ مینن کہنے کو تو سرکاری ملازم اور عہدے کے لحاظ سے حکومت ہند کا دستوری مشیر تھا، لیکن ولبھ بھائی پٹیل کے ساتھ اس کے تعلقات گہرے تھے۔ وہ حکومت کے اندر ہوتے ہوئے کانگریس جاسوس اور وائسرائے کے روبرو کانگریس کا ترجمان بن گیا۔

ماؤنٹ بیٹن کو اسے برطانوی لیبر حکومت کی طرف سے سب سے اہم ہدایت یہی ملی تھی کہ وہ پاکستان کے مطالبے کو غیر مؤثر بنا کر رکھ دے اور ملک کی تقسیم ہونے سے روک دے۔

شاید یہ کہنا بھی زیادتی نہ ہو کہ اسے برطانوی حکومت کی طرف سے کوئی ہدایت بھی ملی تھی اصل بات یہ تھی کہ جو ہدایات اسے دی گئی تھیں وہ سب کی سی اس کی خود تجویز کردہ تھیں۔ سادہ الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ انتقال اقتدار کے لیے لیبر حکومت کی پالیسی ماؤنٹ بیٹن کے مشورے پر ہی وقع کی گئی تھی اور اس پر عمل درآمد کرانے کا کام بھی اس کے ذمے لگایا گیا تھا۔ آنے سے پہلے ماؤنٹ بیٹن نے حکومت پر یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ میں موقع پر تمام فیصلے خود کروں گا اور برطانوی حکومت کو ان میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہوگا۔

اس نوعیت کے وسیع اختیارات ماؤنٹ بیٹن سے پہلے کسی وائسرائے کو حاصل نہیں ہوتے تھے۔ اپنے عہدے کے فرائض کی بجا آوری میں وہ اپنے آپ کو کسی کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتا تھا اور اس کا طرز عمل بہت حد تک غیر ذمہ دارانہ تھا۔

4.5- ماؤنٹ بیٹن کا طریقہ کار

(الف) لیڈروں سے ملاقاتیں: 22 مارچ 1947ء کو یہاں پہنچتے ہی ماؤنٹ بیٹن نے اہل سیاست سے گفت وشنید کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ کانگریسی لیڈروں کو بہت زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ ان کی باری پہلے آئی۔ قائداعظم کے ساتھ اس کی پہلی ملاقات اس کی آمد کے چودہ دن بعد ہوئی۔ ماؤنٹ بیٹن کو اپنی کامیابی کا بہت یقین تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں اپنی منطق اور اپنی ذاتی جاذبیت سے مطالبہ پاکستان کو ختم کر دوں گا۔ لیکن قائداعظم کے ساتھ پہلی ملاقات میں اس کی خوش فہمی رفع ہوگئی۔ برسوں بعد اس نے ایک پبلک جلسے میں بتایا کہ میں متحد ہندوستان کے مستقبل کے متعلق پورا پرامید تھا لیکن اس ملاقات میں ہی میرا یقین متزلزل ہوگیا۔ ماؤنٹ بیٹن کے خواہوں اور مداحوں نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کانگریس کا بے حد طرف دار تھا اور اسے قائداعظم کے ساتھ دلی بغض تھا۔ جلد ہی اس کو معلوم ہوگیا کہ ملک

کی تقسیم ناگزیر ہے۔ کانگریس نے بھی یہی بات محسوس کرتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن کی آمد سے چند دن پہلے بنگال اور پنجاب کے صوبوں کی تقسیم کے حق میں قرارداد پاس کر دی تھی۔

ماؤنٹ بیٹن نے فی الفور محسوس کر لیا کہ کانگریس کے لیڈر بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں۔ گاندھی نے اپنی سیاسی پٹاری سے ایک فرسودہ تجویز نکالی کہ ملک متحد رہے اور قائداعظم کو اس کا وزیراعظم مقرر کر دیا جائے۔ جواہر لال نہرو نہایت جوش وخروش کے ساتھ اکھنڈ بھارت کا نعرہ لگا رہے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم والی قرارداد سے ملک کی تقسیم کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ پٹیل اپنے دل میں تقسیم ملک کے قائل ہو چکے تھے لیکن کبھی کبھار اپنی پارٹی کی دلجوئی کے لیے قیام پاکستان کے خلاف بیان داغ دیتے تھے۔ نہرو کی مدد سے ماؤنٹ بیٹن نے سب سے پہلے گاندھی کی مہم اور پریشان کن بیان بازیوں کو بند کرایا۔ ساتھ ہی نہرو کو تقسیم ملک کے حق میں ہموار کرنے کی کوشش کی۔ نہرو بھی اپنی ہٹ کے پکے تھے انہوں نے کہا کہ تقسیم کی تجویز حکومت کی طرف سے پیش ہونا چاہئے۔ ہم اسے مان لیں گے لیکن اپنی زبان سے ہم تقسیم کا مطالبہ نہیں کریں گے۔

(ب) ماؤنٹ بیٹن کی پہلی سکیم: اس مہم سے فراغت کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے آزادی ہند کی ایک سکیم مرتب کی اور اس کی تفصیلات کو دو قاصدوں کے ہاتھ انگلستان بھجوایا۔ اس تجویز کا مرکزی نکتہ یہی تھا کہ 20 فروری کے بیان کے مطابق انگریزوں کے چلے جانے کے بعد تمام صوبے خودمختار تصور کئے جائیں گے اور اس سے پیدا ہونے والی صورت کو وفاق میں تبدیل کرنے کا اختیار صوبوں کو ہی حاصل ہوگا۔ اس سکیم کو لندن بھیج کر ماؤنٹ بیٹن کچھ دن ستانے کے لیے شملہ چلا گیا۔ طے شدہ انتظام کے مطابق دو چار دن کے بعد نہرو بھی وہاں پہنچ گئے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی سکیم کو نہرو کے سامنے رکھا۔ نہرو اسے دیکھ کر غصے سے لال پیلے ہو گئے اور اس سکیم کو قطعی طور پر ٹھکرا دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر آپ ملک کو تقسیم ہی کرنا چاہتے ہیں تو اسے گیارہ صوبوں کی بجائے دو مملکتوں میں بانٹ دیں۔

(ج) دوسری سکیم: اس پر ماؤنٹ بیٹن نے فی الفور لنڈن میں پیغام بھیج کر اپنی سکیم کو ساقط قرار دیا۔ ساتھ وہیں تقسیم ملک کا ایک نیا منصوبہ وی پی مینن کے قلم سے تیار کروایا جو مکمل طور پر نہرو کی ہدایت کے مطابق تھا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ یہ دوسرا منصوبہ جو بال آخر تقسیم ملک کی بنیاد بنا صرف نہرو کو مطمئن کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ اس مرحلے پر قائداعظم یا مسلم لیگ کو یہ پہلا منصوبہ دکھایا گیا تھا اور نہ دوسرا۔ نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کے درمیان شملے میں طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں میں دونوں گھل مل گئے۔ دونوں تقسیم ملک کے شدید مخالف تھے لیکن دونوں نے اپنے آپ کو مسلمانوں کی رائے عامہ کے سامنے بے بس پایا۔ انہوں نے شملہ کی بلندیوں پر بیٹھ کر فیصلے کئے۔ اس کے متعلق ہمارے پاس کوئی دستاویزی شہادت موجود نہیں لیکن بعد کے واقعات سے یہ شبہ یقین میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ تقسیم ملک کے طریق کار اور

عمل میں پاکستان کے ساتھ جتنی بے انصافیاں ہوئیں ان کی بنیاد یہیں رکھی گئی تھی۔ تھوڑے دنوں کے بعد دہلی میں واپس آ کر ماؤنٹ بیٹن نے ترمیم شدہ منصوبہ قائداعظم کو دکھایا اور اسے اپنے ساتھ انگلستان لے گیا۔

4.6- 3 جون کا اعلان

حکومت انگلستان نے ماؤنٹ بیٹن کی تجاویز میں معمولی سا ردوبدل کیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے دہلی پہنچ کر لیگ، کانگریس اور سکھوں کے سرکردہ لیڈروں کو اس سے آگاہ کیا اور اگلے دن یعنی 3 جون کی شام کو ریڈیو پر اس کا اعلان کیا۔ اس اعلان میں تقسیم ملک کا اصول تسلیم کر لیا گیا تھا اور تقسیم کے طریق کار اور پروگرام کے متعلق ضروری تفصیلات دی گئی تھیں۔ تقسیم ملک کے ساتھ ہی پنجاب اور بنگال کی تقسیم لازمی قرار دی گئی تھی وہ اس طرح کہ ان صوبوں کی اسمبلیوں کے ہندو اکثریت کے اضلاع اور مسلم اکثریت کے اضلاع (جن کی فہرست اعلان میں نتیجے کے طور پر شامل تھی) کے نمائندوں کو علیحدہ علیحدہ سیکشنوں میں بیٹھ کر اس امر کا فیصلہ کرنا تھا کہ ان کو تقسیم ہونا چاہئے یا نہیں۔ اگر ان دونوں سیکشنوں میں سے ایک سیکشن بھی تقسیم کے حق میں رائے دے تو صوبے کو تقسیم کر دیا جائے گا۔ یہ منطق نہایت ٹیڑھی تھی۔ اس کی رو سے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا فیصلہ عملی طور پر اکثریت کو نہیں بلکہ ان صوبوں کو ہندو اقلیتوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ کیونکہ اس بات میں کسی قسم کی شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی کہ ہندو اقلیتیں، ہندوستان میں شمولیت کے حق میں ووٹ دیں گی۔ بظاہر ماؤنٹ بیٹن پر تاثر پیدا کرنا چاہتا تھا کہ طریق کار جمہوری ہے۔ لیکن یہ صرف ایک چال تھی۔ تقسیم ملک کی صورت میں وہ پنجاب اور بنگال کو خود تقسیم کروانا چاہتا تھا لیکن اس کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے ایک ایسا طریق کار وضع کیا کہ فیصلہ تو اس کی مرضی کے مطابق ہو لیکن فیصلے کی ذمہ داری دوسروں پر ہو۔ سلہٹ اور شمال مغربی سرحدی صوبے کے پاکستان میں شمولیت کے سوال پر دونوں علاقوں میں ریفرنڈم کی تجویز پیش کی گئی۔ بلوچستان میں اس امر کا فیصلہ کونسل آف ایلڈرز پر چھوڑ دیا گیا۔

4.7- قیام پاکستان کے راستے میں مشکلات

اگر اس سارے منصوبے پر غور کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اس کی رو سے مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں کا خودارادیت اپنے پیچ دار طریقے سے مانا گیا تھا کہ پاکستان میں شامل ہونے والی چپہ چپہ زمیں اور اس کے رہنے والوں کو ایک نئے امتحان سے گزرنا پڑے اور اپنے عزم کا اعادہ ووٹوں کے ذریعے کرنا پڑے۔ شاید ماؤنٹ بیٹن یا اس کے کسی مشیر کو یہ بات یاد نہ تھی کہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں بھی وسیع اور واضح مسلم اکثریت کے علاقے موجود تھے۔ اگر مسلم اکثریت کے صوبوں کی ہندو اقلیتوں کو حق خودارادیت دے دیا گیا تھا تو ہندو صوبوں کی اقلیتوں کو اس حق سے محروم کرنے کا کیا جواز تھا لیکن ماؤنٹ بیٹن کے فیصلوں کا انحصار منطق، قانون یا انصاف پر نہیں تھا۔ اس کی نیت کچھ اور تھی۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ اتنے دشوار طریق

کار کی مدد سے پاکستان کا قیام سرے سے ناممکن بنا دیا جائے اور پاکستان وجود میں آ بھی جائے تو اس میں مشکلوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ رہے۔ 3 جون کے اعلان میں دونوں ملکوں کی آزادی کی تاریخ 15 اگست مقرر کی گئی تھی، اڑھائی مہینے کم کا یہ عرصہ لیگ کے رہنماؤں کے لیے محنت شاقہ کا زمانہ تھا۔ اس عرصے میں حکومت ہند کے اثاثوں کی تقسیم کا مشکل کام مکمل کیا جانا تھا۔ سلہٹ اور صوبہ سرحد میں استصواب ہونا تھا۔ دونوں ملکوں کے حد بندی کمیشن کو اپنی رپورٹ مکمل کرنا تھی، پاکستان کی نئی حکومت کو منظم کرنا تھا۔ ظاہر ہے ان گیارہ ہفتوں میں مسلم لیگ اور اس کے لیڈروں سخت آزمائش میں سے گزرنا تھا۔ اس امتحان کے دوران ایک طرف ہندوؤں کی پیہم سازشوں اور دوسری طرف برطانوی حکومت اور خصوصاً ماؤنٹ بیٹن کی کھلم کھلا مخالفت کا سامنا کرنا تھا۔ جب کبھی ماؤنٹ بیٹن کی توجہ اس امر کی طرف دلائی جاتی کہ اتنے مختصر وقفے میں اتنے بڑے بڑے کاموں کا کامیابی کے ساتھ انجام پانا مشکل ہے تو وہ نہایت بے رخی بلکہ درشتی سے جواب دیتا اور پاکستان کا ذکر نہایت ناشائستہ الفاظ میں کرتا۔

مسلمان اس کڑے امتحان میں کیوں کر کامیاب ہوئے؟ اس کا جواب مختصر طور پر یہ ہے: قوم کا جذبہ آزادی، عزم و ہمت اور قائداعظم کی بے نظیر قیادت۔

4.8- ماؤنٹ بیٹن کے عزائم

یہاں ماؤنٹ بیٹن کے بعض عزائم کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

(الف) شروع سے ہی اس نے اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ انڈین آرمی کو دو حصوں میں تقسیم نہ کیا جائے۔ بلکہ دونوں ملکوں کی دفاعی ضروریات کو ایک فوج ہی پورا کرے۔ یہ تجویز سیاست کے کسی مسلمہ اصول سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ قائداعظم نے اس بات کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ فوج کا مکمل کنٹرول کسی مملکت کے اقتدار اعلیٰ کی پہلی اور لازمی شرط ہے جو حکومت اپنی فوج پر پورا پورا قابو نہیں رکھتی وہ آزاد کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی۔ اگر ماؤنٹ بیٹن اس ارادے میں کامیاب ہو جاتا تو پاکستان کی آزادی بے حقیقت بن کر رہ جاتی۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان فوجوں اور اسلحہ کی تقسیم کا کام سابق کمانڈر انچیف کلاڈ آکن لیک کے ذمے لگایا گیا تھا اس کے ''امداد'' کرنے والے ہندوستان کے نمائندوں نے اس کام میں ہر قدم پر ایسے روڑے اٹکانے شروع کئے کہ آکن لیک کو یہ کہنا پڑا کہ ہندوستان ہرگز نہیں چاہتا کہ پاکستان وجود میں آئے۔ لیکن آکن لیک نے تمام مشکلوں پر عبور پا کر اپنا کام وقت مقررہ کے اندر اندر ختم کر دیا۔ اس پر کانگریس کے لیڈر بہت برہم ہوئے۔ پٹیل کی یہ توقع کہ پاکستان کو بننے دیا جائے لیکن اس کے پاس اپنی کوئی فوج نہ ہو پوری نہ ہوئی۔ اس لیے ہندو پریس نے آکن لیک کے خلاف الزام تراشی کی مہم شروع کر دی اور اس کو طعنے کے طور پر پاکستانی کہنا شروع کیا۔ عام طور خیال کیا جاتا

ہے کہ ہندو اخبارات نے یہ سارا شور وغوغا ماؤنٹ بیٹن کے ایما پر ہی برپا کیا تھا۔

(ب) ماؤنٹ بیٹن کی دوسری بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ خود ہی دونوں ملکوں کا گورنر جنرل بن جائے۔ اس نے جس ڈھٹائی اور بے اصولی سے کانگریس اور ہندوؤں کے مطالبات کی تائید کی تھی، اس کے صلے میں حصول آزادی کے بعد اسے ہندوستان کی گورنر جنرل کی پیش کش کر دی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ چاہنے لگا کہ پاکستان کی طرف سے بھی یہی انعام اس کی جھولی میں ڈال دیا جائے۔ اس کی یہ توقع بے معنی تھی۔ دولت مشترکہ کی ساری تاریخ میں کوئی ایسی نظیر نہیں کہ دو ملکوں کی سربراہی کے فرائض بیک وقت ایک ہی شخص کو سونپے گئے ہوں۔ اس سے وہ اپنی دستار میں ایک اور کلغی لگانا چاہتا تھا۔ اگر اس کی خواہشات کا احترام کیا جاتا تو ایک خطرناک صورت حال پیدا ہو جاتی۔ بیرونی دنیا، ہندوستان اور پاکستان کو ملا کر ایک ہی ملک سمجھتی رہتی اور پاکستان کی آزادی کی علامتی اہمیت بھی نہ رہتی۔ ایک اسلامی مملکت کی سربراہی کے لیے ایک غیر مسلم کا انتخاب بھی کسی حیثیت سے موزوں نہ ہوتا۔ چونکہ ماؤنٹ بیٹن تقسیم ملک کا بے حد مخالف تھا اس لیے دونوں ملکوں کی سربراہی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ اکھنڈ بھارت کے لیے راستہ صاف کر دیتا۔ ان دونوں کے علاوہ اگر وہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کی اپنی پوزیشن کیا ہوتی کیونکہ بہت سے اہم معاملات پر اسے دونوں ملکوں کی حکومتوں کی طرف سے متضاد مشورے ملے اور ماؤنٹ بیٹن یا اس کی جگہ کوئی اور شخص اس قسم کے دوہرے اعزاز کو نبھانے کی لیاقت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن ماؤنٹ بیٹن ایسی باتوں کو کب خاطر میں لاتا تھا۔

4.9- قائداعظم کا موقف

قائداعظم دیر تک اس مسئلے پر غور کرتے رہے۔ وائسرائے مئی میں انگلستان گیا۔ جتنے دن وہ لندن میں ٹھہرا ہر روز اپنی درخواست کی منظوری کا انتظار کرتا رہا۔ واپس آیا تو بعض اہم معاملات سے نپٹنے کے بعد پورے جوش وخروش سے دوبارہ اسی مسئلے کی طرف متوجہ ہوا۔ کیمبل جانسن کی ڈائری سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مشیروں کی روزانہ مجلس میں علی التواتر اس کا ذکر کیا کرتا تھا اور قائداعظم کی خاموشی کو اپنی شان میں گستاخی قرار دیتا تھا۔ آخر کار اس نے خود ہی براہ راست قائداعظم کے ساتھ اس مسئلے پر گفتگو کا آغاز کیا اور انہیں بتایا کہ میرے دل میں اپنی ہوس کو پورا کرنے یا اپنی اہمیت اور شان وشوکت بڑھانے کا کوئی خیال نہیں۔ یہ بات خود پاکستان کے مفاد میں ہوگی کہ اس مملکت کا گورنر جنرل بھی مجھے بنایا جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو حکومت پاکستان کے لیے اپنے اثاثوں کا جائزہ حصہ حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ یہ ایک کھلی دھمکی تھی جس کو بعد میں ماؤنٹ بیٹن نے پورا کر کے دکھا دیا لیکن قائداعظم نے اس کو یہی جواب دیا کہ یہ اصول کا معاملہ ہے اور جہاں اصول کی بات ہو وہاں میں صرف ملک اور قوم کے فائدے کو ہی مدنظر رکھا کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اکثر اپنے دوستوں کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے مجھے اس معاملے میں

معذور سمجھا جائے۔ بہر حال میں ''قانون آزادی ہند'' کے مسودے کا مطالعہ کرنے کے بعد اس پر حتمی رائے دے سکتا ہوں۔

چند دن کے بعد ماؤنٹ بیٹن کو یہ پیغام ملا کہ قائداعظم خود ہی پاکستان کے گورنر جنرل ہوں گے۔

آزادی کا پہلا تقاضا یہی تھا کہ پاکستان اپنے سربراہ مملکت کا انتخاب خود کرے۔ ماؤنٹ بیٹن نے ہر طرف دباؤ ڈالا کہ انتخاب کا قرعہ اس کی مرضی کے مطابق اس کے نام پر نکلے جب یہ نہ ہو سکا تو وہ پاکستان کے لیے مجسم انتقام بن گیا۔ پاکستان کے مفاد پر گہری ضربیں لگتی رہیں۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ دہلی میں مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی۔ پاکستان کو اپنے اثاثوں سے محروم کر دیا گیا۔ مشترکہ خزانے سے پاکستان کے حصے کا روپیہ روک دیا گیا۔ سرکاری عملہ اور ریکارڈ کو لے کر جو گاڑیاں کراچی جا رہی تھیں ان پر پے در پے حملے کئے گئے۔ ماؤنٹ بیٹن خاموشی سے سب کچھ دیکھتا رہا اور شاید اپنی انا کی تسکین کرتا رہا۔ 1947ء کے قانون آزادی ہند میں ایک شق اس مضمون کی بھی رکھی گئی تھی کہ اگر دونوں مملکتیں چاہیں تو وہ مشترکہ گورنر جنرل بھی مقرر کر سکتی ہیں۔ جب یہ شق دھری کی دھری رہ گئی تو پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے برطانیہ کے وزیراعظم نے قائداعظم کو ہدف تنقید بنایا۔

دونوں ملکوں کی حد بندی کا مسئلہ بھی پیچیدہ تھا۔ تمام پارٹیوں نے اس اصول کو منظور کر لیا تھا کہ مسلم اکثریت کی آبادی کے متصل علاقوں کو ملا کر پاکستان کی مملکت قائم ہوگی۔ یہ ایک واضح اصول تھا اور اس میں کسی قسم کا الجھاؤ نہ تھا۔ لیکن 3 جون کے ریڈیائی بیان میں ماؤنٹ بیٹن نے ایک گرہ یہ لگا دی تھی کہ حد بندی کرنے میں تسلیم شدہ بنیاد کے علاوہ ''دوسرے عوامل'' کو بھی مدنظر رکھا جائے گا۔ یہ دوسرے عوامل (Other Factors) کیا تھے بیان میں اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی تھی۔ کیونکہ اس دولفظی محاورے کو بہت سے معنی پہنائے جا سکتے ہیں۔ اس وقت کسی منصف مزاج شخص کو اس بات کا وہم و گمان تک بھی نہ تھا کہ اکثریت کے ٹھوس اصول کو نظر انداز کر کے اور محض (Other Factors) کا سہارا لیتے ہوئے غالب مسلم اکثریت کے بعض علاقوں کو ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ قائداعظم نے تجویز پیش کی کہ حد بندی کے لیے اقوام متحدہ سے رجوع کیا جائے۔ جواہر لال نہرو نے مخالفت کی کیونکہ اس وقت تک اقوام متحدہ کی غیر جانب داری کا بھرم کچھ نہ کچھ قائم تھا اور کانگریس والے کسی غیر جانب دار فریق کو اس معاملے میں نہیں لانا چاہتے تھے۔ اس پر قائداعظم نے مشورہ دیا کہ دوسری صورت میں یہ معاملہ برطانیہ کی پریوی کونسل کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس بات کو بھی سرے نہ چڑھنے دیا۔ طے ہوا کہ ''حد بندی کے ایک نہیں بلکہ دو کمیشن مقرر کئے جائیں۔ ہر کمیشن کے چار چار ممبر ہوں۔ ان میں سے دو دو کا انتخاب کانگریس کرے اور دو دو کا لیگ، اور دونوں کمیشنوں کا مشترکہ صدر ہو''۔ صدارت کے لیے برطانوی حکومت نے ریڈ کلف کا نام پیش کیا جسے قائداعظم نے منظور کر لیا۔ یہ تو سب کو نظر آتا تھا کہ دونوں کمیشوں کی ہیت ترکیبی کچھ ایسی ہے کہ کسی کے اندر کوئی فیصلہ بھی اتفاق رائے سے نہیں ہو سکے اور ثالثی کا اختیار تمام تر ریڈ کلف کو مل جائے گا۔ ریڈ کلف 8 جولائی کو دہلی پہنچا۔ وہاں تین دن قیام کرنے کے بعد ایک دن کے لیے کلکتے

گیا۔ 13 جولائی کو لاہور پہنچا۔ کمیشن کے ارکان کے پہلے اجلاس میں اس نے یہ موقف اختیار کیا کہ اگر کمیشن کے ممبروں میں اتفاق ہو گیا تو مجھے دخل دینے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ لیکن سکھوں کے دعوے بہت مبالغہ آمیز تھے وہ پاکستان کی حد دریائے جہلم کو بنانا چاہتے تھے۔ یہ بات سراسر حق و انصاف کے خلاف تھی، کام کا آغاز کرتے ہوئے ریڈ کلف نے امرتسر، بٹالہ اور پٹھانکوٹ کے علاقوں پر ہوائی پرواز کی خواہش ظاہر کی۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے ہوائی سفر تو ملتوی ہو گیا لیکن کمیشن کے ایک مسلمان ممبر کو شبہ ہو گیا کہ یہ علاقہ وہی ہے جس کو کانگریس والے حد بنانے کے لیے زور دے رہے ہیں اور کیا وجہ ہے کہ ریڈ کلف صرف اسی محدود علاقے کو دیکھنا چاہتا ہے اور کسی دوسرے علاقے کی طرف اس کا خیال تک بھی نہیں گیا۔ پاکستانی رکن نے تجویز پیش کی کہ کمیشن کے مسلمان ممبر بطور احتجاج مستعفی ہو جائیں کیونکہ کمیشن کا صدر، معاملے کی چھان بین کئے بغیر ایک پارٹی کے موقف سے اتفاق کر رہا ہے۔ لیکن قائداعظم نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ چار دن بعد تک کمیشن کی کارروائی شروع ہو گئی اور 31 جولائی تک جاری رہی۔ دونوں کمیشنوں کی نشستوں سے غیر حاضر رہا اسے وکلاء کے دلائل اور دوسری کارروائیوں کی روزانہ رپورٹ بھیجی جاتی تھی۔ اگست کے پہلے ہفتے میں ریڈ کلف نے کمیشن کے ممبروں سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی۔ اس وقت کمیشن کے ایک دوسرے مسلمان رکن نے اس کی توجہ ضلع فیروز پور کی مسلم اکثریت کی دو تحصیلوں کی طرف دلائی۔ ریڈ کلف نے جواباً کہا کہ اس معاملے پر زیادہ گفتگو کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ یہ دونوں تحصیلیں پاکستان کو دی جا رہی ہیں۔ ریڈ کلف نے اپنا ایوارڈ مکمل کرنے کے بعد 8 یا 9 اگست کو ماؤنٹ بیٹن کے حوالے کیا اس کی اشاعت یوم آزادی کے بعد 17 اگست کو ہوئی۔

4.10- پاکستان کی حد بندی میں بد دیانتی

پاکستانیوں کو یہ معلوم کر کے بہت حیرت ہوئی کہ 3 جون کے اعلان میں تو گورداسپور مسلم اکثریت کے اضلاع میں شمار کیا گیا تھا لیکن ریڈ کلف نے اس تین چوتھائی حصہ ہندوستان کو بخش دیا اور حد بندی کی لائن اسی جگہ لگائی جس کو وہ طیارے کی اڑان سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس طرح ہندوستان کے لیے کشمیر کا دروازہ کھل گیا۔ زیرہ اور فیروز پور کی تحصیلیں جن کو خود ریڈ کلف نے پاکستان میں شامل کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ بھی ہندوستان کے حصے میں آ گئیں۔ ستلج اور بیاس کا درمیانی زرخیز اور مسلم اکثریت کا علاقہ بھی ہندوستان کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ ملک کے مشرقی بازو کی حد بندی میں بھی مسلم کش جانب داری سے کام لیا گیا اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے بہت سے شواہد موجود ہیں کہ ریڈ کلف کے قلم سے ایوارڈ میں فیروز پور اور زیرہ کی تحصیلوں کے متعلق ایسی تبدیلیاں کرائی گئیں جن سے پاکستان کو بہت سا نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ تبدیلیاں کس کے کہنے پر کی گئیں اور کیوں کی گئیں اس کے متعلق پاکستان میں کوئی اختلاف رائے موجود نہیں۔ اس طرح کی ریڈ کلف حد بندی کسی اصول پر مبنی نہ تھی، اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ پاکستان کے رقبے کو امکانی حد تک کم کر دیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان علاقے کو سیراب کرنے والی نہروں کے ہیڈ ورکس ہندوستان کو مل گئے اور ہندوستان کو یہ اختیار مل گیا جب چاہے پاکستان کو پانی کی رسد بند کر دے۔ اس اختیار کو جلد ہی استعمال کیا

گیا۔ اس سے ملک کے بہترین زراعتی رقبوں میں آبپاشی کا بحران پیدا ہوگیا جو کئی سالوں کے بعد دور ہوا۔ ہندوستان نے پاکستان کے حصے کا جنگی سامان اور روپیہ بھی روک لیا۔ پاکستان کو ملا ہوا بہت سا سرکاری ریکارڈ کراچی کے راستے میں تلف کر دیا گیا۔ اس طرح پاکستان کا آغاز نہایت نامساعد حالات میں ہوا لیکن پاکستانیوں کے عزم و ہمت اور قائداعظم کی رہنمائی سے ان مشکلات پر قابو پالیا۔

انتقال اقتدار کی رسم باقی تھی۔ اس کو ادا کرنے کے لیے ماؤنٹ بیٹن 13 اگست 1947ء کو کراچی پہنچا۔ اس موقع پر اس نے جو تقریر کی اس سے اس کی شخصیت کے کسی انسانی پہلو پر روشنی نہیں پڑتی کیونکہ اس تقریر کا رنگ واعظانہ تھا۔

4.11- خود آزمائی نمبر 4

سوال نمبر 1 ماؤنٹ بیٹن کو لیبر حکومت نے کیا ہدایات دی تھیں؟ اس کے طریقہ کار پر نوٹ لکھئے۔

(جواب کا موازنہ 4.4 اور 4.5 سے کیجئے)

سوال نمبر 2 ماؤنٹ بیٹن کے عزائم کو قائداعظم نے کیسے ناکام بنایا، تفصیلاً بیان کریں۔

5- تشریحات

1. ارون	لارڈ ارون۔ برطانوی ہند کا وائسرائے (1926ء تا 1931ء)۔
2. الہ آباد۔کلکتہ	بھارت کے شہر جہاں اس دوران اہم سیاسی واقعات ہوئے۔
3. پیر پور رپورٹ	1937ء میں کانگریسی حکومتوں میں مسلمانوں سے کی گئی بے انصافیوں کی رپورٹ جو مسلم لیگ کی ایک کمیٹی نے مرتب کی تھی۔ کمیٹی کا صدر نواب پیر پور تھا۔
4. جاپان	ایشیا کے مشرقی ساحل سے پرے جزیروں پر مشتمل ایک ترقی یافتہ ملک۔
5. چوہدری رحمت علی	1930ء کے دہائی میں برطانیہ میں ایک مسلمان طالب علم جس نے مسلمانوں کی علیحدہ ریاست کے لیے جدوجہد کی۔
6. ڈاکٹر انصاری	ایک مسلمان لیڈر اور انڈین نیشنل کانگریس کا ممبر۔
7. سائمن رپورٹ	برصغیر کے آئینی مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک کمیشن کی رپورٹ جس کا صدر سر جان سائمن تھا۔
8. سنگھٹن	ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف متحد کرنے کی تحریک کا آغاز 1920ء میں ہوا۔
9. شدھی	مسلمانوں کو ہندو بنانے کے لیے تحریک۔
10. فضل حق	مسلمان رہنما جنہوں نے 1940ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسے میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ ریاست کی قرارداد پیش کی تھی۔
11. فیڈرل گورنمنٹ	ایک قسم کا نظام حکومت جس میں اختیارات مرکز اور صوبوں/ ریاستوں کے درمیان تقسیم کئے جاتے ہیں۔
12. کمیونل ایوارڈ	مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک تجویز جسے برطانوی حکومت نے قبول کیا۔

یونٹ.....5

پاکستان کے حصول کے لیے جدوجہد

تدوین:
جہانگیر عالم

فہرست مضامین

یونٹ کا تعارف 175

یونٹ کے مقاصد 175

1۔ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کا کردار وایثار 176

-1.1 تاریخی پس منظر 176

-1.2 قرارداد پاکستان کی تائید 176

-1.3 باقاعدہ جدوجہد کا آغاز اور صوبائی انتخابات 177

-1.4 اکابرین کا خراج تحسین 178

-1.5 خودآزمائی نمبر 1 178

2۔ مسلم اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں کا جدوجہد میں حصہ 180

-2.1 احساس ذمہ داری 180

-2.2 شمال مغربی سرحدی صوبے میں حصول پاکستان کے لیے جدوجہد 180

-2.3 خودآزمائی نمبر 2 183

-2.4 بلوچستان میں حصول پاکستان کے لیے جدوجہد 184

-2.5 سندھ میں حصول پاکستان کے لیے جدوجہد 187

-2.6 خودآزمائی نمبر 3 189

-2.7 پنجاب میں حصول پاکستان کے لیے جدوجہد 189

-2.8 کشمیر میں حصول پاکستان کے لیے جدوجہد 191

-3 اجتماعی جدوجہد 194

-3.1 خودآزمائی نمبر 4 194

یونٹ کا تعارف

اس یونٹ میں بتایا گیا ہے کہ دوقومی نظریئے کی ضرورت کا احساس سب سے پہلے اور سب سے زیادہ برصغیر کے ان صوبوں میں ہوا جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ سیاسی، سماجی، اقتصادی، فکری، لسانی اور مذہبی میدانوں میں قدم قدم پر ہندو اکثریت کا غلبے کا خطرہ رہتا تھا۔ مسلم اکثریتی صوبوں میں یہ احساس ذرا بعد میں پیدا ہوا کیونکہ اکثریت نسبتاً محفوظ اور بے نیاز ہوتی ہے لیکن جیسے ہی انہیں مسلم اقلیتی صوبوں میں کانگرسی ظلم وستم کا پتہ چلا ویسے ہی وہ اپنے گردوپیش کو دیکھنے پر مجبور ہو گئے۔ جب ان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ پاکستان بننے کی صورت میں سب سے زیادہ فائدہ خود مسلم اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں کو ہی ہوگا اور ان علاقوں میں وہ ایک آزاد مسلم ریاست قائم کرسکیں گے جبکہ بصورت دیگر تمام برصغیر پر ہندو راج مسلط ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ یہ دل و جان سے اس تحریک میں شامل ہو گئے۔ احساس اور تخیل کی اس تبدیلی میں مسلم لیگ نے بنیادی کام کیا اور قائداعظم نے اس نظریے کی روشنی میں چٹاگانگ کی پہاڑیوں سے بلوچستان کے کوہ وصحرا تک پھیلا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان اور کشمیر میں بھی یہ تحریک شہر شہر گاؤں گاؤں اور خیمہ خیمہ مقبول ہوگئی۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد طلباء اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1- حصولِ پاکستان کے لیے مسلم اقلیتی اور مسلم اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں کے کردار کو سمجھ سکیں۔

2- برطانوی نافذ کردہ آئین کے مطابق مسلم لیگ کی کارکردگی کو جانچ سکیں۔

3- قائداعظم اور دیگر قومی اور صوبائی اکابرین کے افکار واعمال کو پرکھ سکیں۔

4- قیام پاکستان سے قبل برصغیر میں اسلامی مملکت کے قیام کے لیے مسلم عوام کی طرف سے کی گئی کوششوں کو سمجھ سکیں۔

1- اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کا کردار و ایثار

پاکستان کے حصول کے لیے جدوجہد میں برصغیر جنوبی ایشیا کے ہر ایک علاقے کے مسلمانوں نے بھرپور حصہ لیا اور قربانیاں پیش کیں۔ ان میں مسلمانوں کا ہر طبقہ فکر اور گروہ شامل تھا۔ مسلم اکثریتی علاقوں کے مسلمانوں کے ساتھ مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمان بھی قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں برابر کے شریک تھے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تحریک پاکستان کے ہراول دستے میں مسلم اقلیتی صوبوں کے لوگ پیش پیش تھے۔

1.1- تاریخی پس منظر

اس وسیع برصغیر میں مسلمانوں کے لیے جداگانہ مملکت یا برصغیر کی تقسیم کی بات سب سے پہلے مسلم اقلیتی صوبوں کے رہنماؤں ہی کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔ 23 اگست 1890ء کو مولانا عبدالحلیم شرر نے اپنے رسالہ ''مہذب'' میں ہندو مسلم فسادات کی روک تھام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس کا واحد حل یہ ہے کہ برصغیر کو ہندو اکثریتی صوبوں اور مسلم اکثریتی صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ کانگریس دور اقتدار (1937ء تا 1939ء) میں مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے واضح طور پر دو قومی نظریئے کی حقیقت اور ضرورت کو پہچان لیا تھا اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کا ہندوؤں سے نبھا نہیں ہو سکے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کو اپنے جداگانہ قومی اور ملی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی علیحدہ مملکت کے قیام کے لیے جدوجہد میں بھرپور حصہ لینا ہوگا۔

1.2- قرارداد پاکستان کی تائید

23 مارچ 1940ء کو مسلم لیگ کے ستائیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں برصغیر جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ مملکت کے قیام کے لیے ایک قرارداد، بنگال کے رکن جناب فضل الحق نے پیش کی۔ اس قرارداد کی تائید سب سے پہلے صوبہ جات متحدہ کے چوہدری خلیق الزمان نے کی جو ایک مسلم اقلیتی صوبہ تھا۔ علاوہ ازیں اس قرارداد کی حمایت کرنے والوں میں نواب محمد اسماعیل خان (بہار)، عبدالحمید خان (مدراس)، آئی آئی چندریگر (بمبئی)، مولانا عبدالحامد بدایونی اور سید ذاکر علی (صوبہ جات متحدہ)، سید عبدالرؤف شاہ (صوبہ جات متوسط) اور بیگم مولانا محمد علی (صوبہ جات متحدہ) بھی شامل تھے۔ یہ سب ایسے صوبوں سے تعلق رکھتے جو کانگریس کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے رہے۔

برصغیر کے مسلمانوں نے قرارداد پاکستان منظور کر کے یہ طے کر لیا کہ حصول پاکستان ان کا مطمع نظر اور نصب العین ہے۔ قرارداد پاکستان کی منظوری پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب سید حسن ریاض اپنی کتاب ''پاکستان ناگزیر تھا'' میں رقم طراز ہیں کہ:

''ریزولیشن بااتفاق رائے منظور ہوا اورنعروں اورتبریک وتہذیب کے ساتھ واقعی لوگوں کو اس ریزولیشن کے منظور ہونے پر بڑی خوشی تھی اور اپنی سلطنت وحکومت جانے کے بعد یہ پہلی مرتبہ ہوا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو وہ مطمع نظر اورنصب العین ملا جو ان ہی کے لیے تھا اورجس کا حصول محض ان ہی کی سعی اور جدوجہد پرمنحصر تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے ہاتھ پھرکھل گئے۔ یقینا یہ آزاد اورخودمختار دولت انہی علاقوں میں بننے والی تھی جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن ریزولیوشن کی تائید کرنے والوں میں وہ بھی تھے جو مدارس،صوبہ جات متوسط،صوبہ جات متحدہ اور بہار کے رہنے والے تھے اورزیادہ وہی تھے۔ ان کا یہ قطعی ارادہ نہ تھا کہ وہ ہجرت کرکے یہاں آئیں گے۔ وہ یہ خوب جانتے تھے کہ ان کی سختیوں اورمصائب میں رہنا پڑے گا۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہندوستان کی تقسیم اورنئی دولت کے قیام کے لیے زیادہ جدوجہد ان ہی کو کرنی چاہیئے کیونکہ اس وقت تک اکثریت کے صوبوں کے مسلمانوں میں اس کے لیے اس وجہ سے کوئی طلب نہ تھی کہ ہندوحکومت کی ان زیادتیوں اور زبردستیوں سے ان کو کوئی سابقہ نہ پڑا تھا جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں پر ڈھائی سال تک ہوتی رہی تھیں۔ مگر پھر بھی وہ بہت خوش تھے اوراس وجہ سے زیادہ خوش تھے کہ یہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کا قومی وطن بن رہا ہے جس میں اسلامی تہذیب و تمدن،ثقافت اوردین کوترقی دینے کا موقع حاصل ہوگا۔ وہ اس پرنازاں تھے کہ یہ خدمت ان کے حصے میں آرہی ہے کہ ہندوستان میں ایک گوشہ اسلام کے لیے محفوظ کردیں گے۔''

1.3- باقاعدہ جدوجہد کا آغاز اورصوبائی انتخابات

قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد حصول پاکستان کے لیے جدوجہد کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ اپریل 1940ء کو قائداعظم محمدعلی جناح کی ہدایت پر پورے ہندوستان میں قرارداد پاکستان کی تائید میں مسلم لیگ کے زیر اہتمام اجلاس منعقد ہوئے۔ ان جلسوں میں اس بات پر زور دیا گیا کہ مسلمان ہندوؤں سے ایک الگ اور جداگانہ قوم ہیں اور ان کے قومی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی اپنی علیحدہ ریاست ہوجس میں مسلمان اپنے نظریات وعقائد کے مطابق زندگی گزاریں۔ اپریل 1941ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس مدراس میں منعقد ہوا جس میں اس طرح ترمیم کی گئی کہ مسلم لیگ کا نصب العین برصغیر کے مسلمانوں کے لیے جداگانہ مملکت کا قیام ہے۔

1946ء کے عام انتخابات برصغیر پاک وہند کی سیاسی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ یہ انتخابات مسلم لیگ نے مطالبہ پاکستان کی بنیاد پرلڑے تھے تاکہ ہندوؤں اورانگریزوں پر واضح کیا جائے کہ تمام مسلمان قیام پاکستان کے حق میں ہیں۔

ان انتخابات میں مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ کو سو فیصد کامیابی حاصل ہوئی یعنی تیس مسلم نشستیں مسلم لیگ نے حاصل کیں۔ مسلم اقلیتی صوبوں کی صوبائی اسمبلیوں کی مسلم نشستوں میں بھی مسلم لیگ کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔ ان میں سے تین صوبوں بمبئی، اڑیسہ اور مدراس میں سو فیصد کامیابی ہوئی، جبکہ صوبہ جات متحدہ، صوبہ آسام اور صوبہ بہار میں اسی فیصد سے زائد نشستوں پر مسلم لیگ کے نمائندے کامیاب ہوئے۔

مسلم لیگ کے نمائندوں کی یہ شاندار کامیابی ان علاقوں کے مسلمانوں کی یک زبان تائید کا نتیجہ تھی۔ ان سب صوبوں کے مسلمان پاکستان کے حصول کو ممکن بنانے کے لیے ایک جماعت کے ساتھ منسلک ہو گئے تھے۔

1.4- اکابرین کا خراج تحسین

اپریل 1946ء میں قائداعظم محمد علی جناح نے مرکزی اسمبلیوں کے مسلم لیگی ممبروں کا ایک کنونشن طلب کیا، جس میں ہر ایک ممبر نے حصول پاکستان کے لیے جدوجہد کرنے کا حلف اٹھایا۔ اس کنونشن میں قیام پاکستان کے لیے ایک قرارداد بھی منظور کی گئی۔ یہ قرارداد سید حسین شہید سہروردی نے پیش کی تھی۔ آپ نے اپنی تقریر میں مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

> ''بنگال سے دہلی تک آتے ہوئے مجھے متعدد ایسے صوبوں سے گزرنا پڑا جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں۔ میں نے ان مسلمانوں کے دلوں میں آزادی کی تڑپ دیکھی ہے۔ انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ تم ہمیں ہماری قسمت پر چھوڑ دو لیکن اپنے صوبے میں پاکستان قائم کر لو، ہم اپنا سر افتخار یہ کہہ کر بلند رکھ سکیں گے کہ ہمارے بھائیوں نے آزاد مملکت قائم کر لی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اقلیت کے صوبے کے ان مسلمانوں نے ہم سب کی شاہراہ آزادی کی طرف رہنمائی کی ہے اور ان کا یہ عزم قابل ستائش ہے کہ وہ حصول آزادی اور پاکستان کے لیے قربانیاں پیش کرنے پر آمادہ ہیں۔''

1.5- خود آزمائی نمبر 1

سوال نمبر 1 مندرجہ ذیل سوالات کا مختصر جواب دیں۔

الف۔ تحریک پاکستان کے ہراول دستے میں کون لوگ پیش پیش تھے؟

ب۔ قراردادِ پاکستان کس نے پیش کی اور اس کی اولین تائید کس نے کی؟

ج۔ حصولِ پاکستان کے لیے باقاعدہ جدوجہد کا آغاز کب ہوا؟

د۔ مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں مسلم لیگ کو کتنے فی صد کامیابی حاصل ہوئی؟

ر۔ 1946ء کے صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ نے کن تین اقلیتی صوبوں میں سو فیصد کامیابی حاصل کی؟

سوال نمبر 2 مندرجہ ذیل فقرات میں خالی جگہ پر کیجئے۔

الف۔ اقلیتی صوبوں کے مسلمان بھی قیام پاکستان کی جدوجہد میں ..... کے شریک تھے۔

ب۔ وہ اس میں خوش تھے کہ یہ خدمت ان کے ..... میں آ رہی ہے کہ ہندوستان میں ایک ..... اسلام کے لیے وقف کر دیں۔

ج۔ 1946ء کے انتخابات مسلم لیگ نے .....کی بنیاد پر لڑے تھے۔

سوال نمبر 3 آزاد مملکت کے قیام کے سلسلے میں اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے کردار و ایثار پر نوٹ تحریر کیجئے۔

2۔ مسلم اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں کا جدوجہد میں حصہ

پاکستان کے حصول کے لیے جدوجہد میں برصغیر کے ان صوبوں کے مسلمانوں نے، جہاں وہ اکثریت میں تھے، اپنی مسلم حیثیت کو اجاگر کرنے کے لیے بھرپور حصہ لیا۔ برطانوی ہند کے سیاسی حالات جو رخ اختیار کر رہے تھے ان کے تحت انگریز راج کے اختتام پر ہندو مکمل غلبہ پانے کی تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ اپنے آپ اس کو آنے والی غلامی کے خطرے سے بچانے اور آئینی طور پر جو حق خودارادی مل رہا تھا، اس کے تحت اپنی دیرینہ آرزو، اسلامی مملکت کے قیام کی خاطر سب یک زبان ہو گئے۔

2.1- احساس ذمہ داری

آزاد مسلم مملکت کے قیام کا تصور علامہ اقبال نے واضح طور پر پیش کر دیا تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ شروع میں مسلم اکثریتی صوبوں کے مسلمان اپنی اکثریت کی بناء پر تحریک پاکستان سے قدرے بے نیاز اور غافل رہے۔ ان کا احساسِ ذمہ داری کانگریسی دور اقتدار میں مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم نے جگایا۔ مسلم لیگ نے اس ذمہ داری کو ابھارا۔ کانگریسی وزارتیں 1939ء میں مستعفی ہوئیں تو قائداعظم نے یوم نجات وتشکر منایا۔ اس موقع پر اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں۔ انہوں نے انہیں اپنے گردوپیش کو دیکھا تو صاف نظر آنے لگا کہ پنجاب جہاں مسلمان ساٹھ فیصد تھے، سندھ جہاں وہ ستر فیصد تھے، سرحد جس میں وہ نوے فیصد تھے، ہندو تو بلوچستان پر بھی چھائے ہوئے تھے جہاں مسلمان ننانوے فیصدے تھے۔ تعلیم، ملازمت، تجارت، معیشت سب پر ان ہی کا سکہ چلتا تھا۔

ان حالات میں وہ شروع میں جتنے غافل تھے اب اتنے ہی زور وشور سے تحریک پاکستان میں شامل ہوئے اور اس میں نیا خون دوڑا دیا۔ ذیل کے صفحات میں ہم پاکستان کے حصول کے لیے جدوجہد میں صوبہ سرحد، بلوچستان، سندھ، پنجاب اور کشمیر کے مسلمانوں کا خصوصی ذکر کریں گے۔

2.2- شمال مغربی سرحدی صوبے میں حصول پاکستان کے لیے جدوجہد

برصغیر جنوبی ایشیا کی شمال مغربی سمت میں وہ غیور مسلمان آباد ہیں جنہوں نے برطانوی راج کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو کوہ سلیمان کے گردونواح میں روک لیا تھا۔ انیسویں صدی میں سلطنت برطانیہ اپنے عروج پر ہونے کے باوجود ان جری افراد سے معاہدات کرنے پر مجبور ہوئی۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ اور معاہداتی قبائل کے عوام نے تاریخ کے ہر دور میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ برصغیر کی ہر ملّی اور ملکی تحریک میں یہاں کے لوگوں نے نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔ آزادی وطن اور مسلم اقتدار کی بحالی کے سلسلے میں برصغیر میں جتنی بھی تحریکیں اٹھیں ان تمام میں سرحد کے لوگوں نے نہ صرف تعاون کیا بلکہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حصول

پاکستان کی جدوجہد میں بھی صوبہ سرحد کے عوام کا کردار بڑا نمایاں ہے۔

حکومت وقت کے سامنے، مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ مملکت قائم کرنے کی بات واضح الفاظ میں سب سے پہلے یہیں کی گئی۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان کے سردار محمد گل خان نے 1923ء میں ایک سرحدی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے مسلمانوں کا مدعا بیان کیا۔ انہوں نے کہا کہ:

''ہندوستان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔ اگر یہ منصوبہ قابل عمل بنایا جا سکے تو مسلمانوں کو پشاور سے آگرہ تک کا علاقہ دے دیا جائے۔''

صوبہ سرحد کے عوام بڑے بہادر، جرأت مند اور غیور ہیں۔ اپنے دور اقتدار میں انگریزوں نے ان کو سنگین اور جبری قوانین کے شکنجے میں جکڑے رکھا۔ برصغیر میں قانون ہند 1909ء اور قانون ہند 1919ء کے ماتحت سیاسی اصلاحات کا آغاز کیا گیا مگر صوبہ سرحد کو سیاسی اصلاحات سے بہرہ مند ہونے سے محروم رکھا گیا۔ اس لیے یہاں سیاسی بیداری کی وہ بہتر حالت نہ تھی جو برصغیر کے دوسرے صوبوں میں تھی۔ 1927ء میں قائداعظم محمد علی جناح نے صوبہ سرحد میں سیاسی اصلاحات کی آواز اٹھائی۔ بالآخر لندن گول میز کانفرنس کے بعد صوبہ سرحد میں بھی سیاسی اصلاحات کا نفاذ ہوا۔ یہاں کے لوگ بھی دوسرے صوبوں کے عوام کی طرح اپنے صوبے کے انتظامی معاملات میں شریک ہوئے۔ اس صوبے میں مسلمانوں کی آبادی 95 فیصد تھی۔ اس لیے لامحالہ اس سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ قرارداد پاکستان کی حمایت میں صوبہ سرحد کی طرف سے سردار اورنگ زیب خان نے اس کی تائید کرتے ہوئے اس تاریخی اجلاس میں فرمایا کہ:

''مجھے اس قرارداد کی تائید کا اعزاز حاصل ہوا ہے جس کی تحریک شیرِ بنگال اے کے فضل الحق نے پیش کی ہے اس پر متانت و سنجیدگی کے ساتھ اور جذبات سے قطعی طور پر بالاتر ہو کر سوچنا اور غور کرنا چاہیئے ..... میں ہندو اکثریتی صوبوں میں رہنے والے مسلمانوں کو اس قرارداد کی حمایت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں جو صرف چھ کروڑ مسلمانوں کی آزادی حاصل کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے ..... ہم برطانوی جمہوریت نہیں چاہتے جو سوائے اس کے کچھ نہیں کہ سروں کو گن لیا جائے۔ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ہم مسلمان قوم کے لیے ایک وطن چاہتے ہیں اور ہمارا وطن وہی ہے جس کی تصریح قرارداد میں کر دی گئی ہے۔''

قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد شمال مغربی سرحدی صوبے میں تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی اور جگہ جگہ مسلم لیگ کے پرچم لہرائے گئے۔ البتہ 1943ء سے 1945ء تک صوبہ سرحد میں صوبائی مسلم لیگ انتشار کا شکار رہی۔ اس دوران میں کانگریس نے مسلم لیگ کے رہنماؤں کی باہمی کشمکش کی وجہ سے خوب فائدہ اٹھایا۔ کانگریس نے صوبہ سرحد میں اپنا اثر برقرار رکھنے اور سرحد کے عوام کو مسلم لیگ سے دور رکھنے کے لیے انتہائی سخت پروپیگنڈا کیا لیکن یہ صورتحال زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ 1945ء میں قائداعظم محمد علی جناح کی ذاتی توجہ سے صوبے میں مسلم لیگ دوبارہ فعال ہوئی اور حصول پاکستان کے لیے بھرپور جدوجہد

کا آغاز ہوا۔ جلد ہی کانگریس کے عزائم بے نقاب ہونے لگے اور عوام کی بڑی تعداد مسلم لیگ کی طرف مائل ہونے لگی۔ کوہاٹ، مردان، ڈیرہ اسماعیل خان اور ایبٹ آباد میں مسلم لیگ کی دو روزہ اور تین روزہ کانفرنسیں منعقد ہوئیں جن کے بعد مسلم لیگ مقبول ہوتی گئی۔ جب نومبر 1945ء میں قائداعظم محمد علی جناح پشاور تشریف لائے تو مسلم لیگ کے رضا کاروں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اس بات کی شہادت دے رہا تھا کہ صوبہ سرحد کے عوام حصولِ پاکستان کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔ 21 دسمبر 1945ء کو شاہی باغ پشاور میں مسلم لیگ کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ اس موقع پر قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے پیغام میں فرمایا کہ:

''میں حالات کا مشاہدہ کرنے کے بعد بڑی خوشی سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ 1936ء کے اور آج کے سرحد کے مسلمانوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ سرحد کے مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ اور حصول کے لیے اچھی طرح بیدار ہو چکے ہیں۔ میں 1936ء میں سرحد میں آیا تھا اور یہاں میں نے مسلم لیگ کی تنظیم کے سلسلے میں دس دن گزارے تھے۔ ان دنوں سرحد کے مسلمان ہندو کانگریس کے دھوکے اور فریب کے جال میں جکڑے ہوئے تھے مگر آج یہاں کا بچہ، بوڑھا، جوان، مرد اور عورت بلکہ خود ہندو بھی اچھی طرح جان چکا ہے کہ مسلم لیگ ہی ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور کروڑوں مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ ہیں جس کا ثبوت آج کے اس اجلاس میں اتنی تعداد میں مسلمانوں کی موجودگی ہے۔

ہم دو محاذوں پر جنگ لڑ رہے ہیں۔ ایک طرف تو ہم ہندو کانگریس کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں اور دوسری طرف ہمارا مقابلہ برطانوی سامراج سے ہے۔ یہ دونوں دراصل سرمایہ دارانہ ذہنیت کے محاذ ہیں۔ مسلمانوں کا مطالبہ ''پاکستان'' ہے جہاں وہ اپنی مخصوصی اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی روایات کے تحت حکومت کر سکیں۔ ہمارے مقابلے میں ہندو کانگریس ہے جو اکھنڈ ہندوستان کا مطالبہ کر رہی ہے، جہاں وہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کو اقلیت بنا کر ہندوستان کی مرکزی حکومت کے ماتحت ہر لحاظ سے غلام بنا سکے۔ یہی ہندوؤں کا وہ منصوبہ ہے جسے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان اچھی طرح سمجھ چکے ہیں اور وہ کسی صورت میں بھی ہندوؤں کے اس مطالبے کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اب ہندوؤں کے سامنے دو راستے ہیں یا تو وہ مسلمانوں کو ختم کر دیں یا پھر وہ مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کو مان لیں۔ مگر یاد رکھو کہ دس کروڑ مسلمانوں کو کبھی بھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔''

شمال مغربی سرحدی صوبے میں تحریک پاکستان بڑی کامیابی سے چل رہی تھی کہ صوبہ سرحد کی کانگریسی حکومت نے مسلم لیگ کے رضا کاروں اور رہنماؤں پر ظلم و ستم کرنا شروع کر دیا۔ ان پر جھوٹے مقدمات قائم کر کے انہیں جیلوں میں بند کرنا شروع کر دیا۔ اس کے خلاف فروری 1947ء میں مسلم لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی اور کانگریسی حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ عوام کا اعتماد کھو چکی ہے اس لیے حکومت سے دستبردار ہو جائے۔ مگر کانگریسی حکومت نے تحریک کو دبانے کے لیے مسلم لیگی رہنماؤں کی وسیع

پیمانے پر گرفتاریاں شروع کر دیں۔ اس کے باوجود تمام صوبے میں سول نافرمانی کی تحریک نہایت منظم طریقے سے چلتی رہی۔ پشاور میں ''صدائے پاکستان'' کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا گیا۔ یہ روزنامہ قلمی ہوتا تھا اور خفیہ طور پر ترتیب دیا جاتا تھا۔ اس میں سرحد مسلم لیگ کی سرگرمیوں، تحریک کے دوران مختلف ضلعی حالات اور کانگریسی حکومت کے مسلم لیگی رضا کاروں اور لیڈروں پر تشدد کے واقعات درج ہوتے تھے۔ خفیہ اخبار کے ساتھ ساتھ پشاور میں ایک خفیہ ریڈیو اسٹیشن بھی قائم کیا گیا تھا جس کے ذریعے شہر کے تین مختلف مقامات سے مختلف اوقات میں نشریات کے ذریعے صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی شاخوں کو احکام جاری کیے جاتے تھے یوں تحریک کو منظم کرنے کے لیے تمام طریقے بروئے کار لائے جاتے تھے۔ تحریک سول نافرمانی کے دوران تقریباً آٹھ ہزار مسلم لیگی رہنماؤں اور رضا کاروں کو حکومت نے گرفتار کر کے جیلوں میں بند کر دیا تھا۔ ان پر جھوٹے مقدمات قائم کئے گئے، ان پر طرح طرح سے زیادتیاں کی گئیں، مگر اس کے باوجود کانگریسی حکومت تحریک کو ختم نہ کر سکی۔

3 جون 1947ء کو حکومت برطانیہ نے برصغیر کے مسلمانوں کے مطالبۂ پاکستان کو تسلیم کر لیا اور اعلان کیا کہ صوبہ سرحد میں استصواب رائے کے ذریعے عوام فیصلہ کریں گے کہ وہ پاکستان یا بھارت میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ اس اعلان پر قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی نشری تقریر میں صوبہ سرحد کے عوام کو مشورہ دیا کہ وہ تحریک ختم کر دیں۔ چنانچہ قائداعظم محمد علی جناح کے حکم پر تحریک ختم کر دی گئی اور مسلم لیگ کے رہنما اور رضا کار استصواب رائے کی مہم کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ کانگرس اور سرخ پوشوں نے پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور آخری حربے کے طور پر پختونوں کی آزاد مملکت پختونستان کا نعرہ بلند کیا لیکن صوبہ سرحد کے عوام پر ان کا جادو نہ چل سکا اور انہیں ناکامی ہوئی۔ سب عوام نے مکمل طور پر مطالبۂ پاکستان کی حمایت کی۔

2.3- خود آزمائی نمبر 2

سوال نمبر 1 مختصراً بتائیے۔ (ایک دو جملے)

الف۔ سردار محمد گل خان نے تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے کیا بیان دیا تھا؟

ب۔ صوبہ سرحد میں سیاسی اصلاحات کا نفاذ کب ہوا؟

سوال نمبر 2 خالی جگہ پر کیجئے۔

الف۔ سن ..... میں قائداعظم نے صوبہ سرحد میں سیاسی اصلاحات کے لیے آواز اٹھائی۔

ب۔ دس کروڑ ..... کو کبھی بھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔

ج۔ 21 نومبر 1947ء کو ..... باغ پشاور میں مسلم لیگ کانفرنس کا افتتاح ہوا۔

د۔ ہم دو محاذوں پر لڑ رہے ہیں۔ ایک طرف ہندو کانگرس اور دوسری طرف ..... سے ہمارا مقابلہ ہے۔

سوال نمبر 3 روزنامہ ''صدائے پاکستان'' کی خاص باتیں بتائیے۔

2.4- بلوچستان میں حصول پاکستان کے لیے جدوجہد

بلوچستان بھی برصغیر کا مغربی لیکن نسبتاً زیادہ وسیع رقبے پر پھیلا ہوا علاقہ ہے جہاں انگریز سلطنت کو اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے میں بے حد دشواری کا سامنا رہا۔ سرحد کی طرح یہاں بھی برطانوی حکومت نے سیاسی اصلاحات سے گریز کیا تا کہ مسلم باشندوں کو کوئی سہولت میسر نہ آ سکے۔ اس اعتبار سے بلوچستان کے عوام کے مسائل مثالی تھے۔ 1927ء کی تجاویز دہلی اور مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ کلکتہ میں مطالبہ کیا گیا کہ بلوچستان میں بھی دیگر صوبوں کی طرح سیاسی اصلاحات نافذ کی جائیں۔ پھر یہی مطالبہ زیادہ پرزور حمایت کے ساتھ مرتبہ شکل میں ''جناح کے چودہ نکات'' کی صورت میں ملک کے سامنے پیش کیا گیا۔

بلوچستان میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں نواب یوسف علی عزیز مگسی (1908ء تا 1935ء) کی خدمات بڑی نمایاں ہیں۔ آپ کو بجا طور پر بلوچستان میں تحریک آزادی کا علمبردار کہا جا سکتا ہے۔ آپ علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان کے خیالات و افکار سے متاثر تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح سے بھی آپ کا رابطہ رہا۔ آپ نے بلوچستان کے عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لیے مختلف طریقہ ہائے کار اختیار کیے۔ بلوچستان کے عوام کو منظم کرنے کے لیے دسمبر 1932ء کو جیکب آباد میں کل ہند بلوچ کانفرنس کے انعقاد کا انتظام کیا۔ کراچی سے مختلف اخبارات مثلاً البلوچ، بلوچستان، بلوچستانِ جدید، ینگ بلوچستان وغیرہ جاری کرائے جو یکے بعد دیگرے ضبط ہوتے گئے۔ بلوچستان کے مسائل پر متعدد مضامین اور پمفلٹ بھی لکھے۔ ان میں ''بلوچستان کی آواز'' ایک قابلِ ذکر پمفلٹ ہے۔ آپ ایک اچھے شاعر بھی تھے اور شاعری کے ذریعے بھی آپ نے عوام میں سیاسی بیداری اور آزادی کے لیے تڑپ پیدا کی۔

جون 1939ء میں بلوچستان میں مسلم لیگ قائم ہوئی۔ قاضی محمد عیسیٰ نے اس سلسلہ میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ بلوچستان میں مسلم لیگ کی تنظیم کو متحد بنیادوں پر قائم کرنے اور عوام میں اسے متعارف کرانے کے لیے ملک کے دوسرے حصوں سے وقتاً فوقتاً مختلف رہنما تشریف لاتے رہے۔ قراردادِ پاکستان کی تائید میں بلوچستان کی طرف سے قاضی محمد عیسیٰ نے کہا:

> ''آج 27 سال کے بعد مسلمان اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انہیں ایک آزاد اسلامی مملکت میں زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ ہمارے قائداعظم گزشتہ تین سال سے یہ سوچ رہے تھے کہ مسلمانوں کی آئندہ پوزیشن کیا ہونی چاہیئے۔ بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کم از کم ان صوبوں میں مسلمانوں کو آزادی ملنی چاہیئے جہاں ان کی اکثریت ہے۔ اس طرح کم از کم 6 کروڑ مسلمان تو آزاد ہو جائیں۔ گل سردار اورنگ زیب خان نے کہا تھا کہ وہ درۂ خیبر کی دربانی کریں گے۔ میں یہ اعلان کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ہم اس سے ایک چھوٹے دروازے یعنی درۂ بولان کی دربانی کریں گے۔''

جولائی 1940ء میں بلوچستان مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس کوئٹہ میں نوبزادہ لیاقت علی خان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے قاضی محمد عیسیٰ نے کہا:

''پاکستانی سکیم کی تشکیل سے قبل ہمارا مطالبہ صوبائی اصلاحات کے متعلق پرزور طور پر تھا لیکن اب پاکستانی سکیم کے مرتب ہو جانے پر ہمارا صوبہ اسلامستان یا پاکستان میں آ چکا ہے لہٰذا ہمارا مطالبہ اب صوبائی اصلاحات کے علاوہ پاکستان کا بھی ہے۔ پاکستان کے لیے تمام مسلمانانِ بلوچستان ہندوستان کے باقی مسلمان بھائیوں سے کلی طور پر متفق ہیں اور ہر ممکن قربانی دینے اور ایثار کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

23 مارچ 1941ء کو بلوچستان مسلم لیگ نے یوم پاکستان منانے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں میکموہن پارک کوئٹہ میں ایک جلسۂ عام منعقد ہوا، جس میں قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا گیا اور قراردادِ پاکستان کی پرزور حمایت کی گئی۔ 1945ء میں جب قائداعظم محمد علی جناح نے حصولِ پاکستان کے لیے اپنا تاریخی اعلان کیا کہ ''تم مجھے چاندی کی گولیاں دو، میں آزادی کی جنگ لڑ کر تمہیں پاکستان دوں گا'' تو بلوچستان کے لوگوں نے بڑی فراخدلی سے مسلم لیگ کے فنڈ میں چندہ دیا۔ بلوچستان کے ایک شخص نے (جو اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا) مسلم لیگ کے چندے میں چاندی کی دو سلاخیں دیں جس کا وزن ساڑھے پانچ ہزار تولہ تھا۔

بلوچستان میں دستور ساز اسمبلی کے انتخاب میں کانگریسی امیدوار کو ناکامی ہوئی اور نواب محمد خان جوگیزئی بھاری اکثریت میں کامیاب ہوئے۔ ان کی یہ کامیابی بلوچستان میں تحریک پاکستان کا سنگِ بنیاد تھی۔ بقول جناب نسیم حجازی ''آئین ساز اسمبلی کے لیے نواب محمد خان جوگیزئی کا انتخاب بلوچستان کا پاکستان کی طرف پہلا قدم تھا۔'' اس سے پاکستان کے حامی عناصر کے حوصلہ بلند ہوئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ مسلم لیگ تمام مخالفتوں، سازشوں اور دشواریوں کا منہ توڑ جواب دے کر مکمل فتح حاصل کرے گی۔

1946ء کے وسط میں مسلم لیگ کونسل نے اپنے اجلاس منعقدہ بمبئی میں یہ طے کیا کہ بطور احتجاج مسلم لیگی خطاب یافتگان اپنے اپنے خطابات واپس کر دیں۔ چنانچہ اس فیصلے پر بلوچستان میں بھی عمل ہوا۔ کوئٹہ میں عیدالاضحیٰ کی نماز کے بعد عوام کے سامنے خطاب یافتگان نے یکے بعد دیگرے مسجد کے منبر پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ جب ہماری زندگیاں اپنی ملی و سیاسی جماعت مسلم لیگ کے لیے وقف ہو چکی ہیں تو ہم اپنی جماعت کی خدمت کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اپنے خطابات حکومت کو واپس کرتے ہیں اور اپنی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ کو یہ بھی یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اگر جماعت ہم کو آگ میں کودنے کا بھی حکم دے گی تو ہم فوراً صدائے لبیک بلند کرتے ہوئے اس میں کود پڑیں گے۔

27-28 اپریل 1947ء کو کوئٹہ میں پاکستان کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کی صدارت چوہدری خلیق الزماں نے کی۔ اس کانفرنس میں واضح طور پر کہا گیا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی منزلِ مقصود پاکستان ہے جو سامنے دکھائی دے رہی ہے۔ ایک قرارداد کے ذریعے مطالبہ کیا گیا کہ بلوچستان میں بلا تاخیر جمہوری حکومت قائم کی جائے۔

اعلان 3 جون 1947ء میں بلوچستان کے بارے میں کہا گیا کہ شاہی جرگہ اور کوئٹہ میونسپل کمیٹی کے اراکین اس بات

کا فیصلہ کریں گے کہ آیا بلوچستان پاکستان یا بھارت میں شریک ہو۔ رائے شماری کے لیے 29 جون کی تاریخ مقرر کی گئی۔ اس اعلان کے ساتھ ہی کوئٹہ سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ کانگریس نے اپنی سازشوں کا جال پھیلانا شروع کر دیا اور پاکستان کے خلاف اپنی مہم تیز کر دی۔ شاہی جرگے کے اراکین کو ہندوستان میں شمولیت کی ترغیب دی جانے لگی کہ ہندوستان ہی بلوچستان کے اخراجات کا متحمل ہوسکتا ہے اور اگر بلوچستان نے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا تو بلوچستان اور پٹھانوں کے حقوق پامال ہو جائیں گے۔ دوسری طرف انگریز بھی مسلمانوں کی یکجہتی اور اتحاد کو ختم کرنے کے درپے تھے۔ پاکستان کے فدائی بھی قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں دن رات مصروف تھے۔ ان دنوں میر جعفر خان جمالی اور نواب محمد خان جوگیزئی نے جس گرمجوشی سے پاکستان کے لیے کام کیا یہ انہی کا حصہ تھا۔ انہوں نے اپنے ایک مشترکہ بیان میں اعلان کیا کہ:

''بلوچستان کے سرداروں نے پورے غور کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ بلوچستان کے حقوق کا بہترین تحفظ پاکستان کے اندر رہنے سے ہی ہوگا۔ پاکستان کے اسلامی ریاست کے مرکز کے ساتھ وابستہ ہو کر بلوچستان نہ صرف اپنی آزادی اور خودمختاری کی حفاظت کر سکے گا بلکہ اپنے ہمسایہ مسلم صوبوں کے دوش بدوش اپنی اقتصادی اور سیاسی حالت کو بدرجہا بہتر بنا سکے گا۔ بلوچستان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ قائداعظم کی کوششوں سے ہم ہندو اکثریت کے سیاسی غلبے سے آزاد ہو کر پاکستان کی اسلامی حکومت میں داخل ہونے والے ہیں۔ ہم سب سردار بمع اپنے قبائل کے پاکستان کی اسلامی حکومت میں شامل ہونے کے لیے تیار ہیں اور قائداعظم پر بھروسہ رکھتے ہیں کہ وہ ہماری صحیح رہنمائی کریں گے۔''

اس بیان کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ بلوچستان کے لوگ تشکیلِ پاکستان کی راہ میں دیوانہ وار آگے بڑھے اور انہوں نے ریفرنڈم سے کچھ روز پہلے کوئٹہ میں پاکستان کی حمایت میں ایک عظیم الشان جلوس نکالا جس میں پاکستان زندہ باد کے فلک شگاف نعروں میں اعلان کیا گیا کہ:

''ہم دیکھیں گے کہ ہمارے راستے میں اب کون حائل ہوتا ہے۔ بلوچستان پاکستان اور صرف پاکستان کا حصہ بنے گا۔''

آخری وقت اعلان کیا گیا کہ 29 جون کو ریفرنڈم نہیں ہوگا۔ اس دن صرف لارڈ مونٹ بیٹن کا اعلان پڑھ کر سنایا جائے گا اور اگلے دن رائے شماری ہوگی۔ یہ بڑی گہری سازش تھی۔ ایک دن میں بہت کچھ ہوسکتا تھا۔ ہندو اور انگریز کی اس ملی بھگت کے خلاف تحریک پاکستان کے دیوانے ڈٹ گئے۔ چنانچہ 29 جون کو ٹاؤن ہال کوئٹہ میں پروگرام کے مطابق ایجنٹ برائے گورنر جنرل نے لارڈ مونٹ بیٹن کا اعلان پڑھنا شروع کر دیا لیکن وہ یہ اعلان ختم بھی نہ کر پائے تھے کہ نواب محمد خان جوگیزئی بڑے اعتماد کے ساتھ اپنی جگہ کھڑے ہوئے اور کہا:

''ہم یہ بیان پہلے پڑھ چکے ہیں۔ ہمیں فیصلہ کرنے کے لیے مزید وقت نہیں چاہیئے کیونکہ شاہی جرگے کے

سردار پاکستان کی حمایت میں فیصلہ کر چکے ہیں۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا نمائندہ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں بیٹھے گا۔''

ہال تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا اور ہال سے باہر کی فضا پاکستان زندہ باد کے نعروں سے معمور ہوگئی۔

2.5- سندھ میں حصول پاکستان کے لیے جدوجہد

مغرب میں، برصغیر کے ساحل کے ساتھ واقع وسیع علاقہ سندھ سب سے پہلے محمد بن قاسم کے ہاتھوں اسلامی حکومت میں شامل ہوا اور اس نسبت سے باب الاسلام کہلاتا ہے۔ انگریز راج میں مدتوں اس علاقے کو صوبہ بمبئی کا دست نگر رکھا گیا۔ یہاں مسلمانوں کی بڑی آبادی صنعت، معیشت اور تعلیم وغیرہ ہر میدان میں ہندوؤں سے دبی رہی۔ طویل کوششوں کے بعد مسلم اکثریت کے اس علاقے کو 1935ء میں مکمل صوبے کا درجہ دیا گیا اور عوام کو صوبائی سطح پر سیاسی حقوق ملے۔

اس اعتبار سے حصولِ پاکستان کے لیے جدوجہد میں سندھ کے مسلمان ابتدائی دنوں سے ہی شریک رہے ہیں اور انہوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ مسلم لیگ کا سب سے پہلا سالانہ اجلاس دسمبر 1907ء میں کراچی میں منعقد ہوا تھا۔ مکمل صوبہ بن جانے کے بعد اکتوبر 1938ء میں سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس کی صدارت قائداعظم محمد علی جناح نے کی۔ اس کانفرنس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں واضح طور پر مطالبہ کیا گیا کہ جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں مسلم حکومت قائم کی جائے تاکہ دونوں قومیں (ہندو اور مسلمان) اپنی علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم کر سکیں۔ یہاں مسلم لیگ کی مرکزی قیادت سے سفارش کی گئی کہ وہ اس سلسلے میں کوئی واضح سکیم ترتیب دے۔ اس کانفرنس میں حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی تھی:

''سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس وسیع وفراخ براعظم ہند کے قیام امن کے مفاد میں اور بے روک ٹوک ثقافتی تعمیر وترقی، معاشی اور سماجی بہبود اور دونوں قوموں کی (جو ہندو اور مسلمان کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں) سیاسی خودداری کے مفادات کے پیش نظر، یہ چیز قطعی طور پر ضروری سمجھتی ہے کہ ہندوستان دو وفاقوں میں تقسیم کر دیا جائے یعنی مسلم اور غیر مسلم ریاستوں کا وفاق۔

چنانچہ یہ کانفرنس آل انڈیا مسلم لیگ سے سفارش کرتی ہے کہ دستور کی ایک ایسی سکیم وضع کرے جس کے تحت مسلم دیسی ریاستیں اور وہ علاقے جہاں کی اکثریت آباد ہے اپنے ذاتی وفاق کی شکل میں مکمل آزادی حاصل کر سکیں اور وہ بھی اس طرح کہ ہندوستانی سرحدوں کے اُس پار واقع دوسری کسی بھی مسلم ریاست کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ اس وفاق میں شامل ہو سکے اور غیر مسلم اقلیتوں کے لیے ویسے ہی تحفظات دیئے جا سکتے ہیں جیسے ہند کے غیر مسلم وفاق میں مسلم اقلیتوں کو دیئے جا سکتے ہوں۔''

آل انڈیا مسلم لیگ نے اس قرارداد کے پیشِ نظر ایک کمیٹی مقرر کی جس میں تقسیم کی مختلف سکیموں کا جائزہ لینے کے بعد ایک تجویز ترتیب دی، جس کی بنیاد پر 23 مارچ 1940ء والی قرارداد پاکستان منظور کی گئی۔ اس تاریخی اجلاس میں صوبہ سندھ کی طرف سے قراردادِ پاکستان کی حمایت سر عبداللہ ہارون نے کی۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا:

''یہ ایک امر واقعہ ہے اور سب اس حقیقت سے واقف ہیں کہ مسلمان سندھ کے راستے ہندوستان میں آئے اور سندھ کے مسلمانوں کے سب سے پہلے یہ مسئلہ آیا تھا جو اب مسلم لیگ کے سامنے ہے۔ 1938ء میں (سندھ) مسلم لیگ نے آزاد ریاست کے قیام کے لیے ایک قرارداد منظور کی تھی ..... (یہ قرارداد) ہندوؤں اور انگریزوں دونوں کے لیے قابل قبول ہوگی اس لیے کہ اس خاردار مسئلے کا اس سے بہتر کوئی اور حل نہیں تھا۔''

دسمبر 1940ء میں قائداعظم محمد علی جناح نے سندھ میں حصول پاکستان کے لیے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع کرنے اور ان میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے ایک کمیٹی جی۔ ایم سید کی سربراہی میں قائم کی۔ اس کمیٹی نے سندھ میں مسلم لیگ کی تنظیم کو مضبوط بنانے کے لیے خاصا کام کیا اور 1943ء میں سندھ میں مسلم لیگی وزارت قائم ہوگئی۔ اس طرح سندھ برصغیر جنوبی ایشیا کا پہلا صوبہ تھا جہاں پر مسلم لیگ نے وزارت بنائی جو قیام پاکستان تک برقرار رہی۔

3 مارچ 1943ء کو سندھ صوبائی اسمبلی میں جی ایم سید نے مطالبہ پاکستان کی قرارداد پیش کی جو اسی دن منظور ہوگئی۔ سندھ صوبائی اسمبلی کی یہ قرارداد تحریک پاکستان میں زبردست اہمیت رکھتی ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے سندھ صوبائی اسمبلی کے اس فیصلے کی تعریف کی اور امید ظاہر کی کہ مسلم اکثریت کے دوسرے صوبوں میں بھی سندھ اسمبلی کی پیروی کی جائے گی۔

1946ء میں جب عام انتخابات کا انعقاد ہوا تو سندھ میں مسلم لیگ نے واضح اکثریت حاصل کی اور اس کے لیڈر سر غلام حسین ہدایت اللہ نے وزارت تشکیل دی۔ اسے ناکام بنانے کے لیے کانگریس نے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور کئی مرتبہ تحریکِ عدم اعتماد پیش کی جو ہر بار ناکام ہوئی۔ اسمبلی میں انتشار کے پیش نظر گورنر نے اسمبلی توڑ دی اور دسمبر 1946ء میں نئے انتخابات منعقد کرائے۔ ان میں مسلم لیگ نے پینتیس کی پینتیس مسلم نشستیں حاصل کر کے سو فیصد کامیابی حاصل کی۔ اس کامیابی سے حصول پاکستان کی جدوجہد کو بہت تقویت ملی کیونکہ یہ دور تحریک پاکستان کا اہم ترین دور تھا۔

3 جون 1947ء کو سندھ اسمبلی کا خصوصی اجلاس منعقد ہوا جس میں اکثریتی رائے سے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ ہوا۔ جب اسمبلی کے سپیکر نے فیصلے کا اعلان کیا تو ایوان اسمبلی پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔

2.6- خودآزمائی نمبر 3

سوال نمبر 1 جملے مکمل کریں۔

الف۔ دسمبر 1932ء میں ..... میں کل ہند بلوچ کانفرنس کے انعقاد کا انتظام کیا گیا۔

ب۔ جون ..... میں بلوچستان میں مسلم لیگ قائم ہوئی۔

ج۔ پاکستان سکیم کے مرتب ہوجانے پر ہمارا صوبہ اسلامستان یا ..... میں آچکا ہے۔

د۔ انتخاب میں نواب محمد خان جوگیزئی کی کامیابی بلوچستان میں تحریک ..... کی کامیابی کا سنگِ بنیاد تھی۔

ر۔ بلوچستان کے سرداروں نے پورے غور کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ بلوچستان کے حقوق کا بہترین تحفظ ..... کے اندر رہنے سے ہوگا۔

سوال نمبر 2 خالی جگہوں کو پر کیجئے۔

الف۔ سب سے پہلے اسلامی مملکت میں شامل ہونے کے ناطے سندھ ..... کہلاتا ہے۔

ب۔ مسلم لیگ کا سب سے پہلا سالانہ اجلاس دسمبر ..... کو کراچی میں ہوا۔

ج۔ طویل کوششوں کے بعد مسلم اکثریت کے علاقے سندھ کو ..... کا درجہ دیا گیا۔

د۔ قائداعظم نے سندھ میں صوبائی مسلم لیگ کانفرنس کی صدارت ..... میں کی۔

ر۔ سندھ برصغیر کا ..... صوبہ تھا جہاں مسلم لیگ نے وزارت بنائی۔

سوال نمبر 3 مختصراً جواب دیجئے۔

الف۔ نواب یوسف علی عزیز مگسی نے کیا خدمات انجام دیں؟

ب۔ سندھ مسلم لیگ کانفرنس 1938ء کی کیا اہمیت ہے؟

2.7- پنجاب میں حصول پاکستان کے لیے جدوجہد

پنجاب برصغیر کی تاریخ میں اہم ترین علاقہ رہا ہے۔ تاریخی اعتبار سے مشرق میں دریائے جمنا سے لے کر مغرب میں دریائے سندھ تک کا وسیع رقبہ ایک مسلم اکثریتی علاقہ تھا لیکن اس کے مشرقی اضلاع میں مسلمانوں کی تعداد مجموعی غیر مسلم آبادی (ہندو اور سکھ) کی نسبت کم تھی۔ انگریز راج کے دوران اس صوبے کے وسطی اضلاع میں نہری نظام کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ زرعی وتجارتی ترقی ہوئی۔ اس تبدیلی کے تحت ایک طرف مشرقی اضلاع سے آبادکار لاکر وسطی اضلاع میں بسائے گئے تو دوسری طرف

بڑی بڑی جاگیروں کو فروغ حاصل ہوا۔ یوں معاشرتی طور پر پنجاب ایسا خطہ بن گیا جہاں پہلے تو مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو اور سکھ دیکھتے دیکھتے برتری حاصل کر گئے دوسرے بعض مسلمان بڑے زمیندار ''انگریز راج کی برکتوں'' کے گرویدہ ہو گئے۔

اس طرح انگریز سے آزادی اور ہندو غلبے سے بچنے کی جدوجہد پنجاب کے مسلمانوں کے لیے بڑی صبر آزما رہی۔ ابتداً کچھ مسلمان رہنما انگریز کو ناخوش کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک انگریز کی خوشنودگی حاصل کرنے میں سب کی بھلائی تھی۔ اس صدی کے آغاز میں عظیم مفکر علامہ محمد اقبال نے مسلمانوں کو آزادی اور اپنے اسلامی تشخص کی بحالی کا درس دیا اور پھر برصغیر کے مسائل کے سیاسی حل کے لیے مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کا قیام تجویز کیا۔ علامہ اقبال ملی تاریخ میں جس بلند مقام پر فائز ہیں اس کا ذکر ابتدائی یونٹ میں ہو چکا۔ یہاں اتنا جان لینا کافی ہے کہ عملی سیاست میں حصہ لیتے ہوئے آپ پنجاب کی صوبائی کونسل کے ممبر بنے اور 32-1931ء میں ہونے والی لندن گول میز کانفرنسوں میں شریک ہوئے۔

علامہ اقبال کے پیغام سے متاثر ہو کر پنجاب میں آزادی اور الگ مسلم ریاست کے قیام کی جدوجہد ابتداً نوجوانوں اور طلباء میں زیادہ مقبول ہوئی۔

انہیں نوجوانوں میں سے انگلستان میں اس وقت کے طالب علم چوہدری رحمت علی نے 1933ء میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے جداگانہ مسلم مملکت کا نام ''پاکستان'' تجویز کیا۔ پاکستان کا لفظ پنجاب، افغانیہ (شمال مغربی سرحدی صوبہ)، کشمیر، سندھ کے ابتدائی حرف اور بلوچستان کے آخری حروف ملا کر بنایا گیا۔ قراردادِ پاکستان کی منظوری سے پہلے 1937ء میں پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن نے حصول پاکستان کو اپنا مطمع نظر طے کیا اور اس کے لیے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا۔

23 مارچ 1940ء کا دن برصغیر جنوبی ایشیا کی سیاسی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دن مسلم لیگ کا ستائیسواں سالانہ اجلاس لاہور میں شاہی مسجد سے ملحقہ پارک میں منعقد ہوا اور مسلمانوں کی منزل ''پاکستان'' قرار پائی۔ اس طرح حصول پاکستان کے لیے جدوجہد کا بھرپور آغاز ہوا۔ اگلے برس مارچ 1941ء کو لاہور میں اور جولائی 1941ء کو فیصل آباد میں ایسی ہی کانفرنسیں منعقد ہوئیں جن میں مطالبۂ پاکستان کی ضرورت اور اہمیت سے مسلم عوام کو متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ حصول پاکستان کی جدوجہد کے لیے انہیں تیار بھی کیا گیا۔ ان میں نوجوانان پنجاب نے خاص طور پر بڑا نمایاں کام کیا۔ انہوں نے گاؤں گاؤں اور شہر شہر دورے کر کے مسلمانوں کو حصول پاکستان کی جنگ کے لیے تیار کیا۔

1946ء کے انتخابات مطالبہ پاکستان کی بنیاد پر لڑے گئے۔ پنجاب میں مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ کو سو فیصد کامیابی حاصل ہوئی یعنی چھ کی چھ مسلم نشستیں حاصل کیں اور صوبائی اسمبلی کی 86 مسلم نشستوں میں سے 75 نشستوں پر مسلم لیگ کو کامیابی حاصل ہوئی۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اس کامیابی پر پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے صدر کو مندرجہ ذیل پیغام بھیجا:

''دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔ پنجاب کے مسلمانوں نے واضح کر دیا کہ پنجاب پاکستان کا سنگ بنیاد

ہے۔ ساری مشکلات کے باوجود نوے فیصد کامیابی ایک شاندار کارنامہ ہے جس پر میں، آپ اور مسلمانان ہند فخر کر سکتے ہیں۔''

پنجاب اسمبلی کے چار مزید مسلم ممبر بعد میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور اس طرح اسمبلی میں مسلم لیگ کو 79 نشستیں حاصل ہو گئیں اور مسلم لیگ اسمبلی کی سب سے بڑی سیاسی جماعت بن گئی لیکن پنجاب اسمبلی میں ہندو اور سکھ نمائندے بھی تھے اور بڑے اثر ورسوخ والے زمینداروں کی جماعت یونینسٹ انگریزوں کی بہی خواہ موجود تھی۔ انگریز وائسرائے کی در پردہ حمایت اور کانگریس کے تعاون سے یونینسٹ پارٹی نے خضر حیات ٹوانہ کی قیادت میں وزارت بنائی لیکن یہ وزارت پنجاب کے مسلمانوں میں مقبول نہ ہو سکی اور جلد ہی مسلم عوام اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ اس تحریک کے دوران میں مطالبۂ پاکستان زیادہ زور وشور سے پیش کیا گیا۔ روزانہ حکومت کے خلاف جلوس نکالے جاتے اور گرفتاریاں پیش کی جاتیں۔ مردوں کے دوش بدوش خواتین بھی اس جدوجہد میں شریک تھیں۔ بیبیوں کی تعداد میں خواتین گرفتار ہوئیں۔ انہی خواتین میں سے فاطمہ صغرا نامی ایک نوجوان خاتون نے پنجاب سیکرٹریٹ کی عمارت پر چڑھ کر انگریزوں کا جھنڈا یونین جیک اتار پھینکا اور مسلم لیگ کا سبز ہلالی پرچم لہرا دیا۔ بالآخر عوام کی تحریک کامیاب ہوئی۔ مارچ 1947ء میں خضر وزارت نے استعفیٰ دے دیا اور صوبے میں گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔

اب گورنر راج کی سختیوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کو کامیاب ہوتے دیکھ کر ان کے خلاف مار کٹائی کا بازار گرم کر دیا۔ کسی نہ کسی شہر میں آئے دن مسلم کش فساد ہونے لگے لیکن ان صبر آزما دنوں میں بھی پاکستان کے حصول کی جدوجہد جاری رکھی گئی۔ بالآخر مسلمانوں کے عزم کو دیکھ کر انگریز اور کانگریس کو مطالبہ پاکستان قبول کرنا پڑا۔

2.8- کشمیر میں حصول پاکستان کے لیے جدوجہد

کشمیر جس کا پورا نام ریاست جموں وکشمیر ہے، ایک مسلم اکثریتی ریاست ہے۔ 1941ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی چالیس لاکھ تھی جس میں 77 فیصد مسلمان تھے۔ ریاست کے ہر صوبے میں مسلمان اکثریت میں تھے البتہ یہاں ایک ہندو راجہ کی داخلی حکمرانی تھی، جس کے آباؤاجداد نے انگریزوں سے یہ حق مبلغ 75 لاکھ روپے کے عوض حاصل کیا تھا۔ لامحالہ اس ریاست میں مسلمانوں کو ہر اعتبار سے محکوم ومجبور بنا کر رکھا گیا۔

1930ء کے بعد جدید تعلیم کے فروغ سے ریاست میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی۔ شیخ عبداللہ اور چوہدری غلام عباس کی رہنمائی میں یہاں کے مسلمانوں نے مل کر نیشنل کانفرنس کی داغ بیل ڈالی ور سیاسی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے حصول کی تحریک کا آغاز کیا۔ ریاست کی حکومت نے اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے بڑے جبر واستبداد سے کام لیا لیکن حکومت اسے دبا نہ سکی۔ اس تحریک کے دوران میں پنجاب کے مسلمانوں نے اپنے کشمیری بھائیوں کی بڑی مدد کی۔ برصغیر میں مسلم لیگ کی تنظیم نو سے متاثر ہو

کر اور ڈوگرہ حکمرانوں سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے کشمیری مسلمانوں نے 1939ء میں چوہدری غلام عباس کی سرکردگی میں مسلم کانفرنس قائم کی۔ اس کے بعد ریاست میں چند دستوری اصلاحات کا اجراء ہوا اور جزوی طور پر منتخب مجلس قانون سازی قائم کی گئی۔

جب برصغیر میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ مملکت کے قیام کی جدوجہد کا آغاز ہوا تو کشمیر کے مسلمان بھی اس تحریک میں شریک ہوئے۔ انہوں نے چوہدری غلام عباس کی قیادت میں مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان کی صرف حمایت ہی نہیں کی بلکہ اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

جون 1947ء میں مونٹ بیٹن پلان کے مطابق جب برصغیر کو آزادی دینے کا اعلان کیا گیا تو ریاستوں کے بارے میں یہ طے کیا گیا کہ ریاستوں کے حکمران بھارت یا پاکستان جس ملک کے ساتھ چاہیں الحاق کر سکتے ہیں لیکن وہ اپنی اپنی ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت عوام کی خواہشات اور ریاست کی جغرافیائی حیثیت کو بھی پیش نظر رکھیں گے۔

ریاست کشمیر میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور کشمیری مسلمان پاکستان کے ساتھ الحاق کے حق میں تھے، نیز وسیع الخیال ہندو بھی یہ چاہتے تھے کہ کشمیر اپنا مستقبل پاکستان سے وابستہ کرے۔ اس کے علاوہ ریاست کا جغرافیائی اور مواصلاتی تعلق پاکستان سے ہے۔ ریاست کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم کانفرنس نے 19 جولائی 1947ء کو ایک قرارداد کے ذریعے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا۔ قرارداد میں کہا گیا کہ:

> ''آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس کے کنونشن کا یہ اجلاس قائداعظم کی کامیابی پر اطمینان کا اظہار کرتا ہے اور انہیں مبارکباد پیش کرتا ہے..... مسلم کانفرنس کا یہ کنونشن اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ جغرافیائی حالات مجموعی آبادی کی اسی فیصد مسلم اکثریت، پنجاب کے اہم دریاؤں کی ریاست میں سے گزرگاہیں، لسانی ثقافتی نسلی اور معاشی تعلقات اور ریاست کی سرحدوں کا پاکستان کی سرحدوں سے اشتراک..... یہ سب حقائق اس امر کو ضروری قرار دیتے ہیں کہ ریاست جموں و کشمیر پاکستان کے ساتھ الحاق کرے۔''

قرارداد میں اس امر کا بھی مطالبہ کیا گیا کہ مہاراجہ ریاست کی آزادی کا اعلان کرے۔ دستور ساز اسمبلی قائم کر کے خود آئینی سربراہ کی حیثیت قبول کرے اور دفاع، مواصلات اور امور خارجہ کے محکمہ جات پاکستان کے سپرد کرے۔ قرارداد میں یہ بات بھی واضح کر دی گئی کہ اگر مہاراجہ نے ان کے علاوہ کوئی اور قدم اٹھایا تو جموں و کشمیر کے مسلمان ہر طرح سے اس کی مخالفت کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔

دوسری طرف انڈین نیشنل کانگریس کشمیر کا الحاق بھارت کے ساتھ چاہتی تھی۔ اس کے لیڈر گاندھی اور اچاریہ کرپلانی نے ریاست کے چکر لگانے شروع کر دیئے اور مہاراجہ سے بھارت سے الحاق کی درخواست کی۔ اس سلسلے میں گاندھی نے مہاراجہ کی بیگم سے ہندو دھرم کا واسطہ دے کر مدد حاصل کی۔ وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن بھی انڈین نیشنل کانگریس کی بھرپور مدد کر رہا تھا۔

اس زمانے میں کشمیر کا وزیر اعظم پنڈت رام چندر کاک تھا جو اگرچہ ہندو تھا تاہم ریاست کے بھارت سے الحاق کا مخالف تھا۔ گاندھی نے اسے وزارت سے برطرف کرا کے مشہور فرقہ پرست ڈوگرہ جرنیل جنگ سنگھ کو وزیر اعظم مقرر کرایا۔ اس نے پاکستان کے حامی لیڈروں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ اس سے ریاست میں امن و امان کی صورتحال خراب ہونے لگی اور کشیدگی بڑھ گئی۔ مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے کے لیے ڈوگرہ فوج نے ظلم وستم ڈھانا شروع کر دیئے۔

اس دوران میں جب 14 اگست 1947ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو ریاست کشمیر کے ہر حصے میں مسلمانوں نے قیام پاکستان کا جشن منایا۔ پاکستان کا پرچم لہرایا گیا اور اسے سلامی دی گئی۔ ریاست کے تمام بڑے شہروں میں پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کے حق میں جلسے منعقد ہوئے اور جلوس نکالے گئے۔ جب ریاست کے مسلمان پاکستان سے الحاق کے حق میں مظاہرے کر رہے تھے تو مہاراجہ کشمیر کانگریس کے ساتھ مل کر ایک اور ہی منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں مصروف تھا۔ اس نے بھارت اور پاکستان دونوں کو ریاست کے ساتھ عارضی معاہدہ قائم کرنے کی دعوت دی۔ پاکستان نے یہ دعوت منظور کر لی لیکن بھارت نے اس کا جواب ہی نہ دیا۔ کچھ عرصے بعد پاکستان نے مہاراجہ سے الحاق کے لیے کہا لیکن مہاراجہ اپنے طویل المیعاد منصوبے کے لیے سازگار حالات کا انتظار کر رہا تھا اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اب تک وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ آخر کار مہاراجہ نے 27 اکتوبر 1947ء کو بھارت کے ساتھ الحاق کا اعلان کر دیا۔

اس وقت ریاست کشمیر میں مسلمانوں پر منظم طریق پر ظلم وستم جاری تھا۔ روزنامہ سٹیٹسمین (Statesman) کلکتہ کے ایڈیٹر آئین سٹیفنز (Ian Stephens) کے مطابق اگست سے لے کر گیارہ ہفتوں کے اندر جموں و کشمیر سے تقریباً پانچ لاکھ مسلمان آبادی کا صفایا کر دیا گیا۔ دو لاکھ تو ایسے نیست و نابود کر دیئے گئے کہ ان کا سراغ تک نہ ملا۔ ریاست میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ڈوگرہ فوج مسلمانوں پر مظالم ڈھا رہی تھی۔ جب کشمیر کے مسلمانوں پر مہاراجہ کی حکومت کے وحشیانہ مظالم کی خبریں قبائلی علاقوں میں پہنچیں تو وہ اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کے لیے کشمیر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جونہی قبائلی مسلمان کشمیریوں کی مدد کے لیے پہنچے، بھارت نے پاکستان پر جارحیت کا الزام لگا کر اپنی فوجیں کشمیر میں داخل کر دیں۔ ریاست میں لڑائی جاری رہی۔ کبھی ایک فریق کا قدم بڑھتا تھا کبھی دوسرے کا۔ بھارت نے معاملہ اقوام متحدہ تک پہنچا دیا۔ بالآخر جنگ بندی ہوئی مگر یہ عالمی ادارہ آج تک مسئلہ کشمیر کا حل تلاش نہ کر سکا۔ کشمیر کے متعلق قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے ایک بیان میں فرمایا تھا کہ:

> ''کشمیر کا مسئلہ نہایت نازک مسئلہ ہے لیکن اس حقیقت کو کوئی انصاف پسند قوم اور ملک نظری انداز نہیں کر سکتا کہ کشمیر تمدنی، ثقافتی، مذہبی، جغرافیائی، معاشرتی اور سیاسی طور پر پاکستان کا ایک حصہ ہے۔ جب بھی اور جس نقطہ نظر سے بھی نقشے پر نظر ڈالی جائے گی، یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ کشمیر سیاسی اور جنگی حیثیت سے پاکستان کی شہ رگ ہے۔ کوئی ملک اور قوم یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اپنی شہ رگ کو دشمن کی تلوار کے نیچے دے دے۔ کشمیر پاکستان کا حصہ ہے۔''

1948ء کی جنگ بندی کے وقت سے آج تک کشمیر ایک متنازعہ علاقہ چلا آ رہا ہے۔ بھارت نے اپنے مقبوضہ علاقے کو بھارت میں مکمل طور پر ضم کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ پاکستان اقوام متحدہ کی قراردادوں اور کشمیری عوام کے خود ارادی کے تحت استصواب رائے کے حق میں ہے۔

3- اجتماعی جدوجہد

پاکستان کے حصول کے لیے جدوجہد کے اس درسی یونٹ میں ہمارا مطالعہ الگ الگ جغرافیائی عنوانات کے ماتحت رہا ہے۔ اس طرح وسیع برصغیر کے تمام خطوں میں کی جانے والی کوششیں نمایاں ہوتی ہیں۔ اس عظیم جدوجہد کے حوالے سے جب ہم پورے برصغیر کا احاطہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک اجتماعی جدوجہد تھی۔ خیبر سے لے کر راس کماری تک، ہر ہر خطے کے مسلمان حصول پاکستان کی جدوجہد میں دل و جان سے شریک تھے۔ بلاشبہ ان کی یہ شرکت برصغیر میں ایک مسلم ریاست کے قیام کی خاطر تھی، جہاں اسلامی طرزِ حیات پر مشتمل معاشرہ قائم کیا جا سکے جو بصورت دیگر ممکن نہ تھا۔

3.1- خود آزمائی نمبر 4

سوال نمبر 1 جملے مکمل کریں۔

الف۔ ..... نامی ایک نوجوان خاتون نے پنجاب سیکرٹریٹ پر مسلم لیگ کا سبز ہلالی پرچم لہرایا۔

ب۔ بالآخر مسلم عوام کی تحریکِ سول نافرمانی کامیاب ہوئی۔ مارچ 1947ء میں ..... وزارت نے استعفیٰ دے دیا۔

ج۔ مسلمانوں کے عزم کو دیکھ کر انگریز اور کانگریس کو ..... قبول کرنا پڑا۔

د۔ کشمیری مسلمانوں نے ..... فی صد سے زائد مسلم آبادی ہے۔

ر۔ کشمیری مسلمانوں نے ..... کی قیادت میں مطالبۂ پاکستان کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

سوال نمبر 2 مختصر جواب دیجئے۔

الف۔ پاکستان کے نام کی ترکیب اور اس کے لفظی معنی بتائیے۔

ب۔ کشمیر کے بغیر پاکستان کس طرح نامکمل ہے؟ کم از کم تین اہم وجوہات بتائیے۔

سوال نمبر 3 پنجاب میں تحریک سول نافرمانی پر مختصر نوٹ لکھئے۔

یونٹ 6

ظہورِ پاکستان

تحریر:
ڈاکٹر محمد اسلم سید

فہرست مضامین

یونٹ کا تعارف 198

یونٹ کے مقاصد 198

1۔ برطانوی اندازِ فکر اور ہندوستانی حقائق 199

-1.1 متحدہ جنوبی ایشیا کے لیے برطانوی خواہش 199

-1.2 جنوبی ایشیا میں متصادم نظریات آزادی 199

-1.3 برطانیہ کا جنوبی ایشیا چھوڑنے کا فیصلہ 200

-1.4 خود آزمائی نمبر 1 200

2۔ ماؤنٹ بیٹن کا مشن 201

-2.1 ماؤنٹ بیٹن کی شخصیت 201

-2.2 لندن سے ہدایات 201

-2.3 کانگریس سے تعلقات 201

-2.4 سیاسی صورتحال 201

-2.5 فرقہ وارانہ آویزش 202

-2.6 مسلم ہندو نقطہ نظر 202

-2.7 وی پی مینن اور کانگریس سے رابطہ 202

-2.8 خود آزمائی نمبر 2 203

-3 پاکستان کے لیے تیاری 204

-3.1 برطانوی پالیسی میں تبدیلی 204

-3.2 منصوبہ پاکستان کے لیے تیاری 204

-3.3 انتقال اقتدار کی تاریخ 205

-3.4	تقسیم کا منصوبہ	206
-3.5	مشترکہ گورنر جنرل	206
-3.6	اعلان	207
-3.7	تشکیل پاکستان	207
-3.8	خود آزمائی نمبر 3	208
4۔	باؤنڈری کمیشن	210
-4.1	مسئلہ	210
-4.2	دو کمیشن	210
-4.3	دیگر عوامل	211
-4.4	خود آزمائی نمبر 4	211
5۔	ریڈکلف ایوارڈ	212
-5.1	بنگال	212
-5.2	پنجاب	213
-5.3	عمومی نتائج	215
-5.4	فیصلے کا اعلان	215
-5.5	پاکستان کے لیے مضمرات	216
-5.6	اس کے بعد	216
-5.7	خود آزمائی نمبر 5	217
-6	ظہورِ پاکستان	218
-6.1	خود آزمائی نمبر 6	218
7۔	تشریحات	219
8۔	کتابیات	220

یونٹ کا تعارف

یہ یونٹ ظہورِ پاکستان کے آخری مراحل سے متعلق ہے۔ اس کے افتتاحی باب میں دوسری عالمی جنگ کے بعد برصغیر جنوبی ایشیا کے بارے میں برطانوی طرزِفکر کا جائزہ لیا گیا ہے اور مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کے آزادی کے بارے میں متصادم نقطہ ہائے نظر پر بھی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ دوسرا باب ماؤنٹ بیٹن کے کردار پر بحث کرتا ہے۔ اس میں لندن سے ملنے والی ہدایات، کانگریس پارٹی سے اس کے تعلقات اور آزادی کا مسئلہ حل کرنے کے لیے اس کے ابھرتے ہوئے نقطہ نظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرے باب میں ان واقعات پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ جن کے نتیجے میں تقسیم عمل میں آئی۔ ان میں برطانیہ کی طرف سے اس مطالبے کی منظوری، منصوبہ تقسیم کی تیاری اور اس سے متعلق دیگر سوالات یعنی انتقال اقتدار کی تاریخ، دولت مشترکہ کی رکنیت اور مشترک گورنر جنرل کا مسئلہ شامل ہیں۔ چوتھا اور پانچواں حصہ باؤنڈری کمیشنوں کی کارگزاری، پنجاب اور بنگال کی تقسیم اور ریڈ کلف ایوارڈ کے بارے میں ہے۔ اس حصے میں ہندوستان اور پاکستان کے مابین کھینچی جانے والی باؤنڈری لائنوں کے نتائج و عواقب اور دونوں ملکوں کے مستقبل کے تعلقات پر اس کے اثرات کا بھی تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد طلباء اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1- دوسری عالمی جنگ کے فوراً بعد برصغیر جنوبی ایشیا کے بارے میں برطانوی طرزِفکر کا خاکہ بنا سکیں۔

2- انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین ان اختلافات کی وضاحت کر سکیں جو آزادی کے بعد برصغیر کے سیاسی انتظامات سے متعلق تھے۔

3- ماؤنٹ بیٹن کے مشن کے مقاصد پر، جو طریقہ کار اس نے اپنے کام کے لیے اختیار کیا، بحث کر سکیں۔

4- وہ عمل جو تقسیم پر منتج ہوا اور اس سے متعلق اہم مسائل، بیان کر سکیں۔

5- پنجاب اور بنگال کے باؤنڈری کمیشنوں کی کارگزاری کا تجزیہ کر سکیں۔

6- ان بڑے واقعات کا خلاصہ جو ظہورِ پاکستان میں مددگار ثابت ہوئے، بیان کر سکیں۔

1- برطانوی اندازِ فکر اور ہندوستانی حقائق

انگریزوں کو اپنے حقوق کے تحفظ اور دوسری عالمی جنگ کے دوران بین الاقوامی سیاست میں اپنی بالادستی کے لیے ایک متحدہ ہندوستان کی اہمیت کا احساس ہو چکا تھا۔ ہندوستانی فوج نے مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا میں ان کے لیے جنگیں لڑیں اور محوری طاقتوں کے مقابلے میں اتحادیوں کو فتح و نصرت سے ہمکنار کرایا۔ دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کی شمولیت اور سرگرم شرکت اس کی معیشت کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی اور صاف دکھائی دینے لگا کہ تمام وسائل پر دسترس کے باوجود وہ اس پوزیشن میں نہیں رہے گا کہ جنوبی ایشیا میں اپنی مملکت کا انتظام چلا سکے۔ مزید برآں برطانوی حکومت کو اس دباؤ کا بھی احساس تھا جو نوآبادیوں کی آزاد کرانے کے لیے متوقع تھا۔ ان تمام عوامل کے پیش نظر اس نے اپنی مملکت کو آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

1.1- متحدہ جنوبی ایشیا کے لیے برطانوی خواہش

برطانیہ برصغیر جنوبی ایشیا کو چھوڑنا چاہتا تھا لیکن آزاد جنوبی ایشیا اس کی نظر میں ایک ایسی وحدت تھی جس میں ہندو اکثریت کا غلبہ ہو۔ اس کے عالمی مفادات اور اس کا وقار، بحیثیت سربراہ دولت مشترکہ صرف اسی صورت میں محفوظ رہ سکتا تھا جب سارا جنوبی ایشیا ایک وحدت کی طرح اس کی پشت پر ہو۔ برطانوی وائسرائے لارڈ ویول نے ترغیب، تحویف اور سازش ہر طرح سے اپنی پوری کوشش کی کہ جنوبی ایشیا کے مسلم طبقے کو پاکستان کا خیال دل سے نکالنے پر مجبور کیا جائے۔ وہ جنوبی ایشیا کی جغرافیائی وحدت کا زبردست معتقد تھا اور کئی موقعوں پر ان لوگوں سے شدید اختلاف رائے کا اظہار کر چکا تھا۔ جو یہاں کے مسلمانوں کے لیے پاکستان کی صورت میں ایک آزاد اور الگ وطن چاہتے تھے۔ ویول کے آخری ایام اس اعتبار سے نمایاں تھے کہ اس نے اپنی اس شدید خواہش کو بروئے کار لانے کے لیے کسی قسم کا آئینی یا سیاسی فارمولا بنانے کی بے حد کوشش کی تاکہ انگریزوں کو اس وسیع مملکت کو تقسیم ہونے سے بچایا جا سکے اور اس سمت اپنی کوششوں میں اس نے سیاسی حقائق کو کلیتاً نظر انداز کر دیا۔

1.2- جنوبی ایشیا میں متصادم نظریات آزادی

آل انڈیا مسلم لیگ اس امر کی مدعی تھی کہ وہ مسلمانان ہندوستان کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ دعویٰ 1946ء کے انتخابات میں صحیح ثابت ہوا اور مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کی حیثیت سے ابھری۔ مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان اب چند افراد کا مطالبہ نہ رہا تھا بلکہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن بن چکا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس ایک سیکولر جماعت ہونے کے دعویٰ کے باوجود ایک فرقہ وارانہ جماعت کی حیثیت سے ابھری جس کی رہنمائی ہندو فلاسفی اور مالی معاونت ہندو مہاجن کر رہے

تھے۔ یہ جماعت ہندوانڈیا کی نمائندہ تھی اور ایک ایسے مرتکز اور متحدہ جنوبی ایشیا کی علمبردار تھی جس میں ہندوؤں کا غلبہ ہو۔ کانگریس مسلمانوں کو مناسب رعایتیں دینے کے لیے تیار تھی۔ اس طرح کی دونوں قوتیں .....ہندو اور مسلمان .....متصادم تصورات کی وکالت کر رہی تھیں لیکن ایک نمایاں فرق یہ تھا کہ ہندوؤں کا آزاد ہند کا تصور برطانوی نقطہ نظر سے پوری طرح ہم آہنگ تھا جبکہ مسلمانوں کا مطالبہ پاکستان برطانوی پالیسی سے کسی طرح بھی ہم آہنگ نہ تھا۔

1.3- برطانیہ کا جنوبی ایشیا چھوڑنے کا فیصلہ

انگریز ان وجوہ کی بناء پر جن کا تفصیلی ذکر ہو چکا ہے، چاہتے تھے کہ جتنی جلد ممکن ہو اس کے نمائندوں کو اقتدار منتقل کر کے یہاں سے چلے جائیں۔ لارڈ ویول نے تمام متبادل امکانات سے تھک ہار کر سپر گورنمنٹ کو دو تجاویز پیش کیں ایک میں کہا گیا تھا کہ برطانوی انتظام ایک عشرے تک جاری رہے اور ایسے اقدامات کئے جائیں جو برطانوی حکومت کو مؤثر بنا سکیں دوسری تجویز میں مشورہ دیا گیا کہ جن صوبوں میں پہلے ہی کانگریس کا کنٹرول ہے وہاں اسے انتقال اقتدار کر دیا جائے اور پھر دوسرے صوبوں سے تدریجاً اخراج اختیار کیا جائے۔ سیاسی اخراج کے بعد فوجی اخراج عمل میں آئے۔ لیبر گورنمنٹ نے ان دونوں تجاویز کو مسترد کر دیا۔ وزیراعظم ایٹلی نے 20 فروری 1947ء کو ایک بیان میں برطانیہ اور اس کی نوآبادیوں کے لیے ویول کی خدمات کو سراہا اور اس کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقرری کا اعلان کیا۔ ایٹلی نے یہ بھی واضح کیا کہ برطانیہ جون 1948ء تک ہندوستان چھوڑنے کا تہیہ کر چکا ہے اس نے زور دیا کہ اب یہ ہندوستانی لیڈروں پر منحصر ہے کہ وہ ذاتی عداوتوں کی شخصی دنیا سے نکل کر عوامی ذمہ داریوں کو حقیقی دنیا میں آئیں۔

1.4- خودآزمائی نمبر 1

سوال نمبر 1 دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر ہندوستانی مملکت کے بارے میں برطانوی رویئے کی تفصیل بیان کریں۔ (اپنے سوال کی پڑتال باب 1.1 تا 1.3 سے کریں۔ آپ کے جواب میں اس امر کی طرف بھی اشارات ہونے چاہئیں کہ انگریزوں نے ہندوستان کو آزاد کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟ وہ کیوں چاہتے تھے کہ آزاد ہندوستان متحد رہے؟ لارڈ ویول کی تجاویز اور ان پر ایٹلی گورنمنٹ کا ردِعمل کیا تھا؟)

سوال نمبر 2 آزادی کے مسئلے پر مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس کی پالیسیوں میں سب سے بڑا اختلاف کون سا تھا؟ (جواب کا جائزہ 1.2 کی روشنی میں لیں۔)

2- ماؤنٹ بیٹن کا مشن

2.1- ماؤنٹ بیٹن کی شخصیت

وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اپنے پیشرو پر دو اعتبار سے فوقیت حاصل تھی (الف) وہ شہنشاہ انگلستان کا رشتہ دار تھا اور اس طرح اسے برطانوی افسران کی بے مثل وفاداری حاصل تھی۔ (ب) وہ جنوبی ایشیا کے لیے ایک اجنبی نہ تھا۔ وہ پیشتر ازیں جنوب مشرقی ایشیا کا کمانڈر انچیف رہ چکا تھا۔ ان خوبیوں کے علاوہ وہ نوجوان (عمر 46 سال) بھی تھا اور چست و چالاک بھی۔ پبلسٹی سے اس کا لگاؤ اور سماجی سرگرمیوں میں شمولیت اسے بہت سے کانگریس رہنماؤں کے قریب لے آئی جنہوں نے اس کے ذوق خودنمائی کی تسکین کے لیے اس کے کارناموں کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنا شروع کر دیا۔

2.2- لندن سے ہدایات

برطانوی وزیراعظم کی طرف سے ماؤنٹ بیٹن کو جو ہدایات دی گئی تھیں وہ برطانیہ کی جنوبی ایشیا کو متحد رکھنے کی خواہش سے پوری طرح ہم آہنگ تھیں اسے کہا گیا تھا کہ اگر ممکن ہو تو وہ برطانوی ہندوستان میں برطانوی دولت مشترکہ کے اندر ایک دستور ساز اسمبلی کے ذریعے ایک وحدانی حکومت قائم کرے اور اسے کابینہ مشن پلان کے مطابق چلائے اور اس نکتے کی طرف تمام جماعتوں کو موڑنے کے لیے جو کچھ ہو سکتا ہے کرے۔ تاہم وزیراعظم نے اس امر کا اضافہ کر دیا تھا کہ کسی بڑی جماعت پر کوئی فارمولا مسلط نہ کیا جائے۔

2.3- کانگریس سے تعلقات

اپنی تمام تر دلکشی اور شاہی روابط سے مزین ماؤنٹ بیٹن اس امر کو یقینی بنانے آیا تھا کہ کچھ بھی ہو ہندوستان کو دولت مشترکہ کے ڈھانچے کے اندر رہنا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ جنوبی ایشیا کی مضبوط تر جماعت کانگریس کی خوشنودی حاصل کر سکے تو اس کا کام آسان تر ہو جائے گا۔ یہ امر نہ صرف انتقال اقتدار کے متعلق اس کی پالیسیوں کو آسان بنا دے گا بلکہ اس سے آزاد جنوبی ایشیا کے دولت مشترکہ کی رکنیت حاصل کرنے کی فضا بھی سازگار ہو جائے گی۔ چنانچہ اس کے پیش نظر سب سے اہم مرحلہ کانگریسی قیادت کے ساتھ دوستانہ روابط کو استوار کرتا تھا۔

2.4- سیاسی صورتحال

ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان کی سیاسی صورتحال کا جائزہ لینا شروع کیا بنگال اور سندھ میں مسلم لیگی وزارتیں کام کر رہی

تھیں۔ انگریز پنجاب کی حکومت لیگ کے حوالے کرنے سے ہچکچا رہے تھے اس لئے وہاں گورنر راج نافذ تھا۔ دیگر تمام صوبوں بشمول شمال مغربی سرحدی صوبہ آسام میں کانگریس کی وزارتیں تھیں۔ تاہم موخر الذکر دونوں صوبوں میں لیگ سے اپنی حمایت کا اظہار کرنے کے لیے لوگوں نے کانگریس وزارتوں کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک چلا رکھی تھی۔ دستور ساز اسمبلی میں کانگریس پارٹی، مسلمانوں کے جائز مطالبات کو نظرانداز کئے جا رہی تھی کہ کانگریس رہنما لیگ کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے اور نجی طور پر کچھ مسلمان رہنماؤں سے اسمبلی میں شرکت کرنے پر اصرار کر رہے تھے۔ اقتدار اور برطانوی تائید سے بدست کانگریس ان اقدامات کو بھی نظرانداز کر رہی تھی جن کا اس نے کابینہ مشن پلان کے مطابق اقرار کیا تھا۔

2.5- فرقہ وارانہ آویزش

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین بڑھتی ہوئی کشیدگی اب ایک خطرناک مرحلے پر پہنچ چکی تھی۔ 1946ء میں فرقہ وارانہ فسادات میں وہ ایک دوسرے کو اکٹھا رہنے کی مشکلات کا مظاہرہ کر چکے تھے۔ اس سے قبل صرف ہندوستان کی شہری آبادی اور سیاسی عناصر ان واقعات میں ملوث تھے لیکن اب یہ محسوس کیا گیا کہ فوج، پولیس اور امن عامہ کا تحفظ کرنے والے دیگر ادارے بھی سروسز کے نقطہ نگاہ سے سوچنے کی بجائے ہندو اور مسلمان کے خطوط پر سوچ رہے ہیں۔ مسلمان اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اس صورتحال سے مضطرب تھے۔

2.6- مسلم ہندو نقطہ نظر

ماؤنٹ بیٹن نے ہندو اور مسلمان رہنماؤں کے ساتھ ملاقاتوں کا اہتمام کیا۔ رہنماؤں سے گفتگو کے دوران اسے معلوم ہوا کہ مسئلہ تو حقیقت میں تقریباً طے ہو چکا ہے۔ مسلمان ہر قیمت پر پاکستان چاہتے تھے اور ہندو وحدانی اور مرکزی حکومت۔

پاکستان کے بارے میں ہندو نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے ایک انگریز جنرل نے لکھا ہے۔ اچھا! اگر مسلمان پاکستان چاہتے ہیں تو وہ پاکستان لے لیں مگر ہم ہر ممکن کوشش کریں گے کہ پاکستانی علاقے بھارت کو دے دیئے جائیں تاکہ یہ حرکت بیوقوفانہ لگے اور یہ ملک زیادہ دیر قائم نہ رہ سکے۔ اور جب وہ پاکستان لے لیں گے تو ہم اس بات کا یقین کریں گے کہ وہ معاشی طور پر تباہ ہو جائے۔

2.7- وی پی مینن اور کانگریس سے رابطہ

ماؤنٹ بیٹن کے عملے میں ایک ہندو افسر وی پی مینن بھی شامل تھا جو وائسرائے کا آئینی مشیر تھا۔ ماؤنٹ بیٹن عموماً ہر مسئلے پر اپنے سٹاف ممبروں کے ساتھ بے تکلف اور غیر رسمی ملاقاتوں میں آزادانہ بحث کیا کرتا تھا۔ وی پی مینن بھی ان جلسوں میں شریک

ہوتا تھا اور ہر ایک کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ وہ ولبھ بھائی پٹیل کا ایک معتمد ساتھی تھا۔ کانگریسی لیڈروں کے ساتھ اس رابطے کے نتیجے میں کئی ایک فیصلے ہوئے اگرچہ وہ فیصلے وائسرائے نے کیے لیکن وہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی تشکیل کانگریس ہائی کمان نے کی تھی۔ مینن وائسرائے کے ساتھ نجی ملاقاتوں میں کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے ہی کام نہ کرتا بلکہ کانگریس کو وائسرائے کی رہائش گاہ میں ہونے والی ہر پیش رفت سے مطلع رکھتا۔ یہ مسلمانوں کے ساتھ ایک کھلم کھلا زیادتی تھی یہ سوچنا بھی ناممکنات میں سے ہے کہ ایک مسلمان کو، یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ لیگ کی قیادت سے رابطہ رکھے ہوئے ہے اس قسم کی پوزیشن دی جاتی۔ ہندوؤں کو یہ ناجائز فائدہ دیا گیا جس سے انہوں نے استفادہ کیا۔

اس طرح شروع سے ہی مسلمانان ہند کی تاریخ کے ان انتہائی نازک لمحات میں وائسرائے نے کانگریس نواز رویہ اختیار کر لیا۔

2.8- خود آزمائی نمبر 2

سوال نمبر 3 کیا آپ ماؤنٹ بیٹن مشن کے بارے میں مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات دے سکتے ہیں؟

الف۔ وہ کون سی شخصی خوبیاں تھیں جن کی بناء پر برطانیہ حکومت نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اس کام کے لیے درست آدمی تصور کیا؟

ب۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو لندن سے کون سی ہدایات بھیجی گئی تھیں؟

ج۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے لیے کانگریس کے رہنماؤں کی دوستی کیا اہمیت رکھتی تھی؟

(اپنے جوابات کو ابواب 2.1، 2.3 میں کی گئی بحث کی روشنی میں چیک کریں)۔

سوال نمبر 4 لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ہندوستان میں آمد کے موقع پر موجود سیاسی صورت حال کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر 5 ہندو اور مسلمان لیڈروں کے ساتھ اپنے مذاکرات میں ماؤنٹ بیٹن نے کیا نتیجہ اخذ کیا؟ وضاحت کریں۔

سوال نمبر 6 اس دور میں وی پی مینن کا کردار کیا رہا ہے؟ وائسرائے اور کانگریس پارٹی کے مابین تعلقات کے ضمن میں اس کی اہمیت کیوں تھی؟

3- پاکستان کے لیے تیاری

3.1- برطانوی پالیسی میں تبدیلی

ماؤنٹ بیٹن کو برطانوی وزیر اعظم نے خصوصی طور پر کابینہ مشن پلان کی قبولیت کے لیے کوششیں کرنے پر زور دیا تھا لیکن کانگریس نے اس میں اس حد تک ردوبدل کر دیا تھا کہ مسلم لیگ کے پاس اس کے سوا اور کوئی متبادل صورت موجود نہ تھی کہ برطانوی مملکت کو دو آزاد ملکوں میں تقسیم کرنے کے لیے منصوبہ تیار کر لے۔ مسلم اکثریتی علاقے پاکستان کو دیئے جانے تھے لیکن اس عمل کے لیے بنگال اور پنجاب کو تقسیم کیا جانا تھا۔

3.2- منصوبہ پاکستان کے لیے تیاری

(الف) صوبائی گورنروں کی کانفرنس: ماؤنٹ بیٹن نے اپنے منصوبے پر بحث وتمحیص کرنے کے لیے 16,15 اپریل کو صوبائی گورنروں کی ایک کانفرنس طلب کی جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اس نے ان صوبوں میں ہندو اقلیتوں کے مطالبے کی وجہ سے بنگال اور پنجاب کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا یہ ایک ستم ظریفی ہے کہ کانگریس جو اس بنیاد پر تخلیق پاکستان کی مخالف تھی کہ ہندو اور مسلمان جداقومیں نہیں ہیں اب انہی دلائل کی بناء پر پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر اصرار کر رہی تھی جو مسلمانوں نے دوقومی نظریے کے لیے پیش کیے تھے۔ آسام میں سلہٹ کے مسلم اکثریتی اضلاع کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ مسلم بنگال (مشرقی بنگال) میں شامل ہو سکتے ہیں اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں عام انتخابات ہونے قرار پائے۔ گورنران نکات پر متفق ہو گئے۔ پنجاب اور بنگال کے گورنروں نے تاہم تقسیم کے مسائل پر روشنی ڈالی۔ گورنر پنجاب خاص طور پر پنجاب کے علاقے پر ہندوؤں اور سکھ جاٹوں کے دعویٰ کی بناء پر متوشش تھا اس نے دن بدن بگڑتی ہوئی فرقہ وارانہ صورتحال کی طرف بھی اشارہ کیا۔

(ب) شمال مغربی سرحدی صوبہ: شمال مغربی سرحدی صوبے کی سیاسی صورت کا جائزہ لینے کے لیے ماؤنٹ بیٹن نے صوبے کا دورہ کیا۔ صوبہ سرحد میں کانگریس کی وزارت تھی لیکن لوگوں کی اکثریت لیگ کے حق میں تھی چنانچہ لیگ نے اس بناء پر صوبہ میں انتخابات کا مطالبہ کیا۔ کانگریس کو احساس تھا کہ انتخابات کا مطلب اس کی وزارت کا خاتمہ ہوگا۔ چنانچہ اس نے اس خیال کی مخالفت کی۔

وائسرائے متعلقہ افراد کے احساسات جاننا چاہتا تھا، اس نے گورنر، وزیر اعلیٰ اور لیگی لیڈروں سے ملاقات کی جنہیں گورنر سے ملاقات کی خاطر جیل سے رہا کر دیا گیا تھا صوبے کے اس دورے نے ماؤنٹ بیٹن کو قائل کر لیا کانگریسی اور لیگ کے

متضاد دعویٰ کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک ریفرنڈم ضروری ہے۔

(ج) **مسلم افواج کی تنظیم نو:** یہ جانتے ہوئے کہ برطانوی مملکت میں سے دو آزاد ملک جلد ہی معرض وجود میں آنے والے ہیں، لیاقت علی خان نے وائسرائے کو ایک خط لکھا جس میں مسلح افواج کی تنظیم نو کی تجویز پیش کی گئی تا کہ آزادی کے بعد دونوں ملکوں کی اپنی اپنی فوج ہو۔ یہ ایک ٹھوس تجویز تھی لیکن کانگریس نے فوج کو تقسیم کرنے کی تجویز نامنظور کر دی۔ وائسرائے نے مسئلے کی نزاکت کا کوئی خیال نہ کرتے ہوئے لیاقت علی خان کی پیش کردہ تجویز کو مسترد کر دیا۔ انگریز اپنی مملکت کے سیاسی انجام سے قطع نظر ایک مرکزی ادارے کے تحت ایک فوج رکھنا چاہتے تھے۔

3.3- انتقال اقتدار کی تاریخ

ماؤنٹ بیٹن نے مملکت کو دو آزاد ریاستوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے اپنے اس فیصلے کی اطلاع لندن میں برطانوی حکومت کو دے دی تھی۔ اب اسے دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کے لیڈروں سے یقین دہانی درکار تھی کہ وہ برطانوی دولت مشترکہ میں شامل ہو جائیں گے۔

(الف) **دولت مشترکہ کی رکنیت، ہندوستان کے مطالبات:** دولت مشترکہ کا رکن بننے کے لیے ملک کو آزاد خودمختار نہیں بلکہ ڈومینن کا درجہ ہونا چاہیئے کانگریس نے اعلان کر دیا تھا کہ ہندوستان ایک خودمختار جمہوریہ ہوگا لیکن یہ ایک جال تھا کہ کانگریس ہائی کمان دولت مشترکہ میں شمولیت کے لیے قیمت وصول کرنا چاہتی تھی جو کہ برطانوی وائسرائے کو پاکستان کی صورت میں ادا کرنا تھی۔ برطانوی وزیراعظم نے اعلان کر دیا تھا کہ انگریز جون 1948ء تک ہندوستان چھوڑ دیں گے۔ کانگریس نے ڈومینن کا درجہ قبول کرنے اور دولت مشترکہ کی رکنیت حاصل کرنے کی شرط یہ لگائی کہ جلد سے جلد انتقال اقتدار کر دیا جائے۔ ماؤنٹ بیٹن نے یہ مطالبہ قبول کر لیا اور انتقال اقتدار کے فوری منصوبے پر کام شروع کر دیا۔

(ب) **پاکستان کی مشکلات:** انتقال اقتدار میں تاخیر پاکستان کے لیے سودمند ثابت ہوسکتی تھی۔ اس سے اسے ایک انتظامی ڈھانچہ تشکیل دینے کے لیے کچھ وقت مل جاتا لیکن جو چیز پاکستان کو مدد دے سکتی تھی۔ وہ ہندوستانی اور برطانوی لیڈروں کے لیے قطعاً قابل قبول نہ ہوسکتی تھی۔ دوسری طرف ہندوستان کو برطانوی حکومت کا پورا پورا انتظامی ڈھانچہ ورثے میں مل رہا تھا۔ انتقال اقتدار میں کوئی تاخیر ہوتی یا نہ ہوتی اس پر شاید ہی کوئی اثر مرتب ہوتا اس کے برعکس پاکستان کو اضافی وقت چاہیئے تھا اور انتقال و اختیارات میں تاخیر اس کے لیے خاص معاونت بخش ثابت ہوسکتی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے جسے غیر جانبداری کا دعویٰ تھا۔ مسلمانوں کے نقطہ نظر پر کوئی توجہ نہ دی بلکہ اس نے طنزیہ انداز میں کہا: انتظامی طور پر ایک مستقل عمارت کھڑی کرنے اور جھونپڑی بنانے یا خیمہ لگانے میں فرق ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ہم صرف ایک خیمہ کھڑا کر رہے ہیں۔ ہم اس سے

زیادہ نہیں کر سکتے۔

3.4- تقسیم کا منصوبہ

انتقال اقتدار کے لیے تاریخ اگست کے وسط کے لگ بھگ طے کی گئی۔ ماؤنٹ بیٹن نے ایک منصوبہ تیار کیا لیکن اسے حتمی صورت دینے سے پہلے اس نے اسے نہرو کو دکھایا جس نے کئی اہم ترمیمات کیں اور اسے واپس بھیجا۔ آخری ڈرافت وی پی مینن نے تیار کیا۔ اس منصوبے کی اہم دفعات حسب ذیل تھیں۔

الف۔ یہ کہ رہنما تقسیم ہند کے بارے میں لوگوں کی خواہشات دریافت کرنے کے لیے حسب ذیل طریقہ کار کے بارے میں متفق ہیں۔

ب۔ یہ کہ اگر ہندوستان ایک مرکزی اتھارٹی کے تحت رہے تو انتقال اقتدار موجودہ دستور ساز اسمبلی کو کیا جائے گا۔

ج۔ یہ کہ اگر دو ریاستیں بنائی جائیں تو اقتدار ان کی دستور ساز اسمبلیوں کو منتقل کیا جائے گا۔

د۔ یہ کہ انتقال اقتدار ہر دو صورتوں میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کی بنیاد پر ہوگا جس میں درجہ ڈومینن کے مطابق مناسب ترمیم کی جائے گی۔

ر۔ یہ کہ گورنر جنرل دونوں ریاستوں کا مشترکہ ہوگا اور موجودہ گورنر جنرل کی از سر نو تقرری کی جائے گی۔

س۔ یہ کہ تقسیم کے موقع پر حدود کے تعین کے لیے ایک کمیشن کا تقرر کیا جائے گا۔

ش۔ یہ کہ صوبائی گورنروں کو مرکزی حکومت کی سفارشات پر مقرر کیا جائے گا۔

ص۔ دو ریاستیں قائم ہونے کے ساتھ ہی مسلح افواج ان میں تقسیم ہو جائیں گی۔

3.5- مشترکہ گورنر جنرل

ان میں سب سے اہم دفعہ (ر) مشترکہ گورنر جنرل کے بارے میں تھی۔ جو اس لیے رکھی گئی کہ جنوبی ایشیا بظاہر ایک وحدت معلوم ہو۔

دو آزاد ملکوں کے لیے ایک گورنر جنرل 1935ء کے ایکٹ کے وسیع اختیارات کے ساتھ کچھ بھی کر سکنے کی پوزیشن میں تھا۔ بالخصوص جب کہ پاکستان کے بارے میں ماؤنٹ بیٹن کے تحفظات اور ہندو لیڈروں سے اس کی قریبی تعلق داری پر ایک کے علم میں تھی۔ نہرو نے فوراً اس کی منظوری دے دی۔ جب ماؤنٹ بیٹن نے منصوبہ قائداعظم کو دکھایا تو ان پر زور دیا کہ اسے فوری منظور کر لیں بصورت دیگر کانگریس کئی مسائل کھڑے کر دے گی۔ قائداعظم منصوبے سے متفق ہو گئے لیکن مسلم لیگ کی منظوری کی

شرط رکھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم کو دھمکیاں دیں کہ اگر وہ اس منصوبے سے متفق نہ ہوئے تو برطانوی حکومت اقتدار ہندو اکثریت کے حوالے کر دے گی اور پھر ہندو اور مسلمان اپنے مسائل خود آپس میں حل کریں گے۔

مسلمان رہنما کے لیے یہ ایک صدمہ آمیز چیز تھی یہ وہی بات تھی جو گاندھی عرصہ دراز سے کہہ رہا تھا اور انگریزوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کئے رکھا۔ قائداعظم نے خاموشی سے اس خبر کو سنا اور وائسرائے کو کہا کہ اگر انگریزوں نے اس منصوبے پر عمل کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے تو وہ کیا کر سکتے ہیں۔

3.6- اعلان

منصوبے کا اعلان برطانوی پارلیمینٹ میں 3 جون کو کیا گیا۔ اگلے روز مختلف طبقوں کے رہنماؤں نے ایک نشریئے میں اس منصوبے کو قبول کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ اس طرح مسلم لیگ کا مطالبہ پاکستان تو پورا ہو گیا لیکن اس کے نفاذ کی ترکیب و ترتیب کانگریس کے ہاتھوں میں چھوڑ دی گئی۔ مینن، پٹیل، نہرو، ماؤنٹ بیٹن ..... تمام نے مطالبہ پاکستان بحالت مجبوری اپنی ہندوستان کو ایک وحدت رکھنے کی مساعی کے برخلاف تسلیم کیا تھا۔ پاکستان کو صرف 72 دن دیئے گئے کہ ان میں اپنا انتظامی ڈھانچہ تشکیل دے لے ..... ایک بار پھر وہ برٹش ہندو قیادت کے رحم و کرم پر تھا کیونکہ ساری انتظامی مشینری انہی کے کنٹرول میں تھی۔

3.7- تشکیل پاکستان

پاکستان کو صرف بنگال اور پنجاب کے دو صوبوں کی تقسیم کی صورت میں ہی قیمت ادا نہ کرنی پڑی بلکہ اسے مسلم اکثریتی علاقوں میں بھی اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے عام ووٹ کے ذریعے سے ثبوت دینا پڑا۔ بھارت پر ایسی کوئی شرط نافذ نہ کی گئی تھی۔ پاکستان کے ساتھ ایک نافرمان بیٹے کا سا سلوک کیا گیا۔ جس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ اپنا جائز حق تسلیم کروانا چاہتا تھا۔ اس کے برعکس ہندو انگریزوں کے چہیتے بیٹے بن گئے۔ جن پر انعام و اکرام کی بارش ہوئی اور نہرو نہ صرف بھارت کے لیے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کرنے میں کامیاب ہوا بلکہ برطانوی سلطنت کا لے پالک بن کر ابھرا۔

(الف) پنجاب اور بنگال کی تقسیم: پنجاب اور بنگال کی صوبائی اسمبلیوں نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا تھا تاہم اکثریتی فیصلہ جائز تصور نہ کیا گیا اور مسلم اکثریتی اضلاع اور غیر مسلم اکثریتی اضلاع کے نمائندوں کے علیحدہ علیحدہ اجلاس ہوئے اول الذکر نے کثرت رائے سے صوبوں کی تقسیم کے خلاف ووٹ دیا اور موخر الذکر نے کثرت رائے سے تقسیم کے حق میں رائے دی۔ اس کے نتیجے میں دو صوبوں کی تقسیم عمل میں آئی۔ مشرقی بنگال اور مغربی پنجاب کو پاکستان میں شامل کیا گیا اور مغربی بنگال اور مشرقی پنجاب کو

ہندوستان میں۔

(ب) پاکستان کے حق میں فیصلے: آسام کے ضلع سلہٹ میں ریفرنڈم ہوا پاکستان کو اس ریفرنڈم میں 184,41 کے مقابلے میں 239,619 ووٹوں سے کامیابی ہوئی اور یہ ضلع مشرقی بنگال میں شامل کرلیا گیا۔

سندھ کی صوبائی اسمبلی نے کثرت رائے سے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔ بلوچستان میں شاہی جرگہ کے ارکان اور کوئٹہ میونسپلٹی کے غیر سرکاری ارکان کو فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا انہوں نے متفقہ طور پر پاکستان میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ خان آف قلات نے بھی پاکستان میں شمولیت پر رضامندی ظاہر کی۔

کانگریس نے شمال مغربی سرحدی صوبے میں ریفرنڈم کی مخالفت کی لیکن جب یہ طے ہوگیا کہ صوبے کے لوگوں کی رائے طلب کی جائے گی تو گاندھی نے عبدالغفار خان کو ہدایات دیتے ہوئے ریفرنڈم کا بائیکاٹ کرنے کو کہا، کانگریس نے یہ اصرار بھی کیا کہ گورنر صوبہ سرحد اولف کیرو کو تبدیل کیا جائے۔ وائسرائے ہند و لیڈروں کے اس مطالبے کو مسترد نہ کرسکا اور لیفٹیننٹ جنرل سر لاک ہارٹ کو نیا گورنر بنایا گیا۔ پچاس ہزار فوجی ریفرنڈم کے دوران امن وامال بحال رکھنے کے لیے انتظامیہ کی مدد کے لیے تعینات کئے گئے۔ 6 سے 17 جون تک رائے شماری ہوئی۔ پاکستان کو 289,244 ووٹ ملے اور بھارت 2,874۔ یہ پاکستان کے لیے ایک واضح فتح تھی۔ اس طرح ہر وہ خطہ جو پاکستان کا حصہ بننا تھا یعنی مشرقی بنگال، سلہٹ، مغربی پنجاب، سندھ بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبہ پر جوش انداز میں پاکستان کے حق میں رائے کا اظہار کر کے شامل ہوا۔

3.8- خودآزمائی نمبر 3

سوال نمبر 7 لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بنگال اور پنجاب کو تقسیم کرنا کیوں ضروری محسوس کیا؟

(اپنا جواب باب 3.1 اور 3.2 کی روشنی میں چیک کریں۔)

سوال نمبر 8 صوبائی گورنروں کی کانفرنس کے اہم فیصلے کیا تھے؟

(اپنا جواب باب 3.2 ((الف) کی روشنی میں چیک کریں۔)

سوال نمبر 9 شمال مغربی سرحدی صوبے کے دورے کے نتیجے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کس نتیجے پر پہنچا؟

(اپنا جواب باب 3.2 (ب) کی روشنی میں چیک کریں۔)

سوال نمبر 10 مسلح افواج کی تنظیم نو کے بارے میں لیاقت علی خان کی تجاویز کیا تھیں؟ آپ کے خیال میں انہیں اس مرحلہ پر کیوں مسترد کیا گیا تھا؟

(اپنا جواب باب 3.2 (ج) کی روشنی میں جانچیں۔)

سوال نمبر 11 (الف) انتقال اقتدار کی تاریخ کی بحث کیوں اہمیت کی حامل تھی؟

(ب) وہ کون سے عوامل تھے جو انتقال اقتدار کی تاریخ کو پہلے لانے میں مددگار ثابت ہوئے؟

(ج) پاکستان کے لیے اس کے نتائج کیا تھے؟

(اپنے جوابات کو باب 3.3 کی بحث کی روشنی میں چیک کریں۔)

سوال نمبر 12 منصوبہ تقسیم کی اہم دفعات کا خلاصہ بیان کریں۔

سوال نمبر 13 (الف) ایک مشترک گورنر جنرل والی دفعہ کی کیا اہمیت تھی؟

(ب) اس معاملے پر کانگریس اور لیگ کے رہنماؤں میں اختلاف کیوں تھا؟

(ج) ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم کو کس بات کی دھمکی دی تھی اور ان کا ردعمل کیا تھا؟

(اپنے جواب کو باب 3.5 میں دی گئی بحث کی روشنی میں جانچیے۔)

سوال نمبر 14 کیا آپ وضاحت کر سکتے ہیں؟

(الف) اس طریقہ کار کی جس کے تحت بنگال اور پنجاب کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

(ب) اس طریقہ کار کی جس کے تحت مندرجہ ذیل علاقوں کو پاکستان میں شامل کرنے کے فیصلے ہوئے۔

آسام کا ضلع سلہٹ۔

سندھ

بلوچستان

شمال مغربی سرحدی صوبہ

(اپنے جوابات کو باب 3.7 کی بحث کی روشنی میں چیک کریں۔)

4- باؤنڈری کمیشن

4.1- مسئلہ

شاید اس دور میں سب سے اہم مسئلہ دونوں ملکوں کے مابین حد بندی کے تعین کا تھا۔ دونوں صوبوں ..... بنگال اور پنجاب ..... میں آبپاشی اور مواصلات کا ایک مربوط نظام موجود تھا اور ایک بے ڈھنگا فیصلہ ان علاقوں کے معاشی ڈھانچہ کے لیے انتہائی خطرہ پیدا کرسکتا تھا۔ 3 جون کے منصوبے میں ان عوامل کی وضاحت نہ کی گئی تھی۔ جنہیں لاکھوں انسانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنا تھا۔ واحد مخصوص دفعہ یہ تھی کہ سرحدوں کی حد بندی متصل مسلم اکثریتی یا غیر مسلم اکثریتی علاقوں کی بنیاد پر کی جائے گی۔ اس منصوبے میں ایک حوالہ ''دیگر عوامل'' کی طرف بھی تھا۔ یہ سب سے بڑی دفعہ تھی اور اس کے ذریعے سے بھی معاملہ باؤنڈری کمیشن کے ارکان کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ اس کو جس طرح چاہیں مراد لے لیں۔

4.2- دو کمیشن

ماؤنٹ بیٹن نے دو باؤنڈری کمیشنوں کی تجویز پیش کی۔ ایک پنجاب کے لیے اور دوسرا بنگال کے لیے اور ان میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کی طرف سے مساوی تعداد کے نمائندے ہوں اور دونوں کا ایک مشترکہ برطانوی چیئرمین ہو۔ یہ ظاہر تھا کہ پاکستان اور ہندوستان کے نمائندے ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے اور باؤنڈری کمیشن میں دونوں ملکوں کی یکساں نمائندگی اس تصادم کو مزید بڑھائے گی چنانچہ قائداعظم نے تجویز پیش کی کہ سرحدوں کی حد بندی کا مسئلہ اقوام متحدہ کے سپرد کر دیا جائے تاکہ غیر جانبداری کی ضمانت ہو سکے لیکن نہرو نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔

اس کے بعد قائداعظم نے تجویز پیش کی کہ برطانیہ کے تین لارڈز پر مشتمل ایک حد بندی کمیشن ترتیب دیا جائے یہ تجویز بھی قبول نہ کی گئی اور مسلمان رہنما کو بتایا گیا کہ پنجاب اور بنگال کا گرم موسم بوڑھے لارڈز کی صحت کو بری طرح متاثر کرے گا۔ حقیقت میں ماؤنٹ بیٹن کانگریس کے ساتھ صلاح مشورہ کر کے پہلے ہی ایک برطانوی وکیل سر سیرل ریڈکلف کو پورے اختیارات کے ساتھ باؤنڈری کمیشن کا سربراہ بنانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ نو ماہ کے محدود وقت کو سامنے رکھتے ہوئے قائداعظم کے پاس صورتحال کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ نتیجتاً دو باؤنڈری کمیشن تشکیل پائی۔

پنجاب باؤنڈری کمیشن جس کے ارکان حسب ذیل تھے مسلم کی طرف سے: جسٹس دین محمد اور جسٹس محمد منیر اور ہندوستان کی طرف سے جسٹس مہر چند مہاجن اور جسٹس تیا سنگھ دوسرا بنگال باؤنڈری کمیشن جس میں پاکستان کی طرف سے جسٹس محمد

اکرم اور جسٹس ایس اے رحمن اور انڈیا کی طرف سے جسٹس سی سی یو اسی اور جسٹس بی کے مکرجی۔ پاکستان اور ہندوستان کی حکومتیں کمیشنوں کے فیصلوں کو تسلیم کرنے اور نافذ کرنے پر رضامند ہو گئیں۔

4.3- دیگر عوامل

جیسا کہ توقع تھی باؤنڈری کمیشن کے مسلم اور غیر مسلم ارکان طویل بحثوں میں الجھ کر رہ گئے۔ ہر گروپ نے مبہم اصطلاح (دیگر عوامل) کو اپنے انداز سے بیان کیا اور مبالغہ آمیز دعوے کر کے آمیزش کو مزید بڑھایا۔ کمیشن کی عام کارروائیوں میں ریڈ کلف نے حصہ نہ لیا۔ اس نے ان نشستوں کی کارروائیوں کا مطالعہ کیا ہر کمیشن کے ارکان کے ساتھ جدا جدا ملاقات کی۔ اس دوران وہ ماؤنٹ بیٹن سے پوری طرح رابطہ قائم کئے رہا۔ ان رسمی ملاقاتوں کے بعد جن کا کوئی نتیجہ نہ نکلا، ریڈ کلف نے اپنا فیصلہ دے دیا جس کی پیروی کرنے کی دونوں حکومتیں پابند تھیں۔

4.4- خود آزمائی نمبر 4

سوال نمبر 15 باؤنڈری کمیشن کے بارے میں مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات تحریر کریں۔

(الف) ان کی تشکیل کیوں کی گئی؟ ان کے ذمے کیا کام تھا؟

(ب) ان کا ڈھانچہ اور ممبر شپ کیا تھی؟

(ج) انہوں نے کس انداز سے کارروائی کی؟ چیئرمین کا خصوصی کردار کیا تھا؟

(د) حد بندیوں کا فیصلہ کرنے کے لیے قائداعظم نے کون کون سے متبادل طریقہ ہائے کار تجویز کئے تھے اور انہیں کن وجوہ کی بناء پر ماؤنٹ بیٹن نے مسترد کیا تھا؟

5- ریڈکلف ایوارڈ

5.1- بنگال

بنگال کے مسلم اکثریتی علاقے زیادہ تر دیہات پر مشتمل تھے اور ان میں صنعت یافتہ قصبے نہ تھے۔ 1905ء کی تقسیم بنگال کے نتیجے میں مسلمانوں کو مشرقی بنگال کو ترقی دلانے کی کچھ قوت پیدا ہوگئی تھی لیکن مسلمانوں سے ہندوؤں کی عداوت اور انگریزوں کی طرف سے موخرالذکر کی دلجوئی کے نتیجے میں 1911ء میں اسے کالعدم قرار دے دیا گیا۔

(الف) **کلکتہ:** کلکتہ کا عظیم شہر صوبائی دارالحکومت رہا تھا اس شہر کی مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ اہمیت تھی۔ بنگالی مسلمانوں کے لیے یہ شہر واحد مرکز صنعت، معیشت، بیرونی تجارت اور تعلیم رہا تھا۔ کلکتہ کی آبادی کا بڑا حصہ شودروں (ہریجنوں) پر مشتمل تھا جو ہندوؤں میں سب سے ادنیٰ شمار ہوتے تھے۔ ان کی ہمدردیاں مسلم لیگ سے تھیں۔ صوبائی اور آل انڈیا دونوں سطحوں پر ان کے رہنما منڈل کو قائداعظم کا اعتماد حاصل تھا جنہوں نے اسے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے لیے نامزد کرایا۔ مسلمان شہر کی آبادی کا ایک چوتھائی تھے اس کے علاوہ کلکتہ کے نواحی علاقے جن پر شہر کی خوشحالی اور ترقی کا انحصار تھا مسلمان اکثریت کے علاقے تھے۔

ان پہلوؤں سے مسلم لیگ نے کلکتہ شہر پر اپنا دعویٰ جتایا۔ اپنے مطالبے کو جائز بنانے کے لیے مسلم لیگ نے شہر کی قسمت کا فیصلہ رائے شماری کے ذریعے کرانے پر بھی رضامندی کا اظہار کیا۔ دوسری طرف کانگریس شہر کو بھارت میں رکھنا چاہتی تھی۔ بنگال کے برطانوی گورنر نے کلکتہ کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے تجویز کیا تھا کہ اسے ایک کھلی بندرگاہ قرار دے دیا جائے تاکہ مشرقی اور مغربی بنگال دونوں اسے استعمال کرسکیں لیکن ماؤنٹ بیٹن اس پر رضامند نہ ہوا۔

برطانوی وائسرائے جانتا تھا کہ اگر اس شہر کے لوگوں کی رائے لی گئی تو اس کا نتیجہ لیگ کے حق میں فیصلہ کی صورت میں نکلے گا اس نے ایک دفعہ کہا تھا کہ مسلمان شہر میں استصواب رائے کرنے کا مطالبہ کریں گے اور بہت ممکن ہے کہ اس کا نتیجہ (کانگریس کی نظر میں) ''غلط برآمد ہو'' چنانچہ ماؤنٹ بیٹن نے وہی فیصلہ کیا جو اس کے خیال میں درست تھا کہ وہ شہر کانگریس کو دے گا۔ ایک ہندوستانی لیڈر سردار پٹیل نے بعد میں کانگریس کے اس خفیہ سمجھوتے کا انکشاف کیا جو ماؤنٹ بیٹن سے طے پایا تھا۔ اس نے کہا کہ ہم نے شرط رکھی تھی کہ ہم تقسیم پر صرف اس صورت میں رضامند ہوں گے جب کلکتہ ہمارے ہاتھ سے نہ جائے۔ چنانچہ ماؤنٹ بیٹن نے مسلمانوں کے ساتھ کھلا دھوکا کیا چونکہ وہ کہہ چکا تھا کہ ابھی کلکتہ کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا اور اس کا فیصلہ باؤنڈری کمیشن کرے گا۔

کانگریس کے ساتھ ماؤنٹ بیٹن کے اس معاہدے کے بعد کہ کلکتہ ہندوستان کو دیا جائے گا۔ یہ توقع بے معنی تھی کہ ریڈکلف اسے پاکستان کے حوالے کرے گا۔ نہ صرف یہ کہ اس نے یہ شہر بھارت کو دے دیا بلکہ پاکستان کو مرشدآباد کے مسلم اکثریتی

ضلع سے بھی محروم کر دیا اور ضلع ندیا کے مسلم اکثریتی علاقے کے بڑے حصے سے بھی جو کہ کلکتہ کے نواحی علاقے میں شامل تھا۔

اس ایوارڈ نے پاکستان کو 6 ہزار مربع میل علاقہ جس کی آبادی 35 ہزار مسلمانوں پر مشتمل تھی سے محروم کر دیا اور اس کے علاوہ کلکتہ سے بھی جو بنگال کی معیشت، تجارت اور تعلیم کا مرکز تھا۔

(ب) **سلہٹ :** ضلع سلہٹ میں بھی مسلم اکثریتی علاقوں کی حد بندیوں کا کام اس جذبے سے کیا گیا بلکہ ریڈکلف نے تو آسام کے ملحقہ اضلاع کے متصل مسلم اکثریتی علاقوں کے مفہوم کو مسخ کر دیا اور کہا کہ اس سے صرف وہ اضلاع مراد ہیں جو سلہٹ سے ملحقہ ہیں۔ یہ علاقے ایک نظام مواصلات رکھتے تھے اور بڑی جنگی اہمیت کے حامل تھے۔ پاکستان کے لیے مشکلات پیدا کرنے کے لیے بہت سے مسلم اکثریتی علاقے ہندوستان کو دے دیئے گئے اور پاکستان کے نقصان کا ازالہ کرنے کے لیے چند غیر مسلم علاقے جو کم جنگی اور معاشی اہمیت کے حامل تھے پاکستان کو دے دیئے۔ بعد میں یہ علاقہ متنازعہ فیہ بن گیا اور پاکستان کے لیے متعدد مسائل پیدا ہوئے۔

(ج) **معیشت اور دفاع :** مشرقی بنگال کو ایک ہزار میل کا ہندوستانی خطہ مغربی پاکستان سے الگ کرتا تھا۔ مشرقی بنگال زیادہ تر دیہاتی علاقہ تھا اور مکمل طور پر صنعت سے خالی تھا۔ ریڈکلف ایوارڈ نے وہاں رہنے والے کروڑوں مسلمانوں کو کلیتاً نظر انداز کر دیا تھا۔ ہندوستان کے ساتھ جنگی نقطہ نگاہ سے ایک مجروح سرحد دے کر اس مسلم اکثریتی صوبے کی دفاعی ضروریات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ہندوستان نہ صرف اپنی سہولت کے لیے اس ایوارڈ کی وجہ سے اس کی معیشت پر کنٹرول رکھ سکتا تھا بلکہ اس کی علاقائی مالیت کے خلاف بھی کارروائی کر سکتا تھا۔ یہ معاشی اہمیت کے علاقے ہندوستان کو دے کر ریڈکلف نے مشرقی بنگال اور ہندوستان کے اس خطے کے مابین مستقبل کے متعدد مسائل کے بیج بو دیئے۔

5.2- پنجاب

(الف) **سکھوں کا دعویٰ :** پنجاب باؤنڈری کمیشن کو بھی وہی مسائل درپیش تھے جو بنگال باؤنڈری کمیشن کو درپیش تھے لیکن پنجاب میں صورتحال بنگال سے مختلف تھی۔ پنجاب میں ہندو انڈیا کے لیے زیادہ سے زیادہ علاقے حاصل کرنے سے کانگریس سکھ قوم کو استعمال کر رہی تھی۔ سکھوں کا دعویٰ مضحکہ خیز تھا۔ وہ مغرب میں دریائے چناب تک حد بندی چاہتے تھے جس میں گورداسپور، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، لاہور، شیخوپورہ، منٹگمری (ساہیوال) اور لائل پور (فیصل آباد) کے خطے شامل تھے۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ ان خطوں میں سکھوں کے مقدس مقامات موجود ہیں۔ یہ تصور کرنا مشکل نہیں ہے کہ کانگریس کا ردعمل اس وقت کیا ہوتا جب مسلمان اسی قسم کی بنیاد پر اپنے دعوے دہلی، اجمیر اور دیگر مقامات پر جتاتے لیکن سکھوں نے یہ دعویٰ اپنی طرف سے نہ کیا تھا۔ وہ کانگریس کے زبردست حامی تھے اور مزید اہمیت کی بات یہ ہے کہ برطانوی انتظامیہ میں گورنر پنجاب جنکز نے ضلع منٹگمری کے

بارے میں سکھوں کے دعویٰ کی حمایت کی۔

(ب) **لیگ کے مطالبات:** لیگ کے مطالبات میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ لیگ نے صرف متصل مسلم اکثریتی علاقے یا ایسے علاقے جو پنجاب کی زراعت کو کنٹرول کرتے، نہری ہیڈ ورکس وغیرہ طلب کئے لیکن اپنے فیصلے میں ریڈکلف نے پنجاب میں بنگال سے بھی زیادہ ناانصافی کی۔

(ج) **ریڈکلف کا تصفیہ:** وائسرائے کی 3 جون کی تقریر میں باؤنڈری کمیشن کو ہدایات دی گئی تھیں اور وہ اصول جس پر تقسیم عمل میں آ رہی تھی واضح طور پر یہ بتایا گیا کہ مسلم اکثریتی علاقے پاکستان میں تشکیل کئے جائیں گے لیکن برطانوی وکیل نے تمام یقین دہانیوں کو نظرانداز کر دیا اور متصلہ مسلم اکثریتی علاقوں کا ایک وسیع حصہ پاکستان سے کاٹ کر بھارت کی جھولی میں ڈال دیا اس کے برعکس ہندو اکثریت کا ایک انچ خطہ بھی بھارت سے جدا کر کے پاکستان میں شامل نہ کیا گیا۔ گورداسپور ایک مسلم اکثریتی ضلع تھا جس میں 51% سے زائد مسلم آبادی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس امر کی خواہش کا اظہار کر دیا تھا کہ پورا ضلع پاکستان کو نہیں دیا جائے گا۔ اس ضلع کی صرف ایک تحصیل پٹھانکوٹ غیر مسلم اکثریتی علاقہ تھی۔ باقی تحصیلیں بھاری مسلم اکثریت رکھتی تھیں۔ ریڈکلف نے پٹھانکوٹ بھارت کو دے دیئے دو مسلم اکثریتی تحصیلیں گورداسپور اور بٹالہ بھی ہندوستان کی جھولی میں ڈال دیں۔ دیگر مسلم اکثریتی تحصیلیں جو سرحد سے متصل تھیں وہ بھی بھارت کو دے دیں ان میں ضلع امرتسر کی مسلم اکثریتی تحصیل انبالہ، جالندھر ضلع میں لکودر اور جالندھر کی تحصیلیں اور ضلع فیروز پور کی زیرہ اور فیروز پور کی تحصیلیں شامل تھیں۔

(د) **مسئلہ کشمیر:** یہ انتظام صریحاً بے انصافی، سرکاری اعلانات اور وعدوں کی خلاف ورزی اور ہندو کانگریس کی نارواتشفی کے لیے کیا گیا۔ ریڈکلف اپنے فیصلے کی کوئی عملی توجیہہ پیش نہ کر سکا۔ اس کی حد بندی پاکستان کے دفاع اور معیشت میں سنگین اور خطرناک کردار ادا کرنے والی تھی۔ اس نے پاکستان کو ہندو انڈیا کے رحم و کرم پر لا کر چھوڑ دیا تھا۔ ریڈکلف کا وہ فیصلہ جس کی رو سے اس نے مسلم اکثریتی ضلع گورداسپور کا 3/4 حصہ ہندوستان کو دے دیا۔ پاکستان کو کشمیر سے محروم کرنے کی ایک سعی تھی کیونکہ اس طرح ہندوستان کو ریاست تک ایک آسان اور محفوظ راستہ مل گیا تھا جیسا کہ پہلے ہو چکا ہے۔ گورداسپور ایک مسلم اکثریتی ضلع تھا جس میں ہندو آبادی تحصیل پٹھانکوٹ میں مرکوز تھی اور دیگر تحصیلیں گورداسپور، بٹالہ اور شکرگڑھ مسلم اکثریتی تحصیلیں تھیں۔ ضلع گورداسپور ریاست جموں و کشمیر سے متصل تھا اور جغرافیائی صورتحال ایسی تھی کہ اگر پٹھانکوٹ ہندوستان کو دے بھی دیا جاتا تو بھی ہندوستان اور کشمیر کے مابین ریل اور سڑک کا کوئی رابطہ نہ رہ سکتا تھا۔ مسلم اکثریتی تحصیلیں بٹالہ اور گورداسپور ہی ہندوستان اور کشمیر کے مابین رابطہ فراہم کرتی تھیں۔ ایک منصفانہ اور درست فیصلے کے نتیجے میں ہندوستان جموں و کشمیر تک زمینی رسائی حاصل نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کا ساتھ دینے اور لاکھوں کشمیری مسلمانوں کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے لیے پاکستان کے ساتھ ناانصافی کی گئی اور دو تحصیلیں گورداسپور اور بٹالہ جن کے بارے میں ہر کوئی جانتا تھا کہ پاکستان کا حصہ بننے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کو دے دی گئیں۔

(س) **پنجاب کا نظام آبپاشی :** امرتسر، جالندھر اور فیروز پور اضلاع میں جو مسلم اکثریتی علاقے ہندوستان کو دیئے گئے ان کا ایک مقصد تو سکھوں کی دلجوئی تھا جو ہمیشہ برطانوی مفادات کے پشتی بان رہے اور دوسرا مقصد (شاید ہندو نقطہ نگاہ سے زیادہ اہم) یہ تھا کہ پنجاب کے نظام آبپاشی کو بھارت کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ نگودرا اور جالندھر کی تحصیلیں ستلج اور بیاس کے مقام اتصال پر واقع تھیں۔ اسی طرح فیروز پور کا نہری ہیڈ ورکس مسلم اکثریتی علاقے میں واقع تھا اور پاکستان کو ملنا چاہیئے تھا یہ بات جاننا ضروری ہے کہ یہ ہیڈ ورکس اس نہری نظام کو کنٹرول کرتے تھے جو پنجاب کے اس حصے کو سیراب کرتا تھا جو اب پاکستان میں شامل ہے۔ یہ علاقہ ہندوستان کو دے کر نہ صرف مسلم لیگ اور برطانیہ کے درمیان کئے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کی گئی بلکہ پاکستان کی معاشی اور حربی مفادات کو زد پہنچائی گئی۔ ریڈکلف نے جس انداز سے اپنے فیصلے کا دفاع کیا وہ دلچسپ ہے۔ اس نے بیان کیا کہ اس نے آبپاشی اور موصلات کے نظام کو درہم برہم ہونے سے بچانے کے لیے متصل اکثریتوں کے بنیادی اصول سے انحراف کیا۔

5.3- عمومی نتائج

ان واقعات کا ایک محتاط مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ باؤنڈری کمیشن کی تشکیل محض ایک دکھاوا تھی۔ برطانیہ اور ہندو دونوں پاکستان کو معاشی اور حربیاتی پہلوؤں سے مفلوج کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھے تاکہ ہندوستان کو وہ تمام اہم مقامات ہاتھ آجائیں جو پاکستان کی معیشت اور دفاع کو کنٹرول کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ وحشت انگیز امر یہ تھا کہ سارا معاملہ خفیہ تھا لیکن حد بندی کی لکیر کا کانگریس لیڈروں کو علم تھا اور برطانوی افسروں کے کنٹرول روم میں لٹکے ہوئے نقشوں پر بھی وہی لکیریں کھینچی ہوئی تھیں جو ریڈکلف نے کھینچی تھیں لیکن جب لیگ کے رہنما حد بندی کے بارے میں استفسار کرتے تو اس بارے میں مکمل لاعلمی کا مظاہرہ کیا جاتا اور بتایا جاتا کہ اس بارے میں صرف ریڈکلف ہی جانتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ باؤنڈری کمیشن کے دو پاکستانی ججوں، دین محمد اور محمد منیر (جنہوں نے پاکستان کی نمائندگی کی) نے بعد میں بیان کیا کہ ابتدائی طور پر فیروز پور ہیڈ ورکس اور ضلع فیروز پور کی تین تحصیلیں زیرہ، فاضلکا اور فیروز پور پاکستان کو دیئے گئے تھے لیکن جب فیصلے کا اعلان ہوا تو یہ تحصیلیں اور ہیڈ ورکس ہندوستان کو دے دیئے گئے۔ جسٹس محمد منیر نے بیان کیا ہے۔

> ''جب کمیشن منتشر ہونے لگا تو سروسز کلب میں ہمیں ریڈکلف کی طرف سے ایک لنچ دیا گیا۔ اس موقع پر ہم نے فیصلہ کیا کہ اس سے پوچھیں کہ آیا اس نے رپورٹ پڑھنے اور ممبران کے ساتھ بحث وتمحیص کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کر لیا ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ تھا کہ اسے کچھ کہنے سے پہلے گورنر جنرل (ماؤنٹ بیٹن) سے ملاقات کرنا ہوگی۔''

5.4- فیصلے کا اعلان

جب 16 اگست کو پچھلے پہر فیصلہ کا اعلان ہوا مسلم لیگی لیڈر سکتے میں رہ گئے۔ پاکستانیوں کے کرب واندوہ کے جذبات کا

اظہار قائداعظم کی اس تقریر سے ہوتا ہے جس میں انہوں نے اس اعلان پر تبصرہ کیا۔

''ہندوستان تقسیم ہو چکا ہے اب اس فیصلہ کو بدلا نہیں جا سکتا۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کیسی کیسی بے انصافیاں اور زیادتیاں روا رکھی گئی ہیں۔ ہمارے علاقے کو جتنا کم کیا جا سکتا تھا کم کر دیا گیا۔ باؤنڈری کمیشن کا فیصلہ نہ صرف غیر منصفانہ ہے بلکہ بدنیتی پر بھی مبنی ہے اسے قانونی فیصلہ نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ سیاسی فیصلہ تھا۔ بہرحال اب فیصلہ ہو چکا ہے ہم نے جو وعدے کئے ہیں انہیں پورا کرنا ہے۔ ایک آبرومندانہ قوم کی طرح ہم اس کے پابند ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی کا مظہر ہے لیکن ہمیں اس ایک اور صدمے کو بھی تحمل، جرأت اور امید کے ساتھ برداشت کرنا ہوگا۔''

5.5- پاکستان کے لیے مضمرات

اس طرح انگریز ہندو سازش کے نتیجے میں مسلمانوں کو کٹا پھٹا پاکستان مل گیا اور اس ملک کے لیے لاتعداد مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ریڈ کلف ایوارڈ نے بھارت کو ان تمام ضروری ہتھیاروں سے مسلح کر دیا جن کی مدد سے پاکستان کا گلا گھونٹا جا سکتا تھا۔ ایوارڈ کا اعلان ہونے کے چند ماہ بعد ہی ہندوستانی فوج کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کو کچلنے کے لیے کشمیر پر چڑھ دوڑی۔ ایک برٹش جنرل کے الفاظ میں:

''یہ ریڈ کلف ایوارڈ ہی تھا جس نے گورداسپور اور بٹالہ کی مسلم اکثریتی آبادی کی تحصیلیں بھی بھارت کو دے دیں اور جموں میں ہندوستانی فوجوں کا استحکام ممکن بنایا جس نے پٹھانکوٹ کو ریل کی مواصلات کا مرکز بنایا اور ہندوستان کو جنوب میں اڑی سے پاکستانی سرحد تک اپنا دفاع مضبوط بنانے کا موقع فراہم کیا۔''

اسی ایوارڈ نے ہندوستان کو ستلج اور راوی کے اہم نہری ہیڈ ورکس کا کنٹرول دیا اور ہندوستان پاکستانی معیشت کو تباہ کرنے پر قادر ہو گیا اور یہ کوئی اتفاقی امر نہ تھا بلکہ ایک منظم منصوبہ تھا، جس کے تحت اس نے 1948ء کے اپریل میں پاکستان کو فراہم کیا جانے والا نہری پانی بند کر دیا حالانکہ اس نے ایسا نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

5.6- اس کے بعد

مشرقی اور مغربی پنجاب کی حد بندی یکسر مسلم لیگ سے چھپا کر وائسرائے نے پورے پنجاب کے جان و مال کو مسلح سکھ دستوں اور متشدد ہندو گروہوں کے حوالے کر دیا۔ ان لاکھوں افراد کے مصائب کی تصویر کشی ناممکن ہے۔ قتل عام، آتشزدگی، قطع و بریدہ اعضاء، مجرمانہ حملے، دیہاتوں اور انسانوں کو جلانے کا عمل طویل عرصے تک جاری رہا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس حرکت کے لیے

قتل کرنے والے مجرم تھے یا قتل ہونے والے۔لیکن یہ امر ایک حقیقت ہے کہ برطانوی انتظامیہ نے انتہائی غفلت اور غیر مستعدی کا مظاہرہ کیا۔انہیں معلوم تھا کہ کس طرح سرکاری ذرائع اسلحہ اور گولہ بارود کے علاوہ ہندو اور سکھ سپاہی انسانی قتل عام میں مصروف تھے لیکن ان کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا گیا۔مسلمانوں کی طرف سے بھی کچھ لوگ ان بے دردانہ کارروائیوں میں ملوث رہے لیکن یہ حرکات اپنی نوعیت اور تکالیف میں خاصی کم رہیں اور ایک منظم سازش کی عدم موجودگی کی وجہ سے یہ غیر انسانی حرکات صرف ان علاقوں میں محدود رہیں جہاں مسلمانوں کی حیثیت مضبوط تھی۔مزید برآں ان کی حرکات مشرقی پنجاب میں ہونے والے قتل عام کا ایک ردعمل تھیں۔

5.7- خودآزمائی نمبر 5

سوال نمبر 16 ریڈکلف کی مندرجہ ذیل دفعات کی تفصیل بیان کریں۔

(الف) تقسیم بنگال

(ب) تقسیم پنجاب

سوال نمبر 17 ریڈکلف ایوارڈ کے اہم نتائج پر مختصر نوٹ لکھئے؟

(الف) بھارتی نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہوئے۔

(ب) پاکستانی نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہوئے

سوال نمبر 18 ریڈکلف ایوارڈ پاکستان کے مستقبل کے لیے کیوں اہم تھا؟مختصراً بیان کیجیے۔

(الف) معاشی نقطہ نگاہ سے

(ب) دفاعی نقطہ نگاہ سے

(ج) کشمیر کے مستقبل کے سلسلے میں۔

(اپنے جوابات کو باب 5.1 تا 6.5 کی روشنی میں چیک کریں۔)

سوال نمبر 19 پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے ضمن میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات کی وجوہات کیا تھیں؟ تفصیلاً روشنی ڈالیں۔

6- ظہورِ پاکستان

ان ناممکن اور خاردار راستوں سے گزر کر پاکستان کا قافلہ اپنی منزل پر پہنچا۔ علاقائی، معاشی، سیاسی، دفاعی، لسانی اور اخلاقی..... ہر پہلو سے اس کے ساتھ ناانصافی کی گئی لیکن اپنے عظیم بانی کے الفاظ میں پاکستان قائم رہنے کے لیے وجود میں آیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن جو پاکستان کو مزید نقصان پہنچانے کے لیے دونوں ملکوں کا مشترکہ گورنر جنرل بننا چاہتا تھا، کراچی آیا تاکہ اس تقریب میں حصہ لے سکے جس میں قائداعظم بابائے قوم اور مسلمانانِ جنوبی ایشیا کے قائد نے 14 اگست 1947ء کو پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے عہدے کا حلف اٹھایا۔ ہندوستان پہلے ہی ماؤنٹ بیٹن کو گورنر جنرل کا عہدہ پیش کر چکا تھا جو اس نے بڑے امتنان وتشکر سے قبول کر لیا تھا۔

اس طرح بے شمار دشواریوں کے باوجود پاکستان دنیا کے نقشے پر سب سے بڑی مسلم مملکت کے روپ میں ابھرا۔ قائداعظم کی مؤثر رہنمائی میں اسلامی نظریے کی روح تمام دشواریوں کا مقابلہ کر کے پاکستان کو عالم اسلام کی امید کے طور پر سامنے لے آئی۔

یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ نئی مملکت کو جدید اسلامی جمہوریہ کا ایک عملی نمونہ بنانا چاہتے تھے۔ 11 اکتوبر 1947ء کو قائداعظم نے کراچی میں سول، بری، بحری اور فضائی افسروں کی مشترکہ میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> ''تصور یہ تھا کہ ہماری ایک ایسی ریاست ہو جہاں ہم آزادی سے سانس لے سکیں اور جسے ہم اپنی رہنمائی اور ثقافت کے مطابق ترقی دے سکیں اور جہاں اسلامی معاشرتی اور انصاف کے اصولوں کو عملی جامہ پہنا سکیں۔''

6.1- خودآزمائی نمبر 6

سوال نمبر 20 قیام پاکستان کے سلسلے میں کون سے محرکات کارفرما تھے، بیان کریں۔

(آپ کے لیے اس یونٹ کے آغاز میں فہرست مضامین کا مطالعہ مفید رہے گا اور واقعات کی ترتیب کے اعتبار سے آپ کی یادداشت کو ازسرنو تازہ کرے گا۔ اگر کوئی ایسا مرحلہ آپ کو محسوس ہو جس کے بارے میں آپ حتمی رائے نہ دے سکیں تو اس ضمن میں متعلقہ باب کو ایک بار پھر پڑھ لیں۔)

7- تشریحات

-1	اتحادی	دوسری جنگ عظیم (1939ء..... 1945ء) میں برطانیہ اور اس کے ساتھی ممالک۔
-2	امرتسر، بٹالہ، کلکتہ، فیروز پور، جالندھر	بھارت کے شہر
-3	جموں وکشمیر	پاکستان کے شمال میں ایک متنازعہ ریاست
-4	جواہر لال نہرو	ہندو رہنما اور بھارت کا پہلا وزیر اعظم
-5	زیرا۔نگودر	شمال بھارت میں دو علاقے/تحصیلیں۔
-6	لوئس ماؤنٹ بیٹن	برطانوی ہند کا آخری وائسرائے اور بھارت کا پہلا گورنر جنرل
-7	وی پی مینن	ماؤنٹ بیٹن کا قانونی مشیر جس نے پاک و ہند کی آزادی کے موقع پر اہم کردار ادا کیا۔
-8	ولبھ بھائی پٹیل	ہندو رہنما اور بھارت کا پہلا وزیر داخلہ
-9	محوری طاقتیں	دوسری جنگ عظیم (1949ء..... 1945ء) میں جرمنی اور اس کے ساتھی ممالک۔

8۔ کتابیات

1- Ali, Chaudhry Mohammad. Emergence of Pakistan.

2. Qureshi. I. H. Short History of Pakistan.

3. Speeches and Statements of Quaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah.

یونٹ.....7

تاریخ پاکستان
(1947ء تا 1958ء)

تدوین:
ڈاکٹر محمد اسلم

فہرست مضامین

یونٹ کا تعارف 224

یونٹ کے مقاصد 224

1۔ نئی مملکت کے مسائل 225

-1.1 تعارف 225

-1.2 مسئلہ کشمیر 225

-1.3 مہاجرین کی آبادکاری 226

-1.4 نہری پانی کا تنازعہ 227

-1.5 معاشی مسائل 228

-1.6 خودآزمائی نمبر 1 229

2۔ انتظامیہ 230

-2.1 تمہید 230

-2.2 حکومت کا ڈھانچہ 230

-2.3 قائداعظم کے آخری ایام 230

-2.4 خودآزمائی نمبر 2 231

-3 آئین سازی اور سیاسی بحران 232

-3.1 خواجہ ناظم الدین اور لیاقت علی خان 232

-3.2 غلام محمد اور خواجہ ناظم الدین 233

-3.3 غلام محمد اور دستور ساز اسمبلی 234

-3.4 وفاقی عدالت اور دستور ساز اسمبلی 235

-3.5	دوسری دستور ساز اسمبلی اور ون یونٹ	236
-3.6	1956ء کا دستور	237
-3.7	خود آزمائی نمبر 3	238
-4	سکندر مرزا اور پارلیمانی ادارے	239
-4.1	تعارف	239
-4.2	ری پبلکن پارٹی	239
-4.3	چوہدری محمد علی کی وزارت	239
-4.4	وزیر اعظم سہروردی	240
-4.5	آئی۔آئی۔ چندریگر	241
-4.6	ملک فیروز خان نون	242
-4.7	مارشل لاء	243
-4.8	خود آزمائی نمبر 4	244
-5	تشریحات	245
-6	کتابیات	246

یونٹ کا تعارف

اس یونٹ میں آپ اپنے ملک کی 1947ء سے 1958ء تک کی تاریخ کے بارے میں پڑھیں گے۔ اس کا مطالعہ کرتے وقت آپ محسوس کریں گے کہ آزادی کے موقع پر اور آزادی کے ابتدائی سالوں میں ہمارا ملک کن کن مشکلات اور مسائل سے دوچار ہوا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ آئے دن حکومت میں تبدیلی کیوں ہوتی رہی۔ ایسے کون سے حالات تھے جن کا نتیجہ 1958ء کے مارشل لاء کی صورت میں نکلا۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کو پڑھنے کے بعد طلباء اس قابل ہوسکیں گے کہ:

1- ان مسائل کا تجزیہ کرسکیں جو آزادی کے وقت اور آزادی کے بعد ہمارے ملک کو پیش آئے۔

2- اس دوران سیاست میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کی وضاحت کرسکیں۔

3- 1956ء کے آئین اور ون یونٹ پر بحث کرسکیں۔

4- ملک کے سیاسی حالات میں مختلف شخصیتوں کے کردار کی وضاحت کرسکیں۔

1- نئی مملکت کے مسائل

1.1- تعارف

پاکستان 14 اگست 1947ء کو معرضِ وجود میں آیا۔ قائداعظم محمد علی جناح اس کے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔ قائداعظم نے اپنے تقرر کے فوراً بعد لیاقت علی خان کی قیادت میں پاکستان کی پہلی کابینہ تشکیل دی۔ حکومت ہند کے ایکٹ مجریہ 1935ء کو بعض ترامیم کے ساتھ ملک کے عبوری آئین کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ نئی حکومت ہونے کے ناطے سے پاکستان کو مسائل کے ایک انبوہ کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں بعض عارضی نوعیت کے تھے جو کہ ایک غیر منصفانہ بٹوارے اور پاکستان کے خلاف ہندوؤں اور انگریزوں کی ملی بھگت کے سبب پیدا ہوئے تھے۔ دوسرے مسائل زیادہ تر مستقل نوعیت کے تھے جو جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی عام پسماندگی کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ پہلی نوعیت کے مسائل میں کشمیر کا مسئلہ سرفہرست ہے۔

1.2- مسئلہ کشمیر

جموں و کشمیر کی ریاست جنوبی ایشیا کے انتہائی شمال میں واقع ہے اس کا رقبہ 222,236 مربع کلومیٹر ہے اور 1941ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی آبادی کوئی چالیس لاکھ افراد پر مشتمل تھی جن میں سے 77% فیصد مسلمان تھے۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ پاکستان کے میدانی علاقوں کا ایک حصہ ہے۔ سندھ و جہلم اور چناب کے دریا کشمیر ہی سے نکلتے ہیں جو پاکستان کے میدانی علاقوں سے گزرتے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے کشمیر کے مسلمان پاکستان کے مسلمانوں سے انتہائی قریبی رشتوں سے بندھے ہوئے ہیں۔

پاکستان کے لوگوں کے ساتھ ان اقتصادی، مذہبی اور ثقافتی رشتوں کے پیش نظر یہ بات یقینی تھی کہ جموں و کشمیر کے عوام پاکستان ہی کے ساتھ شامل ہونا چاہیں گے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ سرحد کمیشن نے ہندوستان کو کشمیر کے ساتھ مواصلات کا رابطہ فراہم کرنے کے لیے گورداسپور کا مسلم اکثریت والا ضلع ہندوستان کے حوالے کر دیا۔ کشمیر کی مسلم آبادی نے پوری ریاست میں یوم پاکستان منا کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اس پر مہاراجہ کشمیر نے بڑے پیمانے پر مسلمانوں کے قتل عام اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ ایک اندازے کے مطابق اگست سے شروع ہونے کے بعد گیارہ ہفتے کے عرصے میں اس منظم وحشیانہ قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے نتیجے میں کوئی پانچ لاکھ مسلمان بے گھر ہو گئے ان میں سے کوئی دو لاکھ افراد کا پتہ ہی نہیں چل سکا جو یا تو شہید کر دیئے گئے یا بھوک، وبائی بیماریوں اور موسمی حالات کے سبب جاں بحق ہو گئے جبکہ باقی مغربی پنجاب کے مختلف ضلعوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

پاکستان میں آنے والے مہاجرین مہاراجہ کی حکومت کے وحشیانہ مظالم کی خبر لائے۔ اس خبر نے قبائلی علاقوں میں ایک

طوفان کھڑا کر دیا قبائلی لوگوں نے کشمیر کا رخ کیا اور 24 اکتوبر کو سرینگر تک پہنچ گئے جو کہ کشمیر کا دارالحکومت ہے۔ یہ خبر ملتے ہی ہندوستان کے گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن نے ہندو فوجی دستے مہاراجہ کی امداد کے لیے روانہ کئے۔ اسی اثناء میں مہاراجہ نے ہندوستان تک رسائی کے کاغذات پر دستخط کر دیئے۔ یہ کشمیر کے لوگوں کے خیالات کی سراسر خلاف ورزی تھی۔ ریاست کو متحد کرنے کے لیے مجاہدین کی تحریک جاری رہی لیکن افرادی قلت یا کمزوری اور تنظیم کے فقدان کی وجہ سے مجاہدین مزید علاقے حاصل نہ کر سکے۔ لڑائی جاری رہی لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکل سکا اس درمیانی مدت میں متحد اور آزاد علاقوں کے الحاق سے ایک نئی حکومت تشکیل دی گئی جس کا دارالحکومت مظفر آباد کو بنا کر اسے حکومت آزاد جموں وکشمیر کا نام دے دیا گیا۔

ہندوستان نے یہ معاملہ جنوری 1948ء میں سلامتی کونسل کے روبرو پیش کر دیا جس میں جموں وکشمیر سے پاکستان کے سول اور فوجی افراد کے نکل جانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ہندوستان کی حکومت نے یہ وعدہ بھی کیا کہ اس علاقے میں امن کی بحالی کے بعد، کشمیر کے لوگ رائے شماری کے ذریعے اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کریں گے جس کی نگرانی اقوام متحدہ کرے گی۔ پاکستان نے شکایت کے طور پر ایک یادگار پیش کی جس میں پاکستان کے خلاف ہندوستان کے جارحانہ رویہ پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ سلامتی کونسل میں اس مسئلے پر بڑی طویل اور گرما گرم بحث ہوئی۔ آخر میں فیصلہ یہ ہوا کہ پاکستان اور بھارت دونوں اپنی اپنی رائے اس سلسلے میں محفوظ رکھیں اور کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے لوگوں کی اپنی رائے پر چھوڑ دیا جائے کشمیر کے لوگوں کی خواہش کے احترام کے طور پر ایک عالمی کمیشن کی تشکیل کی گئی۔ پاکستان نے کشمیر کی ریاست میں رائے شماری کرانے کے لیے اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا لیکن بھارت نے کبھی اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے کی زحمت نہیں کی بلکہ اس پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔

1.3- مہاجرین کی آبادکاری

قیام پاکستان کے اعلان کے ساتھ ہی ہندو اکثریت والے علاقوں میں گھرے ہوئے مسلمانوں پر مصائب ومشکلات کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا نام ونشان مٹانے کی پہلی سے ٹھان رکھی تھی یوں تو پورے ہندوستان میں مسلمان آباد تھے جو ہندو مہاسبھائیوں کا نشانہ بنے ہوئے تھے لیکن پاکستان کی سرحد کے ساتھ ساتھ والے علاقوں میں یہ صورتحال کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ صوبہ پنجاب تین مہینے سے زیادہ اس کی زد میں رہا، ہندو، سکھ، راجواڑوں کے راجوں مہاراجوں نے مسلمانوں کے منظم قتل عام کے لیے اپنی اپنی فوجیں مہاسبھائیوں اور جن سنگھیوں کے سپرد کر دی تھیں۔ اس قتل عام کی باقاعدہ منصوبہ بندی میں مسلمان مردوں کو تہہ تیغ، عورتوں کی بے حرمتی اور بچوں کو نیزوں پر اچھال دیا گیا۔ مسلمان اپنی جانیں بچانے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں پاکستان جانے والے قافلوں کے کیمپوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے لیکن ہندو مہاسبھائیوں اور جن سنگھیوں کے جتھے ان کا پیچھا کرتے جو ہندو فوج اور پولیس کی مدد سے ان مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلتے رہے۔ یہ بڑے تعجب کی بات

ہے کہ ان واقعات پر کسی بین الاقوامی تنظیم نے مداخلت نہیں کی اور مسلمانوں کو اپنی آزادی کے لیے بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔

جب یہ خستہ حال، لٹے پٹے اور فاقوں سے نڈھال مسلمان ٹرینوں کے ذریعے پاکستان پہنچے تو یہاں کے مسلمانوں کا خون کھول اٹھا اور ان کے دلوں میں ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی جس کے نتیجے میں یہاں بھی تشدد کی ایک لہر دوڑ گئی لیکن یہاں صورتحال میں بڑا فرق یہ تھا کہ ہندوؤں اور سکھوں کی آبادیوں پر جو حملے کئے گئے وہ نہ تو منظم تھے اور نہ ہی انہیں کسی ادارے یا تنظیم کی پشت پناہی حاصل تھی جس کے نتیجے میں زیادہ تر سکھ اور ہندو خاندان بحفاظت ہندوستان پہنچنے میں کامیاب رہے۔ ایک اندازے کے مطابق 65 لاکھ افراد پاکستان میں آئے اور 55 لاکھ بھارت میں منتقل ہوئے۔ پاکستان کو لاکھوں مسلمانوں کے قتل عام کے دلی صدمے کے علاوہ ایک دم دس لاکھ مزید نفوس کا بوجھ بھی برداشت کرنا پڑا۔

حکومتِ پاکستان نے ستمبر 1948ء میں مہاجرین کی آبادکاری کے لیے ایک باقاعدہ وزارت قائم کی۔ یہ نئی وزارت قائداعظم اور لیاقت علی خان کی قیادت میں قائم کی گئی۔ مہاجرین کی آبادکاری کے لیے ہر ممکن اقدامات کئے گئے۔ قائداعظم نے ایک امدادی فنڈ کے قیام کا اعلان کیا جس میں پوری قوم نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس سے مہاجرین کی آبادکاری میں بڑی مدد ملی مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی ایک مرکزی تنظیم کے لیے تمام صوبوں میں مشترکہ کونسلیں قائم کی گئیں۔

> پاکستان کے وسائل محدود اور مسائل لامحدود تھے لیکن لوگوں کے جذبہ حب الوطنی اور ذاتی قربانی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش اور قائداعظم کی قیادت پر ان کے پختہ یقین نے وہ کام کر دکھایا جو دنیاوی وسائل سے ممکن نظر نہیں آتا تھا۔

1.4- نہری پانی کا تنازعہ

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ریڈکلف ایوارڈ کے تحت بھارت کو کشمیر تک رسائی دلانے کی خاطر مسلمان اکثریت والے بیشتر علاقے بھارت کے حوالے کر دیئے گئے تھے اس طرح پاکستان کے علاقے کو سیراب کرنے والی کئی نہروں کا کنٹرول ہندوستان کے پاس چلا گیا تھا جس سے پاکستان کے لیے ایک اور مصیبت آ کھڑی ہوئی۔ پاکستان کے علاقہ زرعی پیداوار والا علاقہ تھا جہاں آبپاشی کا دارومدار زیادہ تر نہروں پر تھا جو پاکستان میں بہنے والے پانچ دریاؤں سے نکالی گئی تھیں۔ ان میں سے دو دریا راوی اور ستلج بھارت کے علاقے سے پاکستان میں داخل ہوتے ہیں۔ ریڈکلف نے اس طرح سرحد متعین کی کہ دریائے راوی پر مادھوپور کا ہیڈورکس اور ستلج پر فیروزپور ہیڈورکس بھارت میں رہ گئے مادھوپور ہیڈورکس کے ذریعے مرکزی باری دوآب نہریں نکلتی تھیں جبکہ مغربی پنجاب سے دیپالپور کی نہر نکلتی تھی جو مغربی پنجاب اور ایسٹرن گرے نہر کو پانی فراہم کرتی تھی جس سے ریاست بہاولپور کے کچھ علاقے سیراب ہوتے تھے۔ کوئی بھی مہذب ملک کبھی بھی ان وسیلوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کر سکتا جن

سے لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگوں کا رزق بندھا ہولیکن بھارت نے انسان دوستی کے اظہار کی خاطر تو ان ہیڈ ورکس پر قبضہ نہیں کیا تھا وہ اس طرح پاکستان کو بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ اپریل 1948ء میں بھارت نے ان نہروں کا پانی روک دیا جس سے ان نہروں کے علاقوں میں خشک سالی کی صورتحال پیدا ہوگئی۔ پاکستان نے غلام محمد کی قیادت میں ایک وفد بھارت بھیجا لیکن بھارت کے ساتھ بات چیت میں وہ کوئی سہولت پیدا کرنے میں ناکام رہے اس کی بجائے وہ پاکستان کے وہ حقوق بھی بھارت کے حوالے کر آئے جو اسے دریا کے زیریں علاقے کی مملکت کے طور پر حاصل تھے۔ انہوں نے بات چیت کے بعد جس بیان پر دستخط کئے اس کی رو سے تین مشرقی دریاؤں پر بھارت کے دعوہ کو تسلیم کر لیا گیا اور پاکستان کو ان نہروں کے ذریعے فراہم کئے جانے والے پانی کی قیمت ادا کرنے کی ذمہ داری عائد کی گئی۔ اس پر بھارت کی تشفی نہیں ہوئی اور قدم قدم پر اس نے پاکستانی معیشت کو مفلوج کرنے کے لیے مسائل کھڑے کرنے شروع کئے ان نہروں کے پانی کو ضرورت کے دنوں میں روک لیا جاتا اور سیلاب کے دنوں میں کھول دیا جاتا جس سے علاقے میں سیالابوں کی صورتحال اور زیادہ سنگینی اختیار کر جاتی۔ بالآخر عالمی بنک کے تحت یہ معاملہ طے کیا گیا۔

1.5- معاشی مسائل

انگریزوں نے جنوبی ایشیا کو ایک معاشی اکائی کے طور پر منظم کیا تھا۔ ان کا مقصد برطانوی اور دوسری غیر ملکی منڈیوں میں ہندوستانی وسائل اور ذرائع کا استحصال تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف ریاستوں میں ترقی کا توازن برقرار رکھنے پر بہت کم توجہ دی گئی۔ آزادی سے پہلے ہندوستان کے کچھ حصے دوسرے حصوں سے نسبتاً زیادہ خوشحال تھے۔ جب انگریز جنوبی ایشیا سے گئے تو مسلمانوں اور ہندوؤں کی اکثریت والے دو علیحدہ علیحدہ علاقے وجود میں آئے۔ پاکستان کے حصے میں جو علاقے آئے وہ صنعتی اور اقتصادی لحاظ سے بہت دگرگوں حالت میں تھے۔ یہ علاقے خام مال تیار کرتے تھے جو بھارت کے صنعتی سیکٹرز میں بھیج دیا جاتا تھا۔ تجارتی ادارے اور بنک یا تو ہندوؤں کے ہاتھ میں تھے یا پھر انگریزوں کے ہاتھ میں جنہوں نے صنعتی علاقوں میں اپنے مراکز قائم کر رکھے تھے اس کا ہی نتیجہ تھا کہ پاکستان کے کسان کو اپنی پیداوار حاصل کرنے کے لیے بھارتی بنکار اور صنعت کار پر انحصار کرنا پڑتا تھا جس کی شرائط بعد میں معین کر دی گئیں۔

بھارت نے پاکستان کی معیشت کو کمزور کرنے کے لیے اقتصادی بلیک میلنگ کی جب پاکستان نے بھارت کی تقلید میں اپنی کرنسی کی قیمت گھٹانے سے انکار کر دیا۔ یہ واقعہ ستمبر 1949ء میں پیش آیا۔ بھارت نے مشرقی پاکستان کے خام پٹ سن کی خریداری روک دی۔ اس سلسلے میں جب پاکستان نے بھارت کے ساتھ بات چیت کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرنا چاہا تو بھارت کے نمائندے نے کہا ''آپ کے پاس اپنے پٹ سن کو استعمال کرنے کا کیا طریقہ ہے سوائے اس کے کہ آپ اسے ہمارے ہاتھ بیچ دیں، جلا دیں یا پھر خلیج بنگال میں پھینک دیں'' ایسا لگتا تھا جیسے مشرقی پاکستان کے کاشتکار بالکل تباہ ہو جائیں گے۔ حکومت نے ایک بورڈ قائم کیا جس کے تحت حکومت نے کاشتکاروں سے پٹ سن خرید کر نیشنل بنک آف پاکستان کے ذریعے تاجروں کے لیے سہولتیں

فراہم کیں اس طرح مشکلات پر قابو پا لیا گیا لیکن اس سے بھارت کی ایک اور غلط حرکت سامنے آئی۔

مالی اثاثوں کی تقسیم اور ذمہ داریاں

آزادی کے وقت ہندوستان کا کل سرمایہ 4 کھرب (Billion) تھا۔ پاکستان نے جب اپنے ایک چوتھائی حصے کا مطالبہ کیا تو بھارت نے 20 کروڑ (Million) سے زیادہ دینے سے انکار کر دیا۔ طویل بحث کے بعد پاکستان کا حصہ 750 کروڑ روپے مخصوص کر دیا گیا جس میں سے 200 کروڑ کی ادائیگی کی گئی اور باقی رقم یہ کہہ کر روک لی گئی کہ پاکستان یہ رقم بھارت کے خلاف کشمیری لوگوں کی امداد کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ بڑی مشکلات کے بعد بھارت نے یہ روکی ہوئی رقم بحال کی۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان فوجی عمارتوں کا ایک چوتھائی حصہ حاصل کرے گا۔ تمام قابل حرکت اثاثہ اور زیادہ تر فوجی اثاثہ بھارت میں تھا۔ اسلحہ کی سولہ کی سولہ فیکٹریاں بھارتی علاقوں میں تھیں۔ وہ اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ وہ بھارت سے فوجی ضروریات کی ایک چیز بھی جانے نہیں دیں گے۔ اس صورتحال کی وضاحت کرتے ہوئے فیلڈ مارشل آکن لیک نے لکھا:

> ''مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں بلکہ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ بھارت کی موجودہ کابینہ نے ہر ممکن طریقے سے یہ طے کیا ہے کہ وہ پاکستان کی قوت کو منظم ہونے سے روکنے کی پختہ بنیادوں پر کوشش کرے۔ ہندوستانی رہنماؤں، کابینہ کے وزراء، سول افسران اور دوسرے لوگوں نے فوج کی تقسیم روکنے کے لیے بہت زور لگایا۔''

آکن لیک کو یہ کام مکمل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی بھارت نے وعدہ کیا کہ وہ فوجی گوداموں میں پاکستان کا حصہ اسے ضرور پہنچائے گا لیکن دوسرے بہت سے وعدوں کی طرح اس وعدے کا اختتام بھی مکاری پر ہوا۔ سوائے چند چیزوں اور ناپسندیدہ اشیاء کے پاکستان کو فوجی گوداموں میں سے اپنے جائز حصے کا کچھ نہ ملا۔

1.6- خود آزمائی نمبر 1

سوال نمبر 1 پاکستان کو آغاز ہی میں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا، انہیں ترتیب دے کر ہر ایک کی تفصیل سے وضاحت کریں۔

2۔ انتظامیہ

2.1- تمہید

جب پاکستان دنیا کے نقشے پر ابھرا تو اس وقت اس کی کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی۔ ایک اچھی اور مقابلتاً انتظامیہ قائم کرنے کے لیے پاکستان کے پاس تجربہ کار اور تربیت یافتہ افراد کی بھی کمی تھی۔ آزادی سے پہلے کی انتظامیہ میں بھی مسلمانوں کو اتنی نمائندگی نہیں دی گئی تھی۔ جتنا ان کا حق بنتا تھا۔ برطانوی لوگوں نے ان سول ملازموں کو نوآبادیاتی نظام کے تحت کچھ تربیت دی تھی۔ اب صورتحال بدل چکی تھی اور سول انتظامیہ کو لوگوں کی خدمت کرنی تھی۔

2.2- حکومت کا ڈھانچہ

کراچی کو نئے ملک کا دارالحکومت بنایا گیا۔ ہندوستان کی سول سروس کو پاکستان سول سروس میں بدل دیا گیا صوبوں کی قوم اور ملک کی مختلف ضروریات پوری کرنے کے لیے سروسوں کے ڈھانچے میں لچک پیدا کی گئی۔

ہندو افسروں کے جانے کے بعد خالی ہونے والی آسامیوں کو پر کرنے کے لیے جونیئر سول ملازمین کو اعلیٰ انتظامی عہدوں پر ترقی دے دی گئی لیکن یہ سب کچھ ابھی ناکافی تھا۔ لہٰذا برطانوی افسروں اور Technicians کو سول اور فوجی دونوں شعبوں میں ان کے عہدوں پر برقرار رکھا گیا قائداعظم نے ان تمام لوگوں کو نصیحت فرمائی کہ آزادی کے بعد کی تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے لوگوں کی اس طریقے سے خدمت کیجئے کہ انہیں اچھے کام اور انصاف کا یقین دلایا جا سکے۔ انہوں نے انہیں سیاست سے باز رہنے اور معاشرے کی بہبود پر توجہ دینے کے لیے کہا۔ اگرچہ حالات جن میں لوگ کام کر رہے تھے اتنے زیادہ خراب تھے کہ دفتروں میں فرنیچر اور ٹائپ رائٹر نہیں تھے حتیٰ کہ بعض اوقات دفتر کی عمارت بھی نہیں ہوتی تھی لیکن پھر بھی ان سب لوگوں نے قوم کی آواز پر کان رکھنے اور خدمت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔

2.3- قائداعظم کے آخری ایام

اپنے قیام کے پہلے سال میں پاکستان کو چند ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا جب اسے دنیا پر اپنے وجود کا یقین دلانے کے لیے بہت تردد کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ملک کے وجود کو بچا رکھنے اور اس کی جدوجہد کو جاری رکھنے میں قائداعظم کی رہنمائی اور لوگوں کے عزم مصمم نے بڑا کردار ادا کیا۔ 1946ء میں قائداعظم کو ان کے ڈاکٹر نے کام کا بوجھ کم کرنے کا مشورہ دیا تھا اور انہیں زیادہ آرام کے لیے کہا اور بتایا کہ اگر انہوں نے اسی رفتار سے کام جاری رکھا تو ان کے لیے مزید دو سال زندگی گزارنا بھی مشکل ہو

جائے گا۔ قائداعظم نے اپنے ڈاکٹر سے کہا کہ وہ اپنا کام کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ موت کے علاوہ کوئی ایسا طریقہ نہیں تھا جو قائداعظم کو مسلمانوں کی رہنمائی سے روک سکتا۔ قائداعظم نے نہ صرف یہ کہ اپنا کام کرنا نہیں چھوڑا بلکہ اپنی گری ہوئی صحت کا کسی کے سامنے ذکر کرنا بھی چھوڑ دیا۔

پاکستان کے قیام کے بعد قائد نے مزید محنت کی۔ کوئی سرکاری کاغذ ان کی نظروں سے نہیں بچا۔ کوئی ایسا معاملہ نہیں تھا جس پر توجہ نہیں دی گئی ہو۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا، جب قائداعظم مملکت کے معاملات سے بیگانہ ہوئے ہوں۔ کام کی زیادتی، آرام کی کمی، غیر معمولی سنگین معاملے اور بڑھتے ہوئے مسائل نے انہیں بستر سے لگا دیا لیکن انہوں نے پھر بھی اپنی ذات کو کوئی آرام نہیں دیا۔ اس نے کروڑوں بے گھروں کو گھر دیا لوگوں کو فخر کرنے کا موقع دیا۔ مایوس مسلمانوں کے دلوں میں امید کی کرنیں روشن کیں۔ یہ قائداعظم کی اعلیٰ قیادت ہی کا نتیجہ تھا کہ پاکستان کو اقوام متحدہ میں تسلیم کیا گیا۔ ملک میں سٹیٹ بنک آف پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ پوری دنیا میں پاکستانیوں کے جذبات کی ترجمانی کرنے والا نمائندہ ملا اور قوم نے بغیر کسی غیر ملکی امداد اور دفاعی سمجھوتے کے ایک خوبصورت آغاز کی طرف قدم بڑھائے۔ ایسا لگتا تھا جیسے قائداعظم کو اپنا انجام نزدیک دکھائی دے رہا تھا پاکستان کے قیام کی پہلی سالگرہ پر قوم کے نام اپنے پیغام میں قائداعظم نے کہا:

> ''خدا نے آپ کو سب کچھ دیا ہے۔ آپ کے پاس غیر محدود وسائل ہیں۔ آپ کی مملکت کی بنیادیں رکھ دی گئی ہیں اب یہ آپ کا کام ہے کہ ان بنیادوں پر جلد سے جلد عمارت قائم کیجئے۔ آگے بڑھیے میں آپ کی ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔ پاکستان زندہ باد۔''

قائداعظم کو ان کی زندگی کے آخری دنوں میں بلوچستان کے ایک صحت افزا مقام ''زیارت'' لے جایا گیا۔ اس وقت بھی ان کے ذہن میں اپنی قوم کے لوگوں کا خیال تھا۔ ان کی مستقل مزاجی، قوت ارادی اور وفاداری میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ان کا جسم ان کی بیماری کی سختی نہ سہہ سکا اور وہ 11 ستمبر 1948ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ ان کی وفات قوم کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان تھا۔

2.4- خودآزمائی نمبر 2

سوال نمبر 2 قائداعظم نے انتظامی ڈھانچہ تعمیر کرنے کے لیے اور پاکستان کو قوموں کی برادری میں جگہ دلانے کے لیے کیا اقدام کئے؟ وضاحت کریں۔

3- آئین سازی اور سیاسی بحران

3.1- خواجہ ناظم الدین اور لیاقت علی خان

قائداعظم کی جگہ مشرقی بنگال کے وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل بنے۔ وہ نیک نیتی اور دیانتداری کے لیے مشہور تھے۔ ناظم الدین صاف بے داغ عوامی زندگی کا ایک طویل تجربہ رکھتے تھے۔ اپنی اس صلاحیت کی بناء پر انہوں نے آئینی سربراہ بننے کو ترجیح دی اور لیاقت علی خان کو ایک قومی رہنما کے طور پر ابھرنے کا موقع دیا۔

وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ ملک کے لیے آئین بنایا جائے پاکستان کی آئین سازی اسمبلی نے یہ بات اچھی طرح سمجھ لی تھی اور ناظم الدین کے گورنر جنرل ہونے کے عرصے کے دوران اس جانب کافی اقدام کئے۔

قائداعظم کی وفات کے بعد جو کہ آئین ساز اسمبلی کے صدر بھی تھے ان کی جگہ مولوی تمیز الدین کو اسمبلی کا صدر منتخب کیا گیا۔ اسمبلی کے 79 ارکان تھے اور مسلم لیگ اکثریتی جماعت تھی جس وقت آئین مرتب کرنے کا کام شروع ہوا تو یہ بحث کی گئی کہ یہ ایک بہت ہی پیچیدہ معاملہ ہے۔

اس سلسلے میں پہلا قدم لیاقت علی خان نے اٹھایا کہ انہوں نے 13 مارچ 1949ء کو ''قراردادِ مقاصد'' پیش کی۔ اس میں مستقبل کے آئین کے لیے رہنما اصول بیان کئے گئے تھے۔ اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی حاکمیت ہے اور اس حاکمیت کو عوام کے منتخب نمائندے قرآن اور سنت کی روشنی میں عمل کی راہ دیں گے۔ پاکستان کو اسلام کے اصولوں کے مطابق انصاف برابری اور رواداری کی بنیاد پر وفاقی جمہوریہ بنایا جائے گا۔ اس قرارداد کو اسمبلی کی طرف سے منظور کر لیا گیا اور اس سلسلے میں ایک کمیٹی بنائی گئی جسے ''بنیادی اصولوں کی کمیٹی'' کہا جاتا ہے۔ اس کمیٹی نے اپنی پہلی رپورٹ 1950ء میں پیش کی۔ بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے دو ایوانی مقننہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی اور تمام صوبوں کو قطع نظر ان کی آبادی اور حجم کے، برابری کی بنیاد پر نمائندگی دی گئی۔ دونوں ایوانوں کو ایک جیسے اختیارات حاصل تھے اور تنازعے کی صورت میں ان کا مشترکہ اجلاس منعقد ہوتا تھا۔ اس رپورٹ میں کئی خامیاں تھیں اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا گیا تھا کہ صوبہ مشرقی بنگال کی آبادی، مغربی پاکستان کے سارے صوبے اکٹھے کرنے کے بعد بھی زیادہ تھی۔ اس لیے اس رپورٹ پر مشرقی بنگال میں زبردست تنقید کی گئی۔ ڈھاکہ میں ایک صوبائی کنونشن منعقد ہوا جس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ ملک کے دونوں حصوں کے لیے دو خود مختار صوبائی حکومتیں قائم کی جائیں۔ آبادی کی بنیاد پر ایک مرکزی پارلیمینٹ قائم کی جائے جس کو خارجہ امور، کرنسی اور دفاع کے متعلق اختیارات حاصل ہوں۔ لیاقت علی خان نے بنیادی اصولوں کی کمیٹی کو ہدایت کی کہ وہ اپنے کام پر دوبارہ غور کرے اور ایک نئی رپورٹ پیش کرے۔

لیاقت علی خان دوسری رپورٹ تیار ہونے سے قبل ہی وفات * پا گئے۔ وہ ایک مرد آہن اور ہر دلعزیز وزیر اعظم تھے۔ وہ قائداعظم کی وفات کے بعد ایک قومی لیڈر کی حیثیت سے ابھرے۔ ان کی کامیابیوں میں ایک اہم کامیابی یہ بھی ہے کہ انہوں نے قوم کو ایک ایسے وقت میں متحد کر دیا جب قوم صوبائی تعصب کا شکار ہو رہی تھی۔

3.2- غلام محمد اور ناظم الدین

کمیٹی کی دوسری رپورٹ خواجہ ناظم الدین نے 22 دسمبر 1952ء کو اسمبلی میں پیش کی۔ خواجہ ناظم الدین نے لیاقت علی خان کی وفات کے بعد اقتدار سنبھالا تھا۔ غلام محمد کو جو کہ وزارت خزانہ کے ایک ممبر تھے گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ اس رپورٹ میں بھی پہلی رپورٹ کی طرح دو ایوانی حکومت قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی ایوان بالا جس کو (House of Units) کا نام دیا جاتا تھا۔ اس میں 120 ممبر شامل تھے ان میں سے 60 ممبر مشرقی بنگال کی صوبائی قانون ساز اسمبلی نے منتخب کرنے تھے اور باقی کا انتخاب مغربی پاکستان سے کیا جانا تھا۔ ایوان زیریں کو جو 400 ممبروں پر مشتمل تھا اس کو House of Peoples کا نام دیا جاتا تھا۔ اس ایوان میں ملک کے دونوں حصوں سے برابر نمائندے منتخب کئے جاتے تھے۔

یہ مسودہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان برابری کی بنیاد پر تیار کیا گیا تھا۔ اس دفعہ پنجاب میں اس مسودہ پر زبردست تنقید کی گئی۔ تنقید کرنے والے برابری کی بنیاد پر تیار کئے گئے اس فارمولے کو نہ سمجھ سکے ان کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ شاید صوبہ مشرقی بنگال کا تسلط پاکستان کے دوسرے صوبوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم ہو جائے گا پنجاب کے لیڈروں نے یہ مطالبہ کیا کہ ایوان زیریں آبادی کی بنیاد پر قائم کیا جائے اور ایوان بالا میں یونٹوں کو مساوی نمائندگی کا حق دیا جائے۔ یہ فارمولا پہلی رپورٹ میں پیش کیا گیا تھا جس پر مشرقی بنگال کے لوگوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا تھا۔ اس طرح اسمبلی کی کارروائی کو پھر ملتوی کرنا پڑا اور اس کی کارروائی کے مستقبل قریب میں شروع ہونے کے کوئی امکانات نہیں تھے۔ اس وقت ملک کو آئینی تعطل کا سامنا تھا۔

خواجہ ناظم الدین کی کمزوریاں

وزیر اعظم کی حیثیت سے خواجہ ناظم الدین کی چند کمزوریاں ظاہر ہونا شروع ہو گئیں۔

(i) ان کے لیے صوبائی اور فرقہ وارانہ سیاست کی صورتحال کو نمٹانا خاصا مشکل کام بن گیا۔ ان کے نرم رویئے اور مصالحت پسندی کی وجہ سے ان کی شہرت کو کافی نقصان پہنچا۔ ملک کی معیشت کو زبردست مشکلات کا سامنا تھا۔ زرمبادلہ کو گندم اور دوسری اشیاء صرف کی درآمد پر خرچ کرنا پڑا۔ زرعی شعبے کی ترقی کے لیے کوئی اقدامات نہ کئے گئے جس کی وجہ سے جاگیرداروں نے کاشتکاروں پر زیادہ سختیاں شروع کر دیں۔ سرکاری ملازموں میں بدعنوانی کا رجحان بڑھ گیا تھا۔

---

* انہیں 17 اکتوبر 1951ء کو راولپنڈی میں قتل کر دیا گیا جہاں وہ ایک جلسہ عام سے خطاب کرنے والے تھے۔

(ii) ان مشکلات کے علاوہ ناظم الدین کی حکومت کے لیے ایک اور شدید مشکل جو پنجاب میں تحریک ختم نبوت کی شکل میں ظہور پذیر ہو رہی تھی سامنے آئی جس میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ مظاہرین نے سر ظفر اللہ خان کو جو کہ احمدی فرقے کے ایک ممتاز رکن تھے۔ وزیر خارجہ کے عہدہ سے علیحدہ کرنے کا بھی مطالبہ کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ تحریک پنجاب سے کراچی تک پھیل گئی لیکن اس کا مرکز پنجاب میں ہی رہا۔ حکومت نے لاہور میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور صوبائی حکومت کو برطرف کر دیا جو امن و امان کی صورتحال برقرار رکھنے میں ناکام رہی تھی۔

(iii) خواجہ ناظم الدین کی حکومت اپنا وقار گنوا بیٹھی۔ انہوں نے حالات بہتر بنانے کی بہت کوشش کی مگر پارٹی کی سیاست بازی ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ انہوں نے بیرونی ملکوں میں زرمبادلہ لے جانے کے رجحان کو روکنے کی کوشش کی تاہم اندرون ملک ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری ختم کرانے میں ناکام رہے۔ گورنر جنرل غلام محمد نے 19 اپریل 1953ء کو ان سے استعفیٰ طلب کیا۔ یہ بات پارلیمانی جمہوریت کی روایات کے خلاف تھی۔ جہاں وزیر اعظم کے عہدے کی بنیاد پر پارلیمینٹ کے اعتماد پر ہوتی ہے۔ ناظم الدین کا دعویٰ تھا کہ چونکہ انہیں مقننہ کا اعتماد حاصل ہے اس لیے انہیں برطرف نہیں کیا جا سکتا لیکن گورنر جنرل نے ان کی برطرفی کا اعلان کر دیا۔ گورنر جنرل کے اس اقدام سے اسمبلی کے ممبروں کے استحقاق کی خلاف ورزی ہوئی تھی لیکن انہوں نے اس کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔

3.3- غلام محمد اور دستور ساز اسمبلی

خواجہ ناظم الدین کی جگہ محمد علی بوگرہ کو ملک کا وزیر اعظم بنا دیا گیا جو ان دنوں امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے۔ ان کا تقرر بھی پارلیمانی اداروں کی مسلمہ روایات کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ بوگرہ نہ تو اسمبلی کے ممبر تھے اور نہ انہیں قومی سطح پر کوئی اہمیت حاصل تھی۔ گورنر جنرل نے انہیں وزیر اعظم مقرر کیا اور ان کی کابینہ کے ممبروں کا انتخاب کیا۔ محمد علی بوگرہ کے سامنے سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ ملک کے دونوں حصوں کے مفادات کو نقصان پہنچائے بغیر آبادی اور یونٹوں کو کس طرح نمائندگی دی جائے۔ بوگرہ نے اس سلسلے میں 17 اکتوبر 1953ء کو اپنی تجویزیں اسمبلی میں پیش کیں جنہیں عام طور پر ''محمد علی فارمولا'' کہا جاتا ہے۔

محمد علی فارمولے میں دو ایوانوں پر مشتمل مقننہ کی تجویز پیش کی گئی تھی جس میں ایوان بالا یونٹوں کی اور ایوان زیریں آبادی کی نمائندگی کرتا ہو۔ ایوان بالا کے ممبروں کی تعداد 50 مقرر کی گئی۔ جنہیں ہر صوبے سے مساوی تعداد میں لیا جاتا تھا۔ ایوان زیریں کے ممبروں کی تعداد 300 مقرر کی گئی جن میں سے 165 مشرقی پاکستان سے منتخب ہونا تھے اور باقی مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں سے۔ دونوں ایوانوں کی تشکیل اس طرح تھی۔

	مغربی پاکستان	مشرقی پاکستان
ایوان بالا	40	10
ایوانِ زیریں	135	165
میزان	175	175

اگرچہ دونوں ایوانوں کی تشکیل کے لیے مختلف طریقے اپنائے گئے تھے تاہم مساوات کے اصول پر عمل کیا گیا۔ متنازعہ امور کا فیصلہ دو ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں طے ہونا قرار پایا۔ کسی قسم کے تعطل سے بچنے اور ملک کے دونوں حصوں کے ایک دوسرے پر انحصار کو قائم رکھنے پر شرط رکھی گئی کہ مشترکہ اجلاس میں کسی فیصلے کے لیے ملک کے دونوں صوبوں سے کم از کم تیس تیس فیصد ووٹوں کا آنا ضروری ہے۔

اب آئندہ چند ہفتوں میں اسمبلی کو دستور سازی کا کام کرنا تھا لیکن گورنر جنرل کے کچھ اور ہی منصوبے تھے۔ 24 اکتوبر 1954ء کو اس نے دستور ساز اسمبلی توڑ دی اور دلیل یہ پیش کی کہ اسمبلی عوام کا اعتماد کھو بیٹھی ہے اور اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتی۔ عام تاثر یہ تھا کہ چونکہ اسمبلی گورنر جنرل کے اختیارات محدود کرنے کی کوشش کر رہی تھی اس لیے اس نے اسمبلی توڑ دی۔

اب گورنر جنرل نے بہت زیادہ طاقت حاصل کر لی۔ اس نے اپنی مرضی سے وزیر اعظم کو برطرف کیا۔ کابینہ کے امور میں اکثر مداخلت کی اور پارلیمانی روایات کا کبھی احترام نہیں کیا۔ اسمبلی نے عبوری دستور کی ان دفعات میں ترمیم کے ذریعے پارلیمانی اداروں کا توازن بحال کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے گورنر جنرل کو اس قدر اختیارات حاصل تھے لیکن اس کا الٹا نتیجہ نکلا اور جمہوری اداروں کو زبردست دھچکا لگا۔

3.4- وفاقی عدالت اور دستور ساز اسمبلی

گورنر جنرل کے اس غیر آئینی اور بلا جواز اقدام کے خلاف اسمبلی کے اسپیکر مولوی تمیز الدین نے سندھ چیف کورٹ سے درخواست کی کہ وہ حکومت کو اسمبلی کے امور میں مداخلت سے باز رہنے کا حکم دے۔ سندھ چیف کورٹ نے متفقہ طور پر مولوی تمیز الدین کے حق میں فیصلہ دیا اور کہا کہ اسمبلی ایک خود مختار ادارہ ہے اور گورنر جنرل کو اسے توڑنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ گورنر جنرل نے اس فیصلے کے خلاف وفاقی عدالت میں اپیل کی۔ وفاقی عدالت نے ایک کے مقابلے میں چار کے اکثریتی فیصلے کے ذریعے گورنر جنرل کے اقدام کو درست قرار دیا اور مولوی تمیز الدین کی درخواست مسترد کر دی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ عدالت نے اس بارے میں کچھ نہ کہا کہ آیا اسمبلی توڑنے کا گورنر جنرل کا اقدام قانونی ہے یا نہیں۔ اس نے زیادہ تر زور اس بات پر دیا کہ سندھ چیف کورٹ کے گورنر جنرل کے فیصلے کے بارے میں کوئی حکم جاری

کرنے کا اختیار نہیں۔ چیف جسٹس محمد منیر نے کہا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ (233۔الف) جس کے تحت سندھ چیف کورٹ کو اختیار حاصل تھے کوئی قانونی حیثیت نہیں رکھتی کیونکہ گورنر جنرل نے اس پر دستخط نہیں کئے۔ اس فیصلے سے یہ تاثر ختم ہو گیا کہ دستور ساز اسمبلی ایک خودمختار ادارہ ہے۔

3.5- دوسری دستور ساز اسمبلی اور ون یونٹ

دوسری دستور ساز اسمبلی کا اجلاس 7 جولائی 1955ء کو مری میں ہوا۔ اس اسمبلی کی حیثیت پہلی اسمبلی سے مختلف تھی۔ کوئی سیاسی جماعت اس قدر نشستیں حاصل نہ کر سکی کہ وہ اکثریتی جماعت کا دعویٰ کرتی۔ مسلم لیگ سب سے بڑی جماعت تھی۔ جس نے 80 ارکان کے ایوان میں 25 نشستیں حاصل کیں۔ دوسری اہم جماعتوں میں یونائیٹڈ فرنٹ نے 16 اور عوامی لیگ نے 12 نشستیں حاصل کیں۔

مغربی پاکستان کے چار صوبے ملک کے دونوں حصوں کے درمیان برابری قائم کرنے میں ایک رکاوٹ تھے۔ مغربی پاکستان کے چار صوبوں کی مجموعی آبادی مشرقی پاکستان کی آبادی سے کم تھی۔ اسمبلی نے سوچا کہ دستور سازی کا کام شروع کرنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ ان چار صوبوں کو ملا کر ایک صوبہ بنا دیا جائے۔ اس طرح ایک متوازی اور مساوی حیثیت کا آئینی فارمولا تیار کرنے میں آسانی رہے گی۔ چنانچہ یہ معاملہ ملک کے مغربی حصے کی صوبائی مقننوں کو پیش کر دیا گیا جہاں ان صوبوں کو ملا کر ایک صوبہ بنانے کی منظوری دے دی گئی۔

ون یونٹ کا مسودہ حسین شہید سہروردی نے تیار کیا۔ جو مشرقی بنگال کے ایک ممتاز سیاست داد اور عوامی لیگ کے سربراہ تھے۔ 30 ستمبر 1955ء کو اسمبلی نے یہ بل منظور کر دیا (تقریباً 10,000,3 مربع میل کا علاقہ ملا کر ایک صوبہ بنا دیا گیا جس کا نام مغربی پاکستان رکھا گیا۔ مشرقی بنگال کا نام مشرقی پاکستان رکھا گیا۔ ملک دونوں صوبوں کے درمیان برابری کے فارمولے پر عمل درآمد کے لیے تیار تھا)۔ انتظامی نقطہ نگاہ سے اسمبلی کے اس اقدام کی تعریف کی گئی۔ ون یونٹ کے حامیوں کا خیال تھا کہ اس سے دستور سازی میں آسانی پیدا ہوگی اور روز افزوں صوبائیت ختم ہوگی۔ تاہم اس کے مخالفین کہتے تھے کہ ون یونٹ کے قیام سے مشرقی پاکستان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا اور مغربی پاکستان کے صوبے اس کے خلاف متحد ہوئے ہیں۔ جہاں تک صوبائیت ختم کرنے کا سوال ہے تو یہ محض خام خیالی تھی کہ صوبائی حدود ختم ہو جانے سے قومی استحکام پیدا ہوگا۔ مسئلے کا اصلی حل یہ تھا کہ اقتصادی اور سماجی ناہمواریوں کی طرف فوری طور پر توجہ دی جاتی۔

ون یونٹ بل کے بعد مغربی پاکستان کی ایک عبوری مقننہ قائم کی گئی جس میں پنجاب اپنے حصے سے کم نشستیں لینے پر رضامند ہو گیا پنجاب نے اس بات پر رضامندی کا اظہار اس لیے کیا کہ دوسرے چھوٹے صوبوں کے ساتھ بھائی چارے کی فضا

پیدا ہو جنہیں ایک بات کا خدشہ تھا کہ ون یونٹ میں پنجاب کو بالا دستی حاصل ہو گی۔ اس جذبے کے اظہار کے طور پر پنجاب آئندہ دس برسوں کے لیے اپنے علاقے کے کسی وزیر اعلیٰ کے حق سے دستبردار ہو گیا۔ مشتاق احمد گورمانی کو مغربی پاکستان کا گورنر مقرر کیا گیا اور ڈاکٹر خان صاحب کو وزیر اعلیٰ بنایا گیا جو آزادی سے پہلے کانگریس میں شامل تھے اور گورنر جنرل کے ایک قریبی دوست تھے۔

3.6- 1956ء کا دستور

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے نئی اسمبلی میں مختلف سیاسی جماعتوں کے ممبر شامل تھے اور ان میں سے کسی جماعت کو وزارت بنانے کے لیے ضروری اکثریت حاصل نہیں تھی۔ محمد علی بوگرہ اسمبلی کے ممبر منتخب نہ ہو سکے اور اُنہیں دوبارہ امریکہ میں پاکستان کا سفیر مقرر کر دیا گیا۔ مسلم لیگ کے سربراہ چوہدری محمد علی نے جو ایک سرکاری ملازم تھے ایک یونائیٹڈ فرنٹ قائم کیا چوہدری محمد علی نے لیگ اور یونائیٹڈ فرنٹ قائم کی مخلوط وزارت تشکیل دی اور نئے وزیر اعظم کا عہدہ سنبھالا۔

اس وزارت کا سب سے اہم کارنامہ یہ تھا کہ اس نے 1956ء کا آئین تیار کیا۔ یہ کام 1947ء میں شروع ہوا نو سال کے بعد مکمل ہوا۔ اسمبلی نے دستور کے پرانے مسودوں سے بھی کافی مواد حاصل کیا۔ اس کے علاوہ طریق انتخاب اور زبان جیسے نازک معاملوں کو آئندہ کے لیے اٹھا رکھا گیا۔ عجلت سے تیار ہونے والے اس دستور کے حسن و قبیح سے قطع نظر، ملک کو بہر حال دستور مل گیا، یہ دستور 23 مارچ 1956ء کو نافذ کر دیا گیا۔

1956ء کا آئین ''محمد علی فارمولا'' اور 1949ء کی قرارداد مقاصد کو پیش نظر رکھ کر تیار کیا گیا اس کے تحت:

- ☆ ملک کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا جس کا سربراہ مسلمان ہو گا اور اس کا انتخاب مرکزی مقننہ کرے گی۔
- ☆ ملک میں دو صوبائی اسمبلیاں ہوں گی۔
- ☆ ملک کے لیے جمہوری اور پارلیمانی نظام حکومت کا اعلان کیا گیا۔
- ☆ آئین میں حقوق سے متعلق اور سرکاری پالیسی کے اصولوں کے بارے میں بیان بھی شامل تھا۔
- ☆ آئین میں ایک آزاد عدلیہ کا قیام اور قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون نہ بنانے کے بارے میں بھی کہا گیا۔
- ☆ آئین میں صوبائی امور کی فہرست بھی دی گئی جو صوبائی حکومتوں کے دائرہ اختیار میں ہوں گے جہاں تک مرکز اور صوبوں کے درمیان مالی تعلقات کا تعلق ہے۔ اس کی بنیاد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ 1935ء پر رکھی گئی۔

اس طرح صدر اور کابینہ کے اختیارات کے بارے میں آئین میں صدر کے لیے بہت زیادہ اختیارات کی گنجائش رکھی گئی۔ صدر آسانی سے اپنے اختیارات کا غلط استعمال کر سکتا تھا اور اس کے غیر قانونی اقدامات کے خلاف کسی قسم کی کارروائی کے

بارے میں آئین میں کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ 1956ء کے آئین کے تحت سکندر مرزا جو 1955ء میں غلام محمد کی جگہ گورنر جنرل مقرر ہوا تھا اسلامی جمہوریہ پاکستان کا صدر مقرر ہوا۔

3.7- خود آزمائی نمبر 3

سوال نمبر 3 قرارداد مقاصد کے اہم پہلوؤں پر بحث کیجئے؟

(جواب کا جائزہ 3.1 کی روشنی میں لیں۔)

سوال نمبر 4 خواجہ ناظم الدین کی حکومت کے عوامی اعتماد کیوں کھویا۔ وضاحت کریں۔

سوال نمبر 5 غلام محمد آئین سازی کے عمل میں حارج ہوا تھا؟ دلائل دیں۔

(جواب کا جائزہ 3.3 کی روشنی میں لیں۔)

سوال نمبر 6 1956ء کے اہم آئین کے پہلوؤں کی وضاحت کریں۔

(جواب کو 3.4 کی روشنی میں پرکھیں۔)

4- سکندر مرزا اور پارلیمانی ادارے

4.1- تعارف

1956ء کے آئین کے تحت صدر ملک کا آئینی سربراہ تھا اور اسے کابینہ کے مشورے سے کام کرنا تھا۔ وہ پانچ سال کے لیے منتخب ہوا تھا۔ اس طرح اُس کے عہدے کے استحکام کو یقینی بنایا گیا۔ صدر کے برخلاف وزیراعظم کے عہدے کی بنیاد مقننہ کے اعتماد پر تھی۔ ایک ایسی اسمبلی میں، جہاں کسی سیاسی جماعت کو اس قدر اکثریت حاصل نہ ہو کہ وہ وزارت بنا سکے۔ صدر کے لیے کافی مواقع موجود ہوتے ہیں کہ وزیراعظم کے لیے جس قسم کے حالات پیدا کرنا چاہے، کرے۔

4.2- ری پبلکن پارٹی

سکندر مرزا پارلیمانی طرز حکومت کے خلاف تھے۔ انہوں نے اعلانیہ صدارتی نظام حکومت کی حمایت کی تھی۔ وہ گورنر جنرل (غلام محمد) اور وزیراعظم کے درمیان کشمکش دیکھ چکے تھے انہوں نے اپنے دور صدارت میں غلام محمد کی حکمت عملی پر عمل کیا۔ وہ اسمبلی کی مرضی کے خلاف نہیں جانا چاہتے تھے لیکن ایک غیر متحد پارلیمنٹ کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے انہوں نے اپنے دوست ڈاکٹر خان صاحب سے کہا کہ وہ ایک سیاسی جماعت قائم کرے۔ اس سیاسی جماعت کو ایک حربے کے طور پر استعمال کر کے وہ قومی اسمبلی کی رائے اپنے حق میں ہموار کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ری پبلکن پارٹی کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت قائم کی گئی۔ مسلم لیگ کے پرانے ممبر اس میں شامل ہو گئے۔ اسمبلی میں سکندر مرزا کی قوت کا انحصار اس پارٹی پر تھا۔ پارٹی کے ممبر ہر معاملے میں صدر سے مشورہ لیتے اور صدر کی ہر قسم کی کارروائیوں کی حمایت کرتے۔

4.3- چوہدری محمد علی کی وزارت (11 اگست 1955ء سے دسمبر 1956ء تک)

چوہدری محمد علی کی وزارت مسلم لیگ اور یونائیٹڈ فرنٹ کے درمیان اتحاد کے ذریعے قائم ہوئی۔ چوہدری محمد علی ایک کمزور وزیراعظم ثابت ہوئے۔ ان سے پہلے وزیراعظم پارٹی کا سربراہ بھی ہوتا تھا۔ جب محمد علی نے پارٹی کی قیادت میں دشواری محسوس کی تو انہوں نے ان دونوں عہدوں کو الگ الگ کر دی۔ پارٹی کے لیے سربراہ سردار عبدالرب نشتر مقرر ہوئے جو ری پبلکن پارٹی کے ان ممبروں کے ساتھ زیادہ اشتراک پسند نہیں کرتے تھے جنہوں نے لیگ سے علیحدہ ہو کر ری پبلکن پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔

وزیراعظم کی حیثیت سے چوہدری محمد علی کو اپنی پارٹی کو اعتماد میں لینا چاہیے تھا لیکن انہوں نے ڈاکٹر خان صاحب کی

حمایت کی جو مسلم لیگ کے ایک پرانے مخالف تھے۔ اس طرح وزیراعظم نے اپنی پارٹی کی ناراضگی مول لی۔ عوام سے رابطہ قائم نہ کرنے کی وجہ سے انہیں عوامی لیڈر کی حیثیت حاصل نہ ہوسکی۔ عوام میں مقبولیت نہ ہونے کی وجہ سے ان کے خلاف مظاہرے شروع ہو گئے۔ اب انہیں نہ تو پارٹی کی حمایت حاصل تھی اور نہ عوام کی، لہٰذا مستعفی ہونے کے سوا ان کے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا۔

4.4- وزیراعظم سہروردی (12 دسمبر 1956ء سے اکتوبر 1957ء تک)

سکندر مرزا نے حسین شہید سہروردی کو حکومت بنانے کے لیے کہا جو بادل نخواستہ اس بات پر رضامند ہوئے۔ اب کے عوامی لیگ اور ری پبلکن پارٹی کی مخلوط حکومت بنائی گئی۔ سہروردی ایک بہترین پارلیمنٹیرین تھے اور ایک ہر دلعزیز لیڈر بننے کی تمام خوبیاں ان میں موجود تھیں چنانچہ جلد ہی انہوں نے مقبولیت حاصل کر لی۔

سہروردی کی وزارت کے دوران بہت سے کاموں کا آغاز کیا گیا وہ بہت کچھ کرنا چاہتے تھے۔ ان کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ مہاجرین کی آبادکاری اور خوراک کی قلت کا تھا۔ انہوں نے متروکہ املاک کے معاملات کی تحقیقات کا مکمل کرنے کے لیے سر تھامس ایاس کو پھر سے بلا لیا۔ آبادکاری کے کام سے متعلق کمیٹیوں میں مہاجرین کے نمائندوں کو بھی شریک کیا گیا۔

چوہدری محمد علی نے دارالحکومت کراچی سے گڈاپ (Gadup) منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا، مالی اور سیاسی مشکلات کے پیش نظر سہروردی نے یہ منصوبہ ترک کر دیا اور کراچی کے شہریوں کو یقین دلایا کہ ان کے شہر کی خصوصی حیثیت برقرار رکھی جائے گی۔

طریق انتخاب کا معاملہ چوہدری محمد علی نے اگلی حکومتوں کے لیے رکھ چھوڑا تھا اس بارے میں صوبائی اسمبلیوں کا ردعمل باہم متصادم تھا۔ سہروردی نے مخلوط انتخابات کی حمایت کی اور دلیل یہ دی کہ اس طرح قومیت کو فروغ حاصل ہوگا۔ مخلوط انتخابات کی حمایت کے پیچھے ان مالدار اور بااثر ہندوؤں کا ہاتھ کارفرما نظر آتا ہے جنہیں پارٹی کے بعض دھڑوں پر کنٹرول حاصل تھا۔ انتخابات کے مسئلے پر بحث ہوئی اور بالآخر دستور میں مخلوط انتخابات کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا۔

سہروردی کی سب سے بڑی کمزوری مختلف عناصر کی حد درجہ سرپرستی تھی۔ ری پبلکن پارٹی کے ممبروں نے ان کی حمایت کی تھی جو محض اپنے مفادات کی خاطر اس پارٹی میں شامل ہوئے تھے۔ سہروردی کو ان کی سرپرستی کرنا پڑی۔ ساتھ ہی انہیں اپنی پارٹی کے بہت سے ایسے بدنام عناصر کی بھی سرپرستی کرنا پڑی جو زیادہ تر ہندوستان کے ساتھ ناجائز تجارت میں مصروف تھے، اس سے ان کی حکومت کے وقار کو نقصان پہنچا مشرقی پاکستان میں اپنی پارٹی کی حمایت کرتے وقت کبھی انہوں نے اپنے عہدے کے وقار کا خیال نہ کیا۔

ان پالیسیوں سے ملک کی معیشت پر برا اثر پڑا۔ سرکاری اخراجات میں تیزی سے اضافہ کی وجہ سے افراط زر کی شرح بڑھ گئی۔ روزمرہ استعمال کی چیزوں کی قلت پیدا ہوگئی۔ ادائیگیوں کا توازن بگڑ گیا اور بعض نہایت اہم اشیاء کی درآمد کے لیے بھی

زرمبادلہ موجود نہیں تھا۔ سہروردی نے حالات کو بہتر بنانے کے لیے بہت کوشش کی لیکن اپنی پارٹی کی مبالغہ آمیز توقعات کی وجہ سے وہ کوئی انقلابی قدم نہ اٹھا سکے اقتصادی بدحالی سے انتظامیہ کے حوصلے پست ہو گئے۔

سہروردی کی اثر آفرین شخصیت اور دلیرانہ سیاست خود ان کے لیے دشواریوں کا باعث ثابت ہوئی وہ جانتے تھے کہ سکندر مرزا انہیں پسند نہیں کرتے اور جب چاہیں گے انہیں ری پبلکن پارٹی کی حمایت سے محروم کر دیں گے۔ اس صورتحال سے بچنے کے لیے انہوں نے مسلم لیگ کی حمایت حاصل کرنے کے لیے بات چیت شروع کر دی۔ مغربی پاکستان کے گورنر ایم اے گورمانی نے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ جب ری پبلکن پارٹی کے ممبروں کو ان خفیہ مذاکرات کا علم ہوا تو انہوں نے گورمانی کی برطرفی کا مطالبہ کیا۔ سہروردی نے سبکدوش ہونے والے گورنر کو زبردست خراج تحسین پیش کیا اور اس کے فوراً بعد ہی ری پبلکن پارٹی کے خلاف مہم شروع کر دی۔ انہوں نے صوبہ پنجاب کا دورہ کیا اور ری پبلکن ممبروں کو غدار قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ ون یونٹ توڑنا چاہتے ہیں۔ سکندر مرزا ری پبلکن پارٹی کی سیاسی قوت کے خلاف تھے جسے خود انہوں نے قائم کیا تھا چنانچہ انہوں نے وزیراعظم سے استعفیٰ طلب کر لیا۔ سہروردی نے انکار کیا اور دعویٰ کیا کہ انہیں اکثریت کی حمایت حاصل ہے لیکن صدر نے سرکاری عہدے سے متعلق تمام ذرائع کو پس پشت ڈالتے ہوئے وزیراعظم کو برطرف کر دیا۔ صدر نے وزیراعظم کی اس خواہش کی پرواہ نہ کی کہ اسمبلی کی رائے معلوم کی جائے اس طرح اس نے آئین کی خلاف ورزی کی۔

4.5- آئی۔آئی۔ چندریگر (18 اکتوبر سے دسمبر 1957ء تک)

سہروردی کی وزارت کے زمانے میں چندریگر حزب اختلاف کے قائد تھے۔ سکندر مرزا کی نگاہ انتخاب اُن پر پڑی۔ سہروردی کی برطرفی کے بعد صدر بہت دلیر ہو گئے تھے۔ سہروردی کی برطرفی کے غیر آئینی فعل کی طرح چندریگر کی تقرری بھی پارلیمانی جمہوریت کی روایت کے خلاف تھی۔ صدر نے اپنے ری پبلکن دوستوں کو ہدایت کی کہ وہ مسلم لیگ کے سربراہ کی حمایت کریں۔

ابراہیم اسمٰعیل چندریگر ایک قابل وکیل تھے۔ وہ افغانستان میں سفیر رہنے کے علاوہ کئی صوبوں کے گورنر بھی رہ چکے تھے۔ جب مولوی تمیز الدین نے گورنر جنرل غلام محمد سے قانونی تازعے کے بارے میں سندھ چیف کورٹ میں اپیل کی تھی تو چندریگر نے اس مقدمے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، جس پر چیف جسٹس نے بھی اس کی تعریف کی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ چندریگر کو وزیراعظم مقرر کر کے صدر اس عہدے کے وقار پر ضرب کاری لگانا چاہتے تھے۔ چندریگر کی مخلوط حکومت مسلم لیگ، ری پبلکن پارٹی، کرشک سرامک اور نظام اسلام چار پارٹیوں پر مشتمل تھی۔ قطع نظر اس کے کہ یہ کمزور اتحاد تھا، اس کی وجہ سے مسلم لیگ اور ری پبلکن پارٹی پھر ایک جگہ جمع ہو گئیں حالانکہ دونوں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔

چندریگر نے اعلان کیا کہ میری پارٹی حکومت میں صرف اس لیے شامل ہوئی ہے کہ نظریہ پاکستان کی حفاظت کر سکے، جسے مخلوط انتخابات کی وجہ سے خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ مگر اپنے مختصر دور حکومت میں شامل پارٹیوں میں اختلافات کی وجہ سے وہ اپنے منصوبوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکے یہ ایک بھونڈا سا اتحاد تھا اور سکندر مرزا اس کی حمایت سے دستبردار ہونے کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ یہ موقع انہیں جلد ہی حاصل ہو گیا اور انہوں نے مخلوط حکومت توڑ دی، جو محض چھ مہینے تک اقتدار میں رہ سکی۔

4.6- ملک فیروز خان نون (16 دسمبر 1957ء سے 7 اکتوبر 1958ء تک)

ری پبلکن پارٹی نے دوسری پارٹیوں کی وزارتوں کی حمایت کی تھی۔ اب سکندر مرزا کی نگاہ انتخاب ری پبلکن پارٹی کے ملک فیروز خان نون پر پڑی۔ بظاہر ملک نون کو سہروردی کی طرح ری پبلکن اور عوامی لیگ کی پارلیمانی حمایت تھی، تاہم اُن کی کابینہ کی تشکیل مختلف انداز سے ہوئی۔ اُن کی کابینہ پہ ری پبلکن ممبرز غالب تھے۔ ری پبلکن ممبروں کو اقتدار تو حاصل ہو گیا مگر انہیں عوامی لیگ اور مسلم لیگ کے ممبروں کی پوزیشن میں رکھا گیا۔ عوامی لیگ کی مسلسل حمایت حاصل کرنے کے لیے انہیں عوامی لیگ کو خوش رکھنا پڑتا تھا یہ پارٹی چونکہ سازشی سیاست کی پیداوار تھی اس لیے اسے کوئی مقبولیت نہ تھی۔

وزیر اعظم ملک فیروز خان نون کا تعلق پنجاب کے جاگیردار طبقے سے تھا، اس لیے وہ زرعی اصلاحات * کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے اعلانیہ جاگیرداری نظام کو جائز قرار دیا کیونکہ ان کے خیال میں یہ نظام کی استحکام کے لیے مفید تھا۔

نون حکومت نے جو اقتصادی پالیسیاں اختیار کیں ان کا بڑا مقصد امراء کے مفادات کا تحفظ کرنا تھا۔ محصولات کا بالواسطہ نظام برقرار رکھا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بھاری ٹیکس لگانے کے باوجود سرکاری آمدنی میں اضافہ نہ ہوا۔ سمگلنگ اور چور بازاری کا بازار گرم رہا۔ عام آدمی پر بوجھ بڑھتا گیا اور امیر غریب کے درمیان خلیج وسیع ہوتی گئی۔

مشرقی پاکستان میں صورتحال مزید خراب ہو گئی۔ عوامی لیگ نے مرکزی کابینہ میں شریک ہو کر مشرقی پاکستان میں اقتدار میں رہنے کو ترجیح دی۔ اُس نے ری پبلکن پارٹی کی حمایت کر کے کئی موقعوں پر مرکزی حکومت سے اس کی بھاری قیمت وصول کی۔ جب عوامی لیگ کی صوبائی حکومت کو عدم اعتماد کی تحریک کا خطرہ پیدا ہوا تو صوبے میں گورنر راج نافذ کر دیا گیا جب مشرقی پاکستان کے گورنر اے۔ کے۔ فضل الحق نے ان کی غیر جمہوری سرگرمیوں کی حمایت سے انکار کیا تو اس کی بے عزتی کی گئی لیکن سب سے بڑا فائدہ جو عوامی لیگ کے ممبروں نے مرکزی حکومت سے حاصل کیا وہ سمگلنگ کا کاروبار تھا۔ سہروردی کی حکومت نے عوامی لیگ کے بہت سے ممبروں کو اس غیر قانونی تجارت کی اجازت دے کر اُن کی خوشنودی حاصل کی تھی اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کے بہت سے وسائل سرحد پار پہنچا دیئے گئے۔ ملکی دولت کے اس ضیاع کو روکنے کے لیے فوج مقرر کر دی گئی۔ انسداد سمگلنگ کی اس کارروائی کا

* یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مشرقی پاکستان میں تو زرعی اصلاحات شروع کر دی گئیں مگر مغربی پاکستان میں اس پالیسی کو خطرناک سمجھا گیا۔ اگر یہاں بھی زرعی اصلاحات نافذ ہو جاتیں تو نون اور اس کے دوست اپنی جاگیروں سے ہاتھ دھو بیٹھتے اور یہ بات اُنہیں گوارا نہیں تھی۔

خاطر خواہ نتیجہ نکلا لیکن اس سے صوبائی اسمبلی میں ایک بااثر غیر مسلم دھڑا سخت ناراض ہو گیا چنانچہ انسداد سمگلنگ کی کارروائی روک دی گئی۔ اس کے علاوہ ایسے بہت سے شر پسند افراد کو بھی رہا کر دیا گیا جو پاکستان کے خلاف جاسوسی کرنے کے الزام میں ملوث تھے۔

قومی اور عوامی مفادات سے اس درجہ لاپرواہی کے خلاف قانون ساز اسمبلی میں سخت ردعمل ہوا ممبروں نے ایوان میں کھلے بندوں تشدد کا مظاہرہ کیا۔ جب ڈپٹی سپیکر نے نظم وضبط برقرار رکھنے کی کوشش کی تو اس پر بھی حملہ کر دیا گیا اور وہ زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا۔ یہ واقعہ 23 ستمبر 1958ء کو ہوا۔

نون کی وزارت کے دوران سیاسی بحران اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ سیاستدانوں نے جمہوری اداروں کے احترام کا کوئی لحاظ نہ کیا۔ سیاسی لیڈروں کا اصل مطمع نظر اقتدار حاصل کرنا تھا اور جو کوئی اس مقصد کے حصول میں اُن کی مدد کرتا، اس پر نوازشوں کی بارش کر دی جاتی۔ عوامی لیگ نے جو مفادات حاصل کئے وہ اس سے مطمئن نہ تھی چنانچہ اس نے حکومت میں شامل ہونے کا مطالبہ کر دیا۔ اس طرح جو کابینہ وجود میں آئی اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ انتخابات جو نومبر 1958ء میں ہونے والے تھے وہ حکومت نے اپنے کامیاب نہ ہونے کے خوف سے مارچ 1959ء تک ملتوی کر دیئے جس سے مزید افراتفری پیدا ہوئی۔ اشیاء کی قیمتیں آسمان پر پہنچ چکی تھیں۔ زرمبادلہ کے ذخائر ختم ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر خان صاحب کو قتل کر دیا گیا تھا۔ سیاستدانوں نے ایک دوسرے معاملے کی طرف توجہ مبذول کی۔ مسلم لیگ نے لاقانونیت کے خلاف ایک ملک گیر مظاہرے کا انتظام کیا۔

4.7- مارشل لاء

7 اکتوبر 1958ء کو سب سے سنا کہ ایک صدارتی حکم جاری ہوا جس کے تحت آئین معطل کر دیا گیا، اسمبلیاں توڑ دی گئیں، وزیروں کو برطرف کر دیا گیا اور سیاسی پارٹیوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ یہ پارلیمانی جمہوریت کا اختتام تھا۔ ملک کا انتظام جنرل ایوب خان نے سنبھال لیا مارشل لاء کا نفاذ ہوا اور ایوب خان نے فوج کے سربراہ اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے فرائض سنبھال لئے۔ سکندر مرزا نے اپنے اعلان میں سیاسی رہنماؤں پر الزام لگایا کہ وہ غیر ذمہ دارانہ سیاست اور بے حد سے زیادہ دھاندلی کے ذمہ دار ہیں۔ نئی کابینہ نے جلدی محسوس کیا کہ موجودہ صدر وہی طریقہ کار استعمال کر رہے ہیں جو کہ پہلے صدر کرتے رہے ہیں صدارتی اعلان کے 20 دن بعد سکندر مرزا کو اپنا عہدہ چھوڑنے کے لیے کہا گیا اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے ملک کے سربراہ کا عہدہ بھی خود ہی سنبھال لیا۔

4.8- خود آزمائی نمبر 4

سوال نمبر 7 سکندر مرزا کی پالیسیوں اور کم مدت وزارتوں میں تعلق واضح کریں۔

مشغلہ: اکتوبر 1951ء کے بعد 1958ء تک بننے والے وزرائے اعظم اور ان کے عہد کے اہم واقعات کا جدول تیار کیجئے۔

5- تشریحات

1-	اکن لیک	فیلڈ مارشل سر کلاڈ اکن لیک برطانوی ہند کا آخری کمانڈر انچیف۔
2-	باری دوآب	پنجاب کا میدانی علاقہ جو دریائے ستلج اور دریائے راوی کے درمیان واقع ہے۔
3-	بنیادی اصولوں کی رپورٹ	ملک کے آئین کے لیے تیار کی گئی رپورٹ جو پہلی آئین ساز اسمبلی کی قائم کردہ ایک کمیٹی نے 1950ء میں مرتب کی تھی۔
4-	ریڈ کلف ایوارڈ	پاکستان کے بھارت کے درمیان سرحدوں کے بارے میں برطانوی جج سر سیرئیل ریڈ کلف کا فیصلہ۔
5-	سری نگر	ریاست جموں وکشمیر کا صدر مقام۔
6-	سلامتی کونسل	اقوام متحدہ کا ایک ادارہ جس کا مقصد دنیا میں امن و امان برقرار رکھنا ہے۔
7-	عالمی بنک	اقوام متحدہ کا ایک ادارہ جس کا مقصد دنیا میں اقتصادی ترقی کی حوصلہ افزائی کرنا ہے۔
8-	فیڈرل کورٹ	عدالت عالیہ جس کے ذمے آئین کی تعمیل کرانا، مرکز اور صوبوں کے درمیان تنازعے طے کرنا ہے۔
9-	کنارے کے حقوق	دریا کے کنارے رہنے والے لوگوں کا دریائی پانی استعمال کرنے کا حق۔
10-	لیاقت علی خان	پاکستان کے پہلے وزیر اعظم
11-	مہاراجہ	''بڑا راجہ''.....حوالہ ہری سنگھ کا ہے جو ریاست جموں وکشمیر کا آخری حکمران تھا۔

6۔ کتابیات

1- Ali, Chaudhry Mohammad: *Emergence of Pakistan,* (Columbia, 1967.)

2. Symonds, Richard: *The Making of Pakistan,* (Lahore 1951.)

3. Ahmad, Mushtaq: *Government and Politics in Pakistan.* (Karachi, 1970.)

4. Chaudhry. G.W,: *Constitutional Development in Pakistan.* (Karachi, 1970.)

5. Callard. Keith,: Pakistan ..... *A Political Study,* (London, 1957.)

6. Qureshi. I. H.: *A Short History of Pakistan*, Vol. IV. (Karachi, 1967.)

یونٹ 8

1947ء کے بعد
اردو ادب میں اہم رجحانات

تحریر:
نظیر صدیقی

فہرست مضامین

یونٹ کا تعارف		250
یونٹ کے مقاصد		250
1۔	تعارف	251
-1.1	ادب اور رجحانات کی اصطلاحات کی تعریف	251
2۔	پاکستانی ادب کا مفہوم	252
-2.1	آغاز	252
-2.2	نمایاں علامات	252
-2.3	پاکستانی ادب	252
-2.4	سرسید تحریک اور ترقی پسند مصنفین	253
-2.5	ترقی پسند تحریک کا ردعمل	254
-2.6	ادبی تصورات کا جائزہ	255
-2.7	خودآزمائی نمبر 1	255
3-	اصنافِ ادب	256
-3.1	غزل	256
-3.2	غزل میں نئے رجحانات	256
-3.3	نظم	257
-3.4	افسانہ اور ناول	258
-3.5	ڈرامہ	259
-3.6	سوانح اور سرگزشت	260

3.7-	قلمی تصویریں اور خاکے	260
3.8-	رپورتاژ اور انشائیہ	261
3.9-	سنجیدہ مضامین	261
3.10-	سفرنامہ	261
3.11-	اردو تنقید	262
3.12-	پاکستانی کلاسیکی ادب کے تراجم	263
3.13-	اختتام	263
3.14-	خودآزمائی نمبر 3	263
4-	تشریحات	264

یونٹ کا تعارف

یہ یونٹ پاکستان کے اردو ادب سے متعلق ہے۔ اس میں آپ کو بتایا گیا ہے کہ آزادی کے بعد اردو ادب میں کس نوعیت کے رجحانات پیدا ہوئے۔ اردو ادب کا میدان وسیع ہے۔ مجموعی طور پر اس کی ترقی برصغیر میں ہوئی۔ مختلف موضوعات پر بحث کے دوران 1947ء سے پہلے کی روایات اور رجحانات کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کے مطالعے کے بعد طلباء اس قابل ہوسکیں گے کہ:

1- پاکستان میں اردو ادب کی مختلف اصناف سخن کے ارتقاء کے بارے میں اندازہ کرسکیں۔

2- ان مختلف سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی اسباب کو جان سکیں جو ہمارے ملک میں اردو ادب کی تشکیل کا باعث بنے۔

3- مختلف اصناف سخن کے نمائندہ مصنفوں کے حوالے سے ادب کی تشریح کرسکیں۔

1- تعارف

1.1- ادب اور رجحانات کی اصطلاحات کی تعریف

کسی چیز کی تعریف کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے بارے میں واضح تصور موجود ہو۔ اس لیے آیئے کوشش کرتے ہیں کہ ادب اور رجحانات کے الفاظ کی، جو اس یونٹ کے عنوان میں شامل ہیں، وضاحت کریں۔

ادب کی تعریف مختلف طریقوں سے کی گئی ہے لیکن کوئی تعریف بھی مکمل اور قطعی نہیں ہے۔ ہر زمانے میں ادب کی تعریف مختلف انداز میں کی جاتی رہی ہے۔ شاید بہتر ہوگا اگر ہم تمام اصناف سخن کی بجائے محض ادب کی بڑی اقسام (نثر و نظم) کی تعریف کرنے پر اکتفا کریں۔

> ''ہر زبان میں ادب نظم و نثر پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر زبان کے ادب میں نظم و نثر کی مختلف اصناف ہوتی ہیں مثلاً اردو ادب میں نثر کی کچھ اقسام داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ، انشائیہ اور تنقید وغیرہ ہیں اور اسی طرح اردو نظم کی اقسام، غزل، مثنوی، رباعی اور مرثیہ وغیرہ ہیں۔ اب ادب کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ وہ سب کچھ جو مختلف اصناف نظم و نثر میں لکھا گیا ہے، ادب ہے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی جذبات کے فنکارانہ انداز میں اظہار کا نام ادب ہے بشرطیکہ وہ کسی زبان کی ترویج و ترقی میں حصہ دار ہو۔ ادب کی یہ تعریف مکمل نہیں تاہم یہ ایک کارآمد اور قابل عمل تعریف ہے۔

جہاں تک رجحانات کا تعلق ہے، خیال کے مختلف میلانات احساسات کے جدید رویوں، بدلتے ہوئے نقطہ نظر، نئے انداز سے زندگی کو دیکھنے اور اظہار بیان کے تجربات کے ذریعے ان کی توضیح کر سکتے ہیں۔ ادب نہ صرف ادبی صداقتوں کے ذریعے منعکس ہوتا ہے بلکہ ہم عصر زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، یہ زندگی پر اثر ڈالتا ہے اور جواباً زندگی کا اثر قبول کرتا ہے۔ زندگی کے تخلیقی محرکات کو ابھارتا ہے جو انجام کار ادب کی روایات اور رجحانات کا روپ اختیار کرتے ہیں۔

2۔ پاکستانی ادب کا مفہوم

2.1- آغاز

سال 1947ء ہماری قومی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سال وہ ہے جب برطانوی ہند کی تقسیم عمل میں آئی جس کے نتیجے میں مملکت پاکستان وجود میں آئی اس انقلابی تقسیم کے نتیجے میں بہت سی چیزیں معرض وجود میں آئیں اور اردو ادب میں داخل ہوئیں۔ یہ دعویٰ غلط نہ ہوگا کہ اردو ادب کا آغاز بطور پاکستانی ادب سال 1947ء سے ہوا جس سال پاکستان قائم ہوا۔ ہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اردو ادب بطور پاکستانی ادب سے کیا مراد ہے؟

2.2- نمایاں علامات

اول اس سے مراد یہ ہے کہ پاکستان میں نشوونما پانے والے اردو ادب کی امتیازی خصوصیات بھارت میں تخلیق کئے جانے والے اردو ادب سے مختلف ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ پاکستانیوں کا بطور ملت ایک نمایاں تشخص ہے۔ ملت کی اساس دین اسلام کے ارکان اور اسلامی نظریہ مساوات اور معاشرتی انصاف پر ہے۔

ایک اور وجہ جو منطقی طور پر پاکستان کے اردو ادب کو ہندوستانی اردو ادب سے ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے جس کا مقصد و مدعا ایک اسلامی حکومت کا قیام ہے۔ یہ اسباب پاکستان اور ہندوستان میں مختلف قسم کے ادب کی تخلیق کا باعث بنے۔

پاکستان میں 1947ء کے بعد بڑا فکر انگیز دینی ادب وجود میں آیا۔ نظریاتی طور پر پاکستانی قومیت اور عالم اسلام کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کے بارے میں بھی ہمارے ادب میں بہت کچھ موجود ہے۔ علامہ اقبال اور قائداعظم کے بارے میں یہ نظریاتی بحثیں کتب و مقالات میں بھی ملتی ہیں۔

2.3- پاکستانی ادب

پاکستان کے ابتدائی دور میں پاکستانی مصنفین کے ایک گروہ کے لیے اس حقیقت کو ماننا یا قبول کرنا آسان نہ تھا کہ پاکستان کا اردو ادب اصولی طور پر مختلف نوعیت کا ہونا چاہیئے۔ وہ اصرار کرتے تھے کہ ادب ہمیشہ آفاقی اور شخصی ہوتا ہے۔ جس چیز کو وہ فراموش کرتے رہے اور سمجھنے سے قاصر رہے وہ یہ ہے کہ ادبی آفاقیت کسی قوم کی ملی اور ثقافتی تشخص کی چھاپ سے منع نہیں کرتی جو اسے تخلیق کرتی ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کی مشترکہ زبان انگریزی ہے لیکن برطانوی ادب امریکی ادب سے نمایاں طور پر مختلف ہے

اور پھر بھی برطانوی اور امریکی ادب کی آفاقیت وجہ نزاع نہیں بنی تاہم اردو ادب ایک ہی رات میں پاکستانی ادب نہیں بنا بلکہ پاکستانی تشخص کی آہستہ آہستہ نشوونما ہوئی لیکن ادب میں نظریہ پاکستان کا اظہار روز اوّل سے رہا۔

پاکستان کے معرض وجود میں آتے ہیں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے جس کے نتیجے میں وسیع پیمانے پر قتل عام اور بیدردانہ غارت گری واقع ہوئی۔ دوملکوں کے درمیان اتنے وسیع پیمانے پر آبادی کے تبادلے کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ المناک واقعات نمایاں موضوع بن گئے اور تمام مارکیٹ ایسے ادب سے بھر گئی، جسے فسادات کا ادب کہا جاتا ہے۔ مصنفین نے لوگوں پر کئے گئے مظالم اخلاق سوز اور شرمناک واقعات بیان کئے۔ جیسے قدرت اللہ شہاب نے اپنی مشہور کہانی ''یا خدا'' میں کیا۔ ایسے ہی ادب کے ذریعے سے نظریہ پاکستان پہلی بار محسوس کیا جانے لگا۔ بعض پاکستانی مصنف اور شاعر ایسے بھی تھے جن کے خیالات، رد عمل اور رویئے بھارتی مصنفین سے ملتے جلتے تھے۔ اُن کی سوچ کا یہ انداز ٹھیک نہیں تھا کیونکہ اس سے احساس بیگانگی ہوتا تھا۔

ملک کے نامور ادیب اور ناقد ڈاکٹر تاثیر نے پاکستانی شعور پر زور دیا۔ ایک اور ناقد محمد حسن عسکری نے اپنے ایک اہم مضمون ''مسلمان اور قومی شعور'' میں واضح کیا کہ پاکستانی مصنفین کو بیگانگی کا احساس ختم کرنا چاہیئے اور ماضی کے عظیم مسلمان اہل قلم مثلاً حافظ سعدی، اقبال کی طرح اپنی قوم کا اعتماد حاصل کرنا چاہیئے۔ انہیں قوم کو غلط بیانی اور بے جا مبالغے سے نہیں بلکہ پرخلوص محبت اور دیانت داری سے اس کے حسن وقبیح سے آگاہ کرنا چاہیئے۔

اسی طرح کچھ اور مصنفین بھی تھے جیسے ممتاز شیریں، عزیز احمد، انتظار حسین اور سلیم احمد وغیرہ جو ادب میں پاکستانی شعور و آگاہی کو ترقی دینے کے لیے کوشاں تھے۔ وہ مسلم تشخص کی دوبارہ تلاش کرنے اور ثقافت و روایات کے بھرپور خزانے سے تخلیقی تحریک کی آرزو کر رہے تھے۔

مصنفین کے ایک دوسرے گروہ نے جس کا تعلق اردو ادب کی ترقی پسند تحریک سے تھا ان پر قدامت پسندی اور رجعت پسندی کا لیبل لگایا۔ بعد میں ایک ترقی پسند نقاد فتح محمد ملک نے اردو ادب میں پاکستانیوں کے قومی تشخص کی تلاش مکرر کی اور برصغیر میں مسلمانوں کے مذہبی اور ثقافتی ورثہ کے ساتھ اس کا تعلق پیدا کیا۔

2.4- سرسید تحریک اور ترقی پسند مصنفین

سرسید تحریک پر کچھ کہنے سے پہلے آیئے ہم دیکھیں کہ ادب میں تحریک کس کو کہتے ہیں؟

> بعض خاص مقاصد کے ماتحت ادب کی تخلیق کے لیے ایک فرد کی شعوری کوشش یا ایک جیسی سوچ رکھنے والے افراد کی منظم کوشش کا نام تحریک ہے۔

سرسید تحریک کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرتی بہتری اور اصلاح تھا۔ جن کی شان وشوکت ختم ہوگئی تھی اور جن کی حکومت پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ سرسید اور اس کے ساتھی حالی، شبلی، نذیر احمد وغیرہ اپنے دور کے بددل اور شکست خوردہ

مسلمانوں میں خود اعتمادی کی ایک نئی روح پھونکنا چاہتے تھے تا کہ ان کی رسائی ان کے شاندار ماضی تک ہو سکے اور اس حوالے سے روشن مستقبل کے تعین اور اس کے حصول کے لیے جدوجہد کریں۔

ترقی پسند تحریک کی بنیاد برصغیر کے ادب میں چند مصنفین * کے ہاتھوں 1935ء میں پڑی۔ اس تحریک کے یہ مقاصد تھے: برطانوی ہند کو انگریزوں کی غلامی سے سیاسی آزادی دلانا، عوام کو سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام سے آزادی دلانا، فرد کو پابندیوں اور رسم و رواج کے پھندوں سے آزاد کرنا۔ تحریک سے وابستہ اکثر مصنفین روس کے مارکسی انقلاب سے متاثر ہوئے جو 1917ء میں واقع ہوا۔ وہ اردو ادب میں مارکسی ** انقلاب کے بیج بونا چاہتے تھے اور اشتراکی نظام زندگی کی کھیتی کاٹنا چاہتے تھے۔ تاہم اس تحریک کے منشور میں مارکسیت یا اشتراکیت کا ذکر نہیں تھا لیکن عمل طور پر جو اقدامات کئے گئے وہ منشور سے بالکل مختلف تھے۔

ترقی پسند تحریک پر سرسید تحریک کی طرح ملکی اور مقامی رنگ غالب نہیں تھا۔ سرسید تحریک نے ہندوستان پر انگریزی تسلط کے نتیجے میں جنم لیا۔ ترقی پسند تحریک کا خیال کچھ نوجوانوں کے ذریعے سے یورپ سے درآمد کیا گیا جو وہاں زیر تعلیم تھے۔ تاہم برطانوی ہند کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی حالات اس یورپی خیال کی نشوونما میں مددگار ثابت ہوئے۔

ترقی پسند تحریک سرسید تحریک کی طرح ادب برائے ادب کی بجائے ''ادب برائے زندگی'' پر یقین رکھتی تھی۔ ادب برائے ادب کے اصول کو حلقہ ارباب ذوق نے اپنایا۔ انہیں دنوں جب ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا میراجی کے زیر اثر ایک اور ادبی تحریک وجود میں آئی۔ دونوں تحریکیں بیک وقت چمکیں، دونوں تحریکوں کی شاخیں برصغیر کے مختلف علاقوں میں قائم تھیں لیکن ترقی پسند تحریک زیادہ فعال اور مقبول تھی۔ 50-1940ء کے دوران میں یہ نقطہ عروج پر تھی۔

1935ء کے بعد اکثر مصنفین خواہ ان کا تعلق حلقہ ارباب ذوق سے تھا، ترقی پسند مصنفین کہلائے جانے لگے۔ ہر وہ شخص جس نے پرانے معاشرتی یا ادبی رسم و رواج کے خلاف بغاوت کی وہ ترقی پسند کہلانے لگے۔

2.5- ترقی پسند تحریک کا ردعمل

برصغیر جنوبی ایشیا کی تقسیم کے بعد پاکستان میں ترقی پسند تحریک کے پیش کاروں کو ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کے درمیان تمیز کرنے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ کانفرنسیں منعقد کی گئیں۔ ترقی پسند تحریک کے بنیادی اصولوں پر نظر ثانی کی گئی اور ان مصنفین کی جن کی تحریریں بنیادی اصولوں پر پوری نہیں اترتی تھیں انہیں ترقی پسند تحریک سے خارج کر دیا گیا۔ ایسے مصنفین پر قدامت پسند اور رجعت پسند کے لیبل لگا دیئے گئے اور ترقی پسند وسائل و جرائد نے ان کی تحریروں کی اشاعت پر پابندی لگا دی۔ ایسے ادباء اور شعراء

* ان میں سجاد ظہیر، احمد علی، ڈاکٹر ملک راج آنند سرفہرست تھے۔ اس تحریک کو ڈاکٹر عبدالحق، پریم چند، پروفیسر فراق گورکھپوری، پروفیسر مجنوں گورکھپوری اور دیگر بے شمار ادبی شخصیتوں کا تعاون حاصل تھا۔

** کارل مارکس ایک جرمن فلسفی تھا جس کے سیاسی اور اقتصادی نظریات نے اشتراکیت کی راہ ہموار کی۔

میں میراجی، ن۔م راشد، سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی، محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں اور بہت سے دوسرے ادیب شاعر اور نقاد شامل تھے۔

پاکستان کے ابتدائی دور میں ترقی پسند تحریک کے بارے میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ محمد حسن عسکری، ممتاز شیریں، ڈاکٹر احسن فاروقی اور عزیز احمد جیسے ممتاز ناقدین تحریک پر حملہ آور ہوئے۔ سلیم احمد اور انتظار حسین جیسے ابھرتے ہوئے مصنفین نے اس حملے میں مزید شدت پیدا کی۔

2.6- ادبی تصورات کا جائزہ

محمد حسن عسکری نے ترقی پسند تحریک کے بنیادی تصورات کو چیلنج کیا۔ اس نے ''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' کے نظریوں کو جانچا اور نہایت دقت نظری کے بعد بتایا کہ وہ لوگ جو ادب برائے زندگی کے دعویدار ہیں زندی کے بیشتر حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اسی طرح سے وہ مصنفین جو فن برائے فن کے قائل ہیں۔ زندگی کے عمیق مسائل کے ساتھ ان کا گہرا تعلق ہے اور وہ ادب کو ذہنی عیاشی خیال نہیں کرتے۔ عسکری نے ان مصنفین کی تحریروں میں جو ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھتے ہیں بنیادی قسم کے غلط بے بنیاد اور سطحی تصورات کی نشاندہی کی۔ اس کے مضامین (i) انسان اور آدمی (ii) فن برائے فن (iii) مارکسیت اور ادبی منصوبہ بندی (iv) ادب اور انقلاب، اس بارے میں بہت روشن اور خیال افروز ہیں۔

ترقی پسند تحریک نے کلاسیکی ادب کی قدر و قیمت بہت کم کر دی تھی اور اردو شاعری کی ایک اہم صنف غزل کا مقام بہت گرا دیا تھا۔ عسکری نے اپنی تحریروں اور داستان طلسم ہوشربا کے انتخاب کے ذریعے سے کلاسیکی ادب کی اہمیت کو بحال کیا۔ یہ سب کچھ ترقی پسند تحریک کے ردعمل کے طور پر ہی نہیں بلکہ ادب و ثقافت کے بہترین ورثہ کو ازسرنو زندہ کرنے کے خیال سے کیا گیا۔ عسکری پہلا نقاد ہے جس نے داستان کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی اور اس سلسلے میں وقار عظیم، عزیز احمد، انتظار حسین اور دیگر ادیبوں نے اس کی پیروی کی۔

2.7- خودآزمائی نمبر 1

سوال نمبر 1 ادب میں پاکستان کے تشخص سے کیا مراد ہے؟

(جواب کا تجزیہ 2.1 اور 2.2 کی روشنی میں کیجئے۔)

سوال نمبر 2 ترقی پسند مصنفین کے نقطہ نظر پر تبصرہ کیجئے۔

(جواب کا موازنہ 2.3 اور 2.4 میں دی گئی بحث سے کیجئے۔)

سوال نمبر 3 کن ادیبوں نے ادب میں پاکستانیت پر زور دیا؟ وضاحت کیجئے۔

(جواب کا موازنہ 2.5 اور 2.6 سے کیجئے۔)

3- اصناف ادب

3.1- غزل

یہ اردو شاعری کی سب سے مقبول اور زندہ و پائندہ صنف ہے۔ پہلے اس میں حسن و عشق کے مضامین ہی زیادہ تر بیان کئے جاتے تھے۔ اب مختلف قسم کے مضامین بیان کیے جاتے ہیں غزل کو 1930ء سے 1940ء کے سالوں میں نہ صرف ترقی پسندوں بلکہ چند غیر ترقی پسند مصنفین نے پس پشت ڈال دیا تھا اور غزل کی بجائے نظم پر زیادہ زور اور توجہ دی جاتی تھی۔ آزادی کے بعد کے سالوں میں غزل کے بارے میں خوب لے دے ہوئی۔ ممتاز حسین جیسے ترقی پسند ادیب نے بھی غزل کے خلاف بہت کچھ لکھا لیکن غزل نے نہ صرف اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر لیا بلکہ ملک کی ترقی پسند اور غیر ترقی پسند سبھی شعراء میں اسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور اسے ایک نئی زندگی ملی۔

اردو شاعری میں ترقی پسند تحریک کے معروف شاعر فیض احمد فیض نے اپنی بہترین غزلیں 1947ء کے بعد لکھیں۔ ان کی غزلیں ترقی پسند نقادوں کے غزل پر لگائے گئے الزامات کی تردید کرتی ہیں۔ غزل بدستور بہت سے ترقی پسند شعراء کے جذبات کا ذریعہ اظہار بنی رہی جیسے احمد ندیم قاسمی، سیف الدین سیف اور قتیل شفائی وغیرہ۔

غیر ترقی پسند شعراء میں ناصر کاظمی ایک غیر معمولی غزل گو شاعر ہے جو آزادی کے بعد جلد ہی منظر عام پر آیا۔ اگرچہ بنیادی طور پر ''رومانی'' شاعر ہے۔ کاظمی کی ابتدائی غزلیں فرقہ وارانہ فسادات کی تباہ کاریوں اور تقسیم برصغیر کے نتیجے میں ہونے والے تجربات کی منظر کشی کرتی ہیں۔ اس کا خود اپنا ایک خاص اسلوب ہے جو بآسانی پہچانا جا سکتا ہے۔ حفیظ جالندھری، احسان دانش، عبدالحمید عدم، حفیظ ہوشیار پوری، جمیل الدین عالی، ادا جعفری، احمد فراز، سلیم احمد، ساقی فاروقی، منیر نیازی، شکیب جلالی، حامد عزیز مدنی، شہزاد احمد، پروین شاکر، کشور ناہید وغیرہ کا بھی جدید اردو غزل میں بڑا حصہ ہے۔ غزل گو شعراء کی حیثیت سے ابن انشاء اور شہزاد ناصر نے غزل اور گیت کے درمیان خلیج کو پاٹنے اور غزل کو گیت کے قریب لانے کی کوشش کی۔

3.2- غزل میں نئے رجحانات

آزادی کے بعد کی غزل میں اہم رجحان، زبان، لہجہ اور شعری اوزان سب میں میر تقی میر کی تقلید ہے۔ ناصر کاظمی اور ابن انشاء جیسے شاعروں نے میر کے انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔ شاید اس کی ایک وجہ وہ نمایاں مشابہت تھی جو میر تقی میر کے زمانے اور ان کے زمانے میں تھی جو آزادی کے فوراً بعد کا زمانہ ہے۔

غزل نے ثابت کر دیا کہ اس میں داخلی اور خارجی ہر قسم کے جذبات و احساسات کو بڑی خوبصورتی سے بیان کرنے کی قدرت ہے۔ اس نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ مؤثر طور پر ہر دور کے تقاضوں پر پورا اتر سکتی ہے۔ بعض ترقی پسند نقادوں کا یہ خیال بجا معلوم نہیں ہوتا کہ غزل موجودہ صنعتی دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہل نہیں۔

غزل نے ان تمام شعری تجربات کو زندہ جاوید بنا دیا ہے جو اس دور کے شعراء نے اس صنف سخن میں کئے ہیں۔ یہ شاعری کی ایک نہایت نازک اور خوبصورت صنف ہے۔ اس میں اچھوتے خیالات کے ابلاغ کے لیے شاعر کا لطیف اور شائستہ احساسات کا حامل ہونا ضروری ہے جب غزل کے روائتی ڈھانچے کو برقرار رکھا جاتا ہے تو عمدہ غزلیں وجود میں آتی ہیں۔ غزل کے مضامین ہر دور میں تبدیل ہو سکتے ہیں لیکن اس کی شکل میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ قدیم اور جدید غزل گو شعراء کی غزلیں اس بات کی دلیل ہیں۔

کشور ناہید اور پروین شاکر نے غزل کو نسوانی حسن دیا۔ پروین شاکر سے پہلے اردو غزل ایک الہڑ لڑکی کے داخلی جذبات و تجربات سے نا آشنا تھی۔ پروین شاکر اس دور کی ایک مقبول اور ہونہار شاعرہ ہے۔ غزل کے علاوہ اس نے دیگر اصناف ادب میں بھی کئی خوبصورت چیزیں لکھی ہیں۔ جمیل الدین عالی کا شمار پاکستان کے ممتاز غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ہندی شاعری کی ایک صنف ''دوھا'' کو اردو میں رواج دیا۔ کئی شعراء نے دوھے لکھنے میں زور بیان صرف کیا۔ حال ہی میں پرتو روہیلہ نے اپنے دوھوں کا مجموعہ ''دین اجیارا'' کے نام سے شائع کیا ہے لیکن اردو میں غالباً عالی ابھی تک دوھے کے سب سے اچھے شاعر ہیں۔

3.3- نظم

غزل کی بے حد مقبولیت کے باوجود اردو نظم نے بھی مسلسل ترویج و ترقی کی منازل طے کیں۔ نظم کے جدید اصناف، آزاد شاعری اور غیر مقفیٰ شاعری اردو میں بہت پہلے سے متعارف ہو چکی تھیں لیکن نظم کی یہ اصناف گزشتہ تین دہائیوں (30 سال) کے دوران میں سن بلوغت کو پہنچیں۔ حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی اور احسان دانش کے علاوہ ن م راشد، فیض، مختار صدیقی، ضیاء جالندھری، فہمیدہ ریاض وغیرہ کے شعری مجموعے اسی دور سے متعلق ہیں۔ اردو شعراء کی نوجوان نسل ن م راشد اور میراجی کو 1940ء تک کے زمانے کے مقابلے میں بغیر کسی تعصب بلکہ بڑے شوق سے پڑھتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نظم گو شعراء کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ نہ صرف ان رجحانات و روایات کا خیال رکھتے ہیں جنہیں میراجی اور راشد نے قائم کیا تھا بلکہ اس میں وہ اپنی طرف سے بھی بہت اضافے کرتے رہے ہیں ان شعراء میں حامد عزیز مدنی، ساقی فاروقی، احمد ھمیش محبوب، خزان، مجید امجد، منیر نیازی، سلیم احمد، جیلانی کامران، محمد سلیم الرحمن، افتخار جالب، اطہر عباس، وزیر آغا، کشور ناہید، زاہد ڈار اور اعجاز فاروقی قابل ذکر ہیں۔ اس بات میں آراء کا اختلاف موجود ہے کہ انہوں نے کسی حد تک حقیقی معنوں میں شاعری کی ہے تاہم اردو کے عام

قارئین ابھی تک جدید اردو نظم میں کوئی زبردست اپیل محسوس نہیں کرتے یہاں تک کہ خود شعراء بھی دوسرے شاعروں کی تخلیقات کا ادراک نہیں کر پاتے۔ اردو نظم کی جدید ترین شکل نثری نظم ہے۔ اسے پڑھنے یا لکھنے کی بجائے اس کے بارے میں تبصرے زیادہ کئے جارہے ہیں۔ واقعی ان دنوں نظم پڑھنے کی بجائے نظم لکھنا زیادہ آسان معلوم ہوتا ہے۔

3.4- افسانہ اور ناول

(الف) افسانہ

افسانہ ایسی مختصر کہانی ہے جس میں کردار ایک ہو یا ایک سے زیادہ لیکن زندگی کا کوئی ایک پہلو بیان کیا جاتا ہے۔ نظم کے بعد اردو افسانے کی ترویج و ترقی قابل ذکر رہی ہے۔ آزادی کے بعد * سعادت حسن منٹو، غلام عباس، عزیز احمد، محمد حسن عسکری، قدرت اللہ شہاب، احمد ندیم قاسمی، ممتاز مفتی، ابوالفضل صدیقی، ممتاز شیریں جیسے ممتاز افسانہ نگاروں نے عمدہ افسانے لکھے جس سے نہ صرف انہوں نے اپنی شہرت برقرار رکھی بلکہ ان کی عظمت میں اور اضافہ ہو گیا۔ نئے لکھنے والوں میں انتظار حسین، اشفاق احمد، حاجرہ سرور، خدیجہ مستور، شوکت صدیقی، انور سجاد، جمیلہ ہاشمی، بیگم اختر جمال، رضیہ فصیح، مسعود مفتی، رشید امجد، صدیق حسین، بانو قدسیہ، احسن فاروقی وغیرہ نے اردو افسانے میں تکنیک اور مواد کے گرانقدر اضافے کئے۔ اردو افسانے میں معاشرتی حقیقت پسندی کی جگہ اب نفسیاتی اور سیاسی علامت نگاری رواج پا رہی ہے۔

طویل/مختصر فسانہ **

علامتی اور تجریدی *** افسانوں نے کچھ لکھنے والوں میں مقبولیت حاصل کی، اگرچہ عام قارئین نے ان میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ انتظار حسین، مسعود اشعر، رشید امجد، مظہر الاسلام، مرزا حامد بیگ، رخسانہ صولت علامتی و تجریدی افسانہ نگاری کے لیے جانے پہچانے ہیں۔ اردو میں طویل مختصر افسانہ لکھنے کی بھی بعض کامیاب کوششیں کی گئی ہیں۔ جمیلہ ہاشمی، ابوالفضل صدیقی، ڈاکٹر احسن فاروقی کے نام اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔

(ب) ناول

ناول کا خمیر افسانے ہی سے ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں طویل کہانی ہوتی ہے۔ واقعات پھیلے ہوئے ہوتے

---

* اردو افسانے کا آغاز بیسویں صدی کے شروع میں برصغیر کے ادیب پریم چند سے ہوا اور 1940ء کی دہائی میں ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ فروغ پاتا گیا۔

** طویل مختصر افسانہ بنیادی طور پر افسانہ ہی ہے۔ البتہ اس میں واقعات پھیل جاتے ہیں کہ طوالت کا عنصر شامل ہو جاتا ہے۔

*** تجرید کی اصطلاح ایسی تحریر یا کہانی کے لیے استعمال ہوتی ہے جس کا مفہوم غور و فکر کے بعد سمجھ میں آئے۔

ہیں۔کردار چندایک بھی ہوتے ہیں اور بہت سے بھی۔ پاکستان میں ناول کا سرمایہ زیادہ قابل فخر نہیں ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صنف کی طرف مناسب توجہ نہیں دی گئی۔بعض مشہور ناول آزادی کے بعد لکھے گئے ہیں۔ان میں عزیز احمد کا ''ایسی بلندی ایسی پستی''، ڈاکٹر احسن فاروقی کا ''شام اودھ'' اور خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' اردو ناول کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں ناول نگاروں کے کچھ اور ناول بھی اہم حیثیت کے حامل ہیں مثلاً ''آگ اور شبنم'' از عزیز احمد اور ''سنگم'' از ڈاکٹر احسن فاروقی قابل تعریف کوششیں ہیں۔اسی طرح ''خدا کی بستی'' از شوکت صدیقی ،''اداس نسلیں'' از عبداللہ حسن ،''علی پور کا ایلی'' از ممتاز مفتی، ''نگری نگری پھرا مسافر'' اور ''نے چراغ نے گلے'' از نثار عزیز بٹ اور ''کھلونا'' از مسعود مفتی اردو ناول نگاری میں یقیناً گرانقدر اضافے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اردو کے اہل قلم افسانہ نگاری میں زیادہ دلچسپی لیتے رہے ہیں لیکن اب وہ ناول نگاری کی طرف بھی متوجہ ہو گئے ہیں۔معاشرتی حقائق اور قومی مسائل بیان کرنے کے علاوہ اردو ناول نویسوں نے افراد کی زندگیوں کا نفسیاتی تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ 1947ء کے بعد قیام پاکستان اور تاریخ اسلام کے بعض مشاہیر کی زندگیوں اور کارناموں سے پاکستان کی نوجوان نسل کو آگاہ کیا گیا۔ایم اسلم اور نسیم حجازی کے اس سلسلے کے ناول خاصے مقبول رہے ہیں۔

3.5- ڈرامہ

ڈرامہ ایک ایسی کہانی ہے جس میں زندگی کو اصل روپ میں گزرتے دکھایا جاتا ہے۔اردو ادب کی غالباً سب سے کمزور صنف ڈرامہ ہے۔اسٹیج ڈرامے کے فقدان کے سبب اردو ڈرامہ صحیح معنوں میں ترقی نہیں کر سکا البتہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی بدولت اس کمی کا کسی حد تک ازالہ ہو گیا۔سٹیج ڈرامے کے سلسلے میں سید امتیاز علی تاج کے بعد سب سے بڑی کامیابی خواجہ معین الدین کو حاصل ہوئی جنہوں نے پاکستان کے ابتدائی دور میں کئی ڈرامے سٹیج کئے انہوں نے بڑی بصیرت کے ساتھ روزمرہ مسائل کو اپنے ڈراموں میں سمویا اور عوام سے خوب داد وصول کی۔ وہ بطور ڈرامہ نویس بے حد مقبول ہوئے۔ان کے دو ڈرامے مرزا غالب بندر روڈ پر اور تعلیم بالغاں اب شائع ہو چکے ہیں اور قارئین انہیں اسی دلچسپی سے پڑھتے ہیں جس طرح کئی سال پہلے انہوں نے انہیں اسٹیج اور ٹی وی پر دیکھا تھا ان کے ڈراموں میں طنز و مزاح کی تازگی قابل تعریف ہے۔

سعادت حسن منٹو بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار ہیں لیکن انہوں نے بعض اچھے ڈرامے بھی تخلیق کئے مثلاً ''اس منجدھار میں'' ان کا ایک قابل ذکر ڈرامہ ہے۔جس میں نفسیاتی کیفیت کی عکاسی کی گئی ہے۔مرزا ادیب نے اس صنف کی طرف سب سے زیادہ توجہ دی۔ان کے تین ایکٹ کے ڈراموں کی ایک کتاب اور ایک ایکٹ کے ڈراموں کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

ناصر شمسی اگرچہ معروف ڈرامہ نگار نہیں لیکن انہوں نے بعض عمدہ ڈرامے تحریر کئے ہیں۔ان تمام کوششوں کے باوجود بھی اردو ڈرامے کا مقابلہ اردو افسانے حتیٰ کہ اردو ناول کے ساتھ بھی صحیح طور پر نہیں کیا جا سکتا۔ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے ڈرامے لکھنے

والوں میں سلیم احمد، اشفاق احمد، حسینہ معین، الطاف فاطمہ، انتظار حسین اور امجد اسلام امجد کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

3.6- سوانح اور سرگزشت

اردو ادب میں سوانح اور خودنوشت سوانح کی کوئی بڑی میراث نہیں ملتی۔ پھر بھی پاکستان میں چند اچھی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں جن میں شیخ محمد اکرام کی غالب اور شبلی کی سوانح عمریاں غالب نامہ اور شبلی نامہ قابل ذکر ہے۔ غالب اور شبلی کی یہ سوانح عمریاں بڑی تحقیق و محنت سے لکھی گئی ہیں۔ یہ ان کے مستند حالات پر مشتمل ہیں اور ان کی شخصیتوں کی نفسیاتی نشوونما پر روشنی ڈالتی ہیں۔

سوانح نگاری کا فن زندگی کے تمام پہلوؤں کی بیان اور شخصیت کے کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کا متقاضی ہے۔ پہلی خوبی کی ہماری ثقافتی روایات میں کوئی کمی نہیں البتہ دوسری خوبی کا ہمارے سوانح ادب میں حال ہی میں اضافہ ہوا ہے۔ دو قابل ذکر سوانح عمریاں ''یادوں کی بارات'' اور ''جہان دانش'' کے نام سے شائع ہوئی ہیں۔ پہلی جوش (ملیح آبادی) کی اور دوسری احسان دانش کی تصنیف ہے۔ جوش نہایت بے رحمی کے ساتھ اپنی ذات سے پردہ اٹھاتا ہے اور اپنی زندگی کے تاریک ترین گوشے بھی پڑھنے والے کو دکھا دیتا ہے جہان دانش بہت دلچسپ کتاب ہے۔ اگرچہ یہ ذات کا سنجیدہ انداز میں انکشاف ہے لیکن نہایت خوبصورت اسلوب میں۔ سرگزشت کی کچھ اور کتابیں بھی قابل ذکر ہیں جو دلچسپ ضرور ہیں لیکن انکشاف ذات کا حق ادا نہیں کرتیں۔

سرگشت از محمد سعید

سرگزشت از مشتاق احمد یوسفی

انہیں خودنوشت سوانح کی بجائے یادداشتیں کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔

3.7- قلمی تصویریں اور خاکے

قلمی تصویریں: اس صنف ادب* کا تعلق لفظوں میں شخصیت کشی سے ہے۔ موجودہ دور میں قلمی تصویروں میں ڈاکٹر عبدالحق کا مجموعہ ''چند ہم عصر'' سعادت حسن منٹو، کی تصنیف ''گنجے فرشتے'' لاؤڈ سپیکر اور فلم ستاروں کے مختلف خاکے، ادب میں قلمی تصویروں کی عمدہ مثالیں ہیں۔ شاہد احمد دہلوی کا شمار اس صنف کے خاص ماہرین میں ہوتا ہے۔ ان کے سولہ مضامین کا مجموعہ ''طاق نسیاں'' ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ محمد طفیل نے ادبی شخصیتوں کو ''آپ جناب مکرم'' میں بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔

قلمی خاکے: قلمی تصویروں سے ملتی جلتی ایک اور ادبی صنف قلمی خاکوں کی ہے جو قلمی تصویروں کی طرح کسی شخصیت کی

---

* برصغیر کے اردو ادب میں کچھ ابتدائی نمونے: نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی از مرزا فرحت اللہ بیگ، گنج ہائے گراں مایہ، ہم نفسان رفتہ، ذاکر صاحب از رشید احمد صدیقی۔

مکمل تصویر کی بجائے تصویر کا محض ایک رخ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اردو میں اس صنف خاص کی دو غیر معمولی مثالیں شیش محل از شوکت تھانوی اور دندشنید از رئیس احمد جعفری ہیں۔

3.8- رپوتاژ اور انشائیہ

رپورتاژ اور انشائیہ اردو ادب کی نسبتاً نئی اصناف ہیں۔ آزادی * کے ساتھ ہی فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا، ان واقعات پر مشتمل کئی تحریریں قابل ذکر ہیں۔ اس ضمن میں دو رپوتاژ ''کشمیر اداس ہے'' از محمود ہاشمی اور ''دلّی کی بپتا'' از شاہد احمد دہلوی نہایت عمدہ تصور کئے جاتے ہیں۔

انشائیہ ہمارے ادب میں نسبتاً ایک نئی اصطلاح ہے جو ہلکے پھلکے، شگفتہ اور مختصر مضمون کے لیے استعمال ہوتی ہے اس کی خاص مثال پطرس بخاری کے مضامین ہیں۔ اِنشائیہ بطور ایک صنف ادب اپنی حیثیت منوا رہا ہے۔ چراغ حسن حسرت، فلک پیما اور شوکت تھانوی وغیرہ کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا، مشتاق احمد یوسفی، نظیر صدیقی اور مشکور حسین شاد نے اردو انشائیہ نگاری کی طرف خاص توجہ صرف کی ہے۔ چنانچہ ان کی کتابیں بالترتیب ''خیال پرائے''، ''چراغ تلے''، ''شہرت کی خاطر'' اور ''آئینہ دشمنام میں'' ہلکے اور شگفتہ مضامین کے قابل قدر مجموعے ہیں۔

3.9- سنجیدہ مضامین

تنقیدی مضامین سے قطع نظر سنجیدہ مضامین لکھنے والوں میں سب سے نمایاں نام مختار مسعود کا ہے ان کی کتاب ''آواز دوست'' صرف دو مضامین پر مشتمل ہے پہلے مضمون کا تعلق تحریک پاکستان کے پس منظر سے ہے جس کا نقطہ عروج وہ تاریخی قرارداد پاکستان ہے جو لاہور میں مینار پاکستان کا باعث بنی۔ دوسرے مضمون کا تعلق اس وقت سے ہے جب انیسویں صدی کے آخر میں برصغیر جنوبی ایشیا میں مسلم تہذیب و ادب کی نشاۃ ثانیہ ہوئی جو بیسویں صدی کے وسط میں حصول پاکستان کا باعث بنی۔ یہ دو مضامین اپنے فن کارانہ حسن اور عمدہ انداز بیان کی بدولت اردو ادب میں زندہ جاوید رہیں گے۔

3.10- سفرنامہ

سفرنامے کا شمار اصناف نثر میں ہوتا ہے۔ عہد ماضی کی نسبت دور حاضر میں سفرنامے کا زندہ رواج ہو رہا ہے۔ سرسید احمد خان کا سفرنامہ ''مسافران لندن'' علامہ شبلی کا ''سفرنامہ روم اور مصر و شام'' محمد حسین آزاد کا ''سیر ایران'' اور مولانا جعفر تھانیسری کا ''کالا پانی'' اردو ادب کے مشہور سفرنامے ہیں۔ موجودہ دور کے سفرناموں میں مندرجہ ذیل خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

---

* 1947ء سے پہلے اردو میں پہلا رپورتاژ ''پوے'' کے عنوان سے کرشن چندر نے لکھا تھا۔

نظر نامہ از محمود نظامی۔

سات سمندر پار از بیگم اختر ریاض الدین۔

دہنگ پر قدم از بیگم اختر ریاض الدین۔

چلتے ہو تو چین کو چلئے از ابن انشاء

جہاں گرد از ابن انشاء

دنیا گول ہے از ابن انشاء

لبیک از ممتاز مفتی

نکلے تیری تلاش میں از مستنصر حسین تارڑ

3.11- اردو تنقید

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اردو تنقید نے پاکستان میں بہت ترقی کی ہے۔ یہاں تنقید نگاری میں گہرائی اور بلندی کے اوصاف پیدا ہوئے۔ محمد حسن عسکری اردو کے ایک ذہین ناقد تھے۔ ان کی تنقیدی تحریروں کی بدولت اردو تنقید کو بلند مقام حاصل ہوا ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر احسن فاروقی، ڈاکٹر سید عبداللہ، ممتاز شیریں، عزیز احمد، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی، سلیم احمد، انتظار حسین، جیلانی کامران، ڈاکٹر وزیر آغا، مظفر علی سید، فتح محمد ملک نے بھی اردو تنقید میں بڑے قابل قدر اور خیال افروز اضافے کئے ہیں۔

گزشتہ تیس سال کے دوران میں داستانی ادب کی اہمیت کا احساس، اردو کلاسیکی نظم و نثر میں انقلاب، بے شمار تصورات کی وضاحت اور بہت سے ادبی اعتقادات کی بنیادی خرابیوں کا ادراک، اردو تنقید کے چند کارنامے ہیں۔ ان کے اثرات سے ادبی نظریات و اقدار میں بنیادی تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں۔ بہت سے خیالات اور تصورات جو سرسید احمد خان تحریک اور ترقی پسند تحریک سے وراثت میں ملے تھے، اگر انہیں رد نہیں کیا گیا تو ان پر شک ضرور کیا گیا۔ ادب اور زندگی، ادب اور اخلاق، ادب اور انقلاب کے رشتوں کا مذکورہ تحریکوں کے مقابلے میں وسیع اور عمیق معنی دیئے گئے۔ اب اردو تنقید کے معنی محض شعری تنقید نہیں بلکہ اس میں نثر کا بھی تشریحی اور نفسیاتی جائزہ لیا جاتا ہے۔ تنقید کی تنقید میں بھی نمایاں ترقی ہوئی۔ اردو تنقید اب اس مقام سے بہت آگے ہے جہاں سرسید تحریک اور ترقی پسند تحریک نے اسے چھوڑا تھا۔ تاہم اردو کی موجود ادبی صورتحال اردو تنقید کی مزید ترقی کی طرف مسائل معلوم نہیں ہوتی۔ اردو تنقید جسے محمد حسن عسکری نے اپنی ذاتی کاوشوں سے جھنجوڑا تھا، اب ابھرتے ہوئے مصنفوں کی گروہ بندیوں کی ''من ترا حاجی بگویم تو مرا ملا بگو'' کی دلدل میں دھنستی جا رہی ہے۔

3.12- پاکستانی کلاسیکی ادب کے تراجم

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے وقت سے اردو کے مصنفین اور قارئین کا پاکستان کی دیگر زبانوں کے کلاسیکی ادب کی طرف رجحان رہا ہے۔ یہی ذوق وشوق پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی زبانوں کے کلاسیکی ادب کو اردو میں منتقل کرنے کا موجب بنا۔ کلاسیکی شاعری کا بیشتر حصہ مختلف لوگوں کی اجتماعی کوششوں کے نتیجے میں اردو زبان میں منتقل ہو کر ادب کا حصہ بنا۔

3.13- اختتام

اگرچہ اردو ادب پاکستان میں ادبی جمود کے مختلف ادوار سے گزرا ہے تاہم اس نے مختلف اصناف ادب میں قابل ذکر ترقی کی ہے۔ یہ زیادہ تر ان سیاسی اتار چڑھاؤ، معاشرتی تبدیلیوں اور وجدانی تجربات کا آئینہ دار ہے جن سے پاکستانی معاشرہ مختلف وقتوں میں دوچار رہا ہے۔ اردو ادب نے ترقی کے بہت سے مراحل طے کئے ہیں۔ تاہم مستقبل میں اسے ترویج و ترقی کی مزید منازل طے کرنا ہیں۔

3.14- خود آزمائی نمبر 3

سوال نمبر 3 اردو ادب میں غزل کی اہمیت واضح کیجئے۔ اس دور کے نامور شعراء پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر 4 ذیل کی تعریف کیجئے۔

(i) افسانہ (ii) ناول (iii) ڈرامہ (iv) سرگزشت (v) انشائیہ

سوال نمبر 5 اردو کے تنقیدی ادب پر نوٹ تحریر کیجئے۔

مشغلہ: اصناف ادب کی فہرست بنائیے اور ہر ایک کی ایک جملے میں وضاحت کیجئے۔

5- تشریحات

-1	ادبی جمود	ایسی کیفیت جب اعلیٰ اور مؤثر قسم کا ادب پیدا نہیں ہوتا۔
-2	ادراک	شعور، کسی چیز کا علم۔
-3	ارباب ذوق	ادیبوں کی انجمن جس میں لکھنے والے اپنی تحریریں پیش کرتے ہیں۔
-4	افسانہ	ایسی مختصر کہانی جس میں زندگی کا کوئی پہلو بیان کیا گیا ہو۔
-5	انشائیہ	کسی ایک موضوع پر شگفتہ انداز میں لکھا گیا ہلکا پھلکا مضمون۔
-6	تجرید	ایسا فن یا تحریر جس کے معنی پنہاں ہوں سوچ بچار کے بعد سمجھ میں آئیں۔
-7	تخلیقی محرکات	ایسے محرکات جو کسی ادبی تخلیق کا باعث بنیں۔
-8	ترقی پسند مصنفین	ایسے مصنفوں کی جماعت جو نئے خیالات اور رجحانات کو فروغ دیتے ہیں۔
-9	حافظ	خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی (ایران کا مشہور شاعر)۔
-10	ڈرامہ	ایسی کہانی جس میں زندگی کو ہوتے گزرتے دکھایا گیا ہو۔
-11	رپورتاژ	کسی واقعہ، تقریب یا سفر کی آسان زبان میں روداد۔
-12	سعدی	شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی (ایران کے مشہور شاعر)
-13	سوانح	زندگی حالات
-14	غالب	مرزا اسد اللہ خان غالب (برصغیر کے مشہور شاعر)
-15	غیر مقفیٰ	جس میں کافیہ کی پابندی نہ ہو۔
-16	قلمی تصویر/ خاکہ	کسی شخص کی لفظوں میں تصویر کشی

یونٹ.....9

بیرونی تعلقات

پاکستان تحفظ کا خواہاں

(1947ء تا 1971ء)

پاکستان کے ہمسائے۔افغانستان۔ایران۔ بھارت

تحریر:

پرویز اقبال چیمہ

فہرست مضامین

یونٹ کا تعارف		268
یونٹ کے مقاصد		268
-1	ملکی تحفظ کے لیے پاکستان کی کوششیں	269
-1.1	تمہید	269
-1.2	مسائل	269
-1.3	افغانستان اور بھارت	2269
-1.4	دفاع یا ترقی	270
-1.5	خودآزمائی نمبر 1	270
-2	پاکستان اور امریکہ	271
-2.1	ابتدائی دور	271
-2.2	سینٹو اور سیٹو کے معاہدے	272
-2.3	معاہدوں کے منفی اثرات	272
-2.4	امریکی پالیسی میں تبدیلی	272
-2.5	1965ء کی جنگ اور امریکہ	273
-2.6	1970ء کے بعد	273
-2.7	خودآزمائی نمبر 2	274
-3	پاکستان اور سوویت یونین	275
-3.1	تمہید	275
-3.2	تلخیوں کی ابتدا	275
-3.3	خیر سگالی	276

-3.4	تعلقات میں کشیدگی	276
-3.5	مواقفت	276
-3.6	معاہدہ تاشقند	277
-3.7	اسلحہ کی فراہمی	277
-3.8	دوبارہ کشیدگی	277
-3.9	کشیدگی میں کمی	278
-3.10	خودآزمائی نمبر 3	278
-4	پاکستان اور چین	279
-4.1	تمہید	279
-4.2	تعلقات کی استواری	279
-4.3	1965ء کی جنگ اور چین	280
-4.4	1971ء کے بعد	280
-4.5	خودآزمائی نمبر 4	281
-5	حاصل بحث	282
-6	تشریحات	283

یونٹ کا تعارف

اس یونٹ میں آپ کو پاکستان کے بیرونی تعلقات کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ بیرونی لحاظ سے پاکستان عدم تحفظ سے دو چار رہا ہے ہمارے ملک کو نہ صرف برطانوی ہند کی بیرونی سرحدیں ورثے میں ملیں بلکہ اندرونی طور پر بھارت کے ساتھ طویل سرحدوں نے عجیب وغریب مسائل بھی پیدا کیے۔ اس یونٹ میں ان وجوہات پر بحث کی گئی ہے جو پاکستان کے عدم تحفظ کا موجب ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ان کوششوں کی وضاحت بھی کی گئی ہے جو ملک کو بیرونی خطرات سے بچانے کے لیے کی گئی ہیں۔ یونٹ میں آپ خاص طور پر ان اقدامات کے بارے میں پڑھیں گے جو پاکستان نے بڑی طاقتوں کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے لیے کیے۔

یونٹ کے مقاصد

یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد طلباء اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1- عدم تحفظ کے عوامل کی وضاحت کر سکیں۔

2- ہمسایوں سے تعلقات کا تاریخ کی روشنی میں جائزہ لے سکیں۔

3- بڑی طاقتوں کے رویے کا تجزیہ کر سکیں۔

1- ملکی تحفظ کے لیے پاکستان کی کوششیں

1.1- تمہید

دنیا کی تمام اقوام آزادی اور امن سے رہنا چاہتی ہیں۔کوئی ملک بھی عدم تحفظ کا شکار نہیں ہونا چاہتا۔عدم تحفظ اور غلامی ترقی کو روک دیتے ہیں۔تحفظ اور امن کا مقصد نہ صرف بیرونی سرحدوں کی حفاظت ہے بلکہ ملکی معیشت کو خوشحال بنانا اور بیرونی شورشوں کا خاتمہ ہے۔خوشحالی اور ترقی اندرونی سازشوں پر بھی قابو پانے میں مدد دیتی ہے۔

1.2- مسائل

پاکستان معرض وجود میں آتے ہیں کئی مسائل میں گھر گیا۔اس کے حصے میں برطانوی ہند کی سرحدوں کے مسائل آئے۔ مزید برآں ہندوستان کے ساتھ طویل سرحدوں نے گونا گوں مسائل پیدا کیے۔دوسرے لفظوں میں پاکستان کو چین، افغانستان، ایران، برما اور ہندوستان سے ملنے والی سرحدوں کے دفاع کے مسئلے سے دو چار ہونا پڑا۔چونکہ افغانستان اور ہندوستان کے ساتھ تعلقات شروع سے اچھے نہیں تھے اس لیے یہ ممالک شروع ہی سے پاکستان کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔سب سے بڑی بات پاکستان کے دونوں حصوں (مشرقی ومغربی پاکستان) میں طویل جغرافیائی دوری تھی جس نے ان مسائل کو مزید گھمبیر بنا دیا۔

شروع سے معاشی طور پر پاکستان کمزور تھا۔ بھارت نے پاکستانی حصے کی رقم پر قبضہ کر لیا۔پاکستان کا خزانہ خالی تھا۔ ساتھ ہی ساتھ لاکھوں مہاجرین کی آمد سے معیشت کا توازن بگڑ گیا۔ملک میں نہ کوئی صنعت تھی نہ قابل انتظامیہ۔دفاعی افواج نہ ہونے کے برابر تھیں اور پھر خوراک کے مسائل ملک کی الجھنوں میں اضافہ کر رہے تھے۔

1.3- افغانستان اور بھارت

دفاعی اور معاشی مشکلات کے ساتھ ساتھ پاکستان کو افغانستان اور بھارت کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ بھارت نے کبھی بھی نظریہ پاکستان کو تسلیم نہ کیا اور شروع سے بھارتی حکومت اور رہنماؤں کی کوشش یہ رہی ہے کہ ہر حربہ استعمال کر کے اسے ختم کر دیا جائے۔ افغانستان نے پاکستان کے شمال مغربی سرحدی صوبے میں گڑ بڑ پھیلانے کی بڑی کوشش کی تا کہ اس صوبے کو اپنے ملک میں شامل کیا جا سکے۔ جب افغانستان نے یہ محسوس کیا کہ ایسا کرنا ناممکن ہے تو اس نے آزاد پختونستان کا ڈھونگ کھڑا کر دیا۔

1.4- دفاع یا ترقی

اوپر بیان کیے گئے دفاعی، معاشی اور اندرونی اور بیرونی مسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے پاکستان کے لیے لازم تھا کہ وہ اپنی سلامتی کے تحفظ کے لیے اقدامات کرے۔ لیکن آزادی کے وقت پاکستان کے وسائل بہت کم تھے۔ اگر پاکستان دفاع کی طرف توجہ دیتا تو اندرونی ترقی رک جاتی اور اگر دفاع کو نظر انداز کر کے اندرونی ترقی پر توجہ ہوتی تو خود ملک کے وجود کو خطرہ لاحق تھا غرضیکہ عجیب صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔

پاکستان کے بڑی طاقتوں کے ساتھ تعلقات زیادہ تر اس وجہ سے تھے کہ اپنے آپ کو بیرونی خطرات سے محفوظ کرے۔ امریکہ، چین اور روس کے ساتھ تعلقات کا جائزہ اس حقیقت کا برملا اظہار ہے کہ اپنی سلامتی کے لیے کس حد تک تگ و دو کرتا رہا ہے۔

1.5- خود آزمائی نمبر 1

سوال نمبر 1 پاکستان کے تحفظ کو متاثر کرنے والے عوامل پر بحث کریں۔

2- پاکستان اور امریکہ

2.1- ابتدائی دور

قیام پاکستان کے وقت سے امریکہ بھارت سے نسبتاً بہتر تعلقات کا خواہاں رہا ہے جس کی ایک بڑی وجہ بھارت کی وسعت، آبادی اور وسائل تھی۔ ماضی میں پاکستان اور امریکہ کے تعلقات مضبوط اور دوستانہ رہے ہیں۔ 1950ء تا 1960ء دونوں ملکوں کے تعلقات نہایت دوستانہ تھے۔ لیکن اس کے بعد دونوں ملکوں کے تعلقات مختلف مراحل سے گزرتے رہے۔

ابتدا میں امریکہ نے برصغیر کے ملکوں کی طرف غیر جانبدار پالیسی اپنائی۔ امریکی عوام اور حکومت گاندھی اور نہرو کے آزادی حاصل کرنے کے کردار سے زیادہ متاثر تھے۔ اور قائداعظم کے پاکستان حاصل کرنے کو شک و شبہے کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ لیکن سرد جنگ کی وجہ سے بین الاقوامی کشیدگی بڑھی اور ساتھ ساتھ نہرو کی غیر جانبداری کی پالیسی نے امریکہ کو مجبور کیا کہ وہ برصغیر میں اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرے۔

مئی 1950ء میں پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان نے امریکہ کا دورہ کیا۔ لیاقت علی خان کے دورے نے امریکی عوام کے ان شبہات کو دور کرنے میں بڑی مدد دی جو وہ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست سمجھ کر اپنے ذہنوں میں لیے ہوئے تھے۔ لیاقت علی خان نے اپنی تقریروں میں کمیونزم کو اسلام کے منافی نظام قرار دیا اور ساتھ ساتھ انہوں نے ان امریکی کوششوں کو سراہا جو وہ اس نظام کو ختم کرنے میں کر رہا تھا۔ اس سے امریکہ نے پاکستان کو اپنی توجہ کا مرکز بنانا شروع کر دیا۔

جون 1950ء میں شمالی کوریا کی فوجیں جنوبی کوریا میں داخل ہوگئیں۔ پاکستان نے اس حملہ کو جارحیت قرار دیا اور اس کی پرزور مذمت کی جبکہ بھارت نے خاموشی اختیار کر لی۔ مزید برآں بھارت نے مشرق بعید میں امریکی پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس کے باوجود امریکی حکومت بھارت کو زیادہ پسند کرتی تھی۔ اس وجہ سے بھارت کی اہمیت کم ہونے لگی۔ 1951ء میں جب جاپان نے معاہدہ امن پر دستخط کیے تو پاکستان نے اس قوم کی حوصلہ افزائی کی جبکہ بھارت نے تنقید کی۔ 1953ء میں آئزن ھادر امریکہ کے صدر بن گئے۔ نئی ریپبلکن حکومت نے پاکستان کی زیادہ مدد کرنی شروع کر دی۔ مئی 1953ء میں امریکہ کے وزیر خارجہ جان ڈکسن پاکستان کے دورہ پر آئے تو انہوں نے امریکہ اور پاکستان کے مضبوط تعلقات کی اہمیت پر زور دیا۔

پاکستان کے سابق صدر ایوب خان شروع سے امریکہ کے ساتھ دفاعی معاہدہ چاہتے تھے بقول ان کے جب 1951ء میں بھارت نے پاکستانی سرحدوں پر فوجیں جمع کیں تو دفاعی معاہدے کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی۔ بھارت کا جارحانہ رویہ، جغرافیائی حیثیت اور پاکستان کے دونوں حصوں کی باہمی دوری نے ایوب خان کی سوچ کو مزید پختہ کر دیا۔ اس قسم کی سوچ اس وقت کے

پاکستانی وزیراعظم محمد علی بوگرہ کے ذہن میں بھی تھی اگرچہ معاشی امداد کے وہ زیادہ خواہاں تھے۔ آزادی کے بعد پاکستان کو ہر قسم کی امداد کی ضرورت تھی چاہے وہ کہیں سے بھی آتی۔ امریکہ کے پاکستانی معیشت کو سنوارنے کے اقدامات حوصلہ افراء تھے۔ کیوں کہ ان میں پاکستانی دفاعی ضروریات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا۔ اس بات نے پاکستان کے رہنماؤں کو امریکہ سے مزید تعلقات بنانے پر مجبور کیا۔

2.2- سینٹو اور سیٹو کے معاہدے

1954ء میں پاکستان اور امریکہ نے باہمی دفاعی امداد کا معاہدہ کیا جس کی رو سے امریکہ نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ وہ پاکستانی افواج کو اسلحہ مہیا کرے گا اور تربیت دے گا۔ اس سال پاکستان منیلا کے دفاعی معاہدہ (سیٹو) میں شامل ہوا۔ اگلے سال بغداد کا معاہدہ ہوا جو بعد میں سینٹو کے نام سے مشہور ہوا۔ اگرچہ پاکستان نے بڑی خوشی سے اس معاہدے میں شمولیت اختیار کی لیکن مسلم اقوام کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے کی کوششیں بھی جاری رہیں۔ چنانچہ اب پاکستان امریکہ کے ساتھ تین دفاعی معاہدوں میں شامل ہوگیا۔ پاکستان اور امریکہ دونوں ان معاہدوں کی وجہ سے محسوس کرنے لگے کہ ان کے اپنے قومی مفاد بہتر طریقے سے پورے ہو رہے ہیں۔ پاکستان کو ہمیشہ بھارت سے خطرہ رہا اور وہ اپنے طور پر دفاع کرنے سے قاصر تھا اور عدم تحفظ پاکستانی ترقی پر بہت زیادہ اثر انداز ہو رہا تھا۔ اس لیے امریکی امداد نے پاکستان کو بروقت سہارا دیا۔ 1950ء کے مرحلے میں امریکی سوویت یونین سے خوفزدہ تھے اور کمیونزم کو پھیلنے سے روک رہے تھے۔ امریکہ کو پاکستان ایک ایسا ملک ملا جو کہ اس کے ساتھ ان کوششوں میں شریک تھا۔

2.3- معاہدوں کے منفی اثرات

1962ء تک پاکستان ے امریکہ کے ساتھ تعلقات نہایت دوستانہ تھے۔ لیکن یہ حقیقت بھی ضرور مدنظر رکھنی چاہیے کہ پاکستان کو ان تعلقات کی امریکہ سے شاید زیادہ قیمت ادا کرنا پڑی۔

معاہدوں میں شمولیت کی وجہ سے سوویت یونین نے پاکستان کے خلاف دشمنی شروع کر دی۔ پاکستان، عربوں اور افریقی و ایشیائی قوموں میں غیر مقبول ہوگیا۔ مزید برآں کشمیر کا مسئلہ ان معاہدوں میں شمولیت سے مزید بگڑ گیا۔ بھارت نے رائے شماری کا وعدہ پورا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور امریکیوں نے کبھی بھی سنجیدگی سے بھارت کو ایسا نہ کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ بھارت کو امریکی معاشی امداد پاکستان سے کہیں زیادہ ملتی رہی۔

2.4- امریکی پالیسی میں تبدیلی

1960 کی دھائی کے شروع میں امریکی پالیسی برائے جنوبی ایشیاء میں تبدیلی آنے لگی۔ پاکستان امریکہ سے بدظن

ہونے لگا۔تبدیل کی سب سے بڑی وجہ ڈیموکریٹک صدر کینڈی کا برسر اقتدار آنا تھا۔کینڈی کا غیر جانبدار تحریک کی طرف نظریہ مختلف تھا۔امریکہ نے اس تحریک کو بنیادی طور پر تسلیم کرلیا۔جس وجہ سے خود بخود امریکی پالیسی بھارت کی جانب بڑی تیزی سے تبدیل ہونے لگی۔1962ء میں ہندوچین جنگ کی وجہ سے بھارت نے مغرب سے فوجی امداد کی اپیل کی۔امریکہ کی قیادت میں مغربی دنیا نے پاکستان کے اس احتجاج کے باوجود کہ ''یہ فوجی ساز وسامان ایک روز پاکستان کے خلاف استعمال ہوگا''* بھارت کو بڑی مقدار میں اسلحہ دینا شروع کر دیا۔پاکستان کے خدشات 1965ء میں درست ثابت ہوئے۔بھارت نے مغربی دنیا سے چین سے خطرہ کے نام پر حاصل کیا ہوا اسلحہ پاکستان کے خلاف استعمال کیا۔

2.5- 1965 کی جنگ اور امریکہ

1965ء کی جنگ کے بعد پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں کشیدگی بڑھنے لگی۔اس کی بنیادی وجہ امریکہ کی 1965ء میں پاک بھارت پالیسی ہے۔امریکہ نے تو پاکستان کی فوجی امداد بند کر دی لیکن بھارت متواتر سوویت یونین سے اسلحہ حاصل کرتا رہا۔امریکہ نے اس بات کو بھی مدنظر نہ رکھا کہ پاکستان کا فوجی اسلحہ حاصل کرنے کا ذریعہ صرف امریکہ ہے جبکہ بھارت دو بڑی طاقتوں امریکہ اور سوویت یونین دونوں سے اسلحہ حاصل کرتا رہا ہے۔امریکہ کی اسلحہ کی پالیسی نے پاکستان کے مفاد کو بہت زیادہ نقصان دیا۔جب 1965ء میں امریکہ نے برصغیر کے لیے اسلحہ کی نئی پالیسی کا اعلان کیا۔جس کا بنیادی مقصد اسلحہ کی دوڑ کو روکنا تھا۔اس سے پھر پاکستان کو ہی نقصان اٹھانا پڑا۔پاکستان کو تو کچھ نہ ملا مگر بھارت مغرب اور سوویت یونین سے اسلحہ سمیٹتا رہا۔نئی پالیس اپنے مقاصد حاصل کرنے میں بری طرح ناکام رہی۔

پاکستان کو اپنی پالیسی پر نظر ثانی کا خیال اسے دوطرفہ دوستی کی پالیسی کی طرف لے گیا۔اس پالیسی کی مدد سے تمام بڑی طاقتوں سے اچھے تعلقات قائم کیے۔اس وجہ سے پاکستان سیٹو اور سینٹو سے آہستہ آہستہ دور ہوتا چلا گیا اور آخر کار ان کو خیر باد کہہ گیا۔

2.6- 1970ء کے بعد

1970ء سے پاکستان کے امریکہ کے ساتھ ایسے دوستانہ تعلقات نہیں جیسے 1950ء یا 1960ء کے شروع میں تھے۔اگرچہ 1971ء کی جنگ میں نے معمولی دباؤ بھارت پر ڈالا مگر وہ بھی بے اثر اور بغیر کسی نتیجہ کے رہا۔

1971ء میں ذولفقار علی بھٹو پاکستان کے صدر بنے۔بھٹو کے دور حکومت میں دوطرفہ پالیسی پر عمل کیا گیا۔بھٹو نے جب ایٹمی پلانٹ کی فرانس سے بات چیت چلائی تو امریکہ کے ساتھ پاکستان کے تعلقات خاصے بگڑتے چلے گئے۔امریکہ نے فرانس پر

---

* جی۔ڈبلیو۔چوہدری، انڈیا، پاکستان، بنگلہ دیش اور بڑی طاقتیں۔

سفارتی دباؤ ڈالا کہ پاکستان کے ساتھ وہ معاہدہ توڑ ڈالے۔ بھٹو کی ان کوششوں نے جو کہ وہ تیسری دنیا کو اکٹھا کرنے میں کر رہے تھے جلتی پر تیل کا کام کیا اور امریکہ نے کھلی دشمنی کی پالیسی اختیار کر لی۔ جنرل ضیاء الحق کے برسر اقتدار آنے سے دوبارہ تعلقات بہتر ہونے لگے۔ اگرچہ خصوصی تعلقات والا دور تو نہیں لیکن پھر بھی تعلقات قدرے بہتر رہے ہیں۔

2.7- خود آزمائی نمبر 2

سوال نمبر 1 پاکستان اور متحدہ امریکہ کے تعلقات میں تبدیلیوں کا تجزیہ کیجیے۔

(جواب کا جائزہ حصہ 2 کی روشنی میں لیجیے۔)

سوال نمبر 2 دفاعی معاہدوں کے مثبت اور منفی اثرات کا جائزہ لیجیے۔

(جواب کا موازنہ 2.5 کے علاوہ حصہ 2 میں دی گئی بحث سے کیجیے۔)

3- پاکستان اور ایشیاء

3.1- تمہید

سوویت یونین کی پالیسی برصغیر جنوبی ایشیا میں بدلتی رہی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب سوویت یونین بھارت اور پاکستان دونوں کو سامراج کا پٹھو تصور کرتا تھا۔ جب کانگریس اور مسلم لیگ انگریزوں سے آزادی پانے میں مصروف تھیں، روس نے دونوں کو ہدف تنقید بنایا۔ برطانیہ کی تقسیم ہند کی تجویز کو روس نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی قرار دیا۔ روس خاص طور پر مسلم لیگ اور پاکستان کو سامراج کا پٹھو قرار دیا کرتا تھا۔ وہ پاکستان کو ایک مذہبی ریاست ہرگز تسلیم نہ کرتا تھا۔ شاید سوویت یونین کو یہ خطرہ ہو کہ اسلامی ریاست کا قیام اس کی مسلم ریاستوں میں علیحدگی کی تحریکوں کو ہوا دے گا۔ بال آخر دونوں ملکوں کے تعلقات بڑی سرد مہری سے شروع ہوئے۔

3.2- تلخیوں کی ابتداء

آزادی کے شروع میں معاشی مسائل اور عدم تحفظ نے پاکستان کو مجبور کیا کہ وہ جہاں سے بھی امداد آئے قبول کرے۔ لیکن سوویت یونین نے پاکستان کی ضرورت کو کبھی محسوس نہ کیا۔ اگرچہ سفارتی تعلقات 1948ء میں قائم ہو گئے تھے مگر 1949ء تک سفیروں کا تبادلہ نہ ہو سکا۔

1949ء میں حکومت سوویت یونین نے لیاقت علی خان کو دورے کی دعوت دی۔ اگرچہ یہ دعوت قبول کر لی گئی۔ لیکن پاکستان کے وزیر اعظم نے دورہ نہ کیا۔ اس کے بجائے وہ امریکہ کے دورے پر چلے گئے۔ جہاں سے یہ دعوت نامہ سوویت یونین کے دعوت نامہ کے بعد ملا تھا۔ سوویت یونین کے ذرائع ابلاغ نے اس بات کو خاص طور پر اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔

پاکستان کے سوویت یونین کے ساتھ تعلقات اس وقت مزید بگڑ گئے جب پاکستان نے مغربی دفاعی معاہدوں میں شمولیت اختیار کر لی۔ اگرچہ شروع میں سوویت یونین کا رویہ اتنا سخت نہیں تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ ایک نیا آزاد ملک کبھی بھی سامراج کے ہتھے نہیں چڑھے گا۔ پاکستان نے سوویت یونین کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ پاکستان ان معاہدوں میں دراصل بھارت کے ڈر سے شامل ہوا ہے مگر روس نے اس بات کو ہرگز تسلیم نہ کیا۔ اور موقع آنے پر پاکستان کو سبق سکھانے کی ٹھان لی۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سوویت یونین نے بجائے پاکستان کے عدم تحفظ کا مسئلہ سمجھنے کے اسے ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنایا۔ احتجاجی مراسلہ بھیجنے کے بعد سوویت یونین نے افغانستان اور بھارت سے مزید بہتر تعلقات استوار کر لیے۔ 1955ء

میں سوویت یونین کے رہنماؤں نے بھارت اور افغانستان کا سرکاری دورہ کیا۔ وہ پہلے تو سرینگر گئے جہاں انہوں نے کشمیر کو بھارت کا جزو قرار دیا۔ اور پھر کابل گئے جہاں پختونستان کے مسئلے کو ایک حقیقت قرار دیا۔ روس کے ذرائع ابلاغ نے کھلے طور پر پاکستان کے خلاف ایک جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ لیکن پاکستان خاموش رہا سوویت یونین کے غصے کی بنیادی وجہ پاکستان کا مغربی ممالک سے دفاعی معاہدوں میں شمولیت تھی جب پاکستان معاہدوں میں شریک ہوا تو اس نے ہندوستان کو دوست بنانے کی ہر ممکن کوشش شروع کر دی اس کو بھارت نے بڑی خوشی سے قبول کر لیا۔

3.3- خیر سگالی

1956ء میں اول ڈپٹی سویت وزیر اعظم نے پاکستان کا خیر سگالی دورہ کیا۔ اسی سال سوویت یونین کے ایک وفد نے دورہ پاکستان کے موقع پر پاکستان کے ساتھ تجارتی معاہدہ کیا۔ 1958ء میں روس کے ایک پارلیمانی وفد نے بھی دورہ کیا اور پاکستان کو غیر مشروط امداد کی پیش کش کی۔

3.4- تعلقات میں کشیدگی

1958ء میں ایوب خان نے مارشل لاء کے ذریعے سے برسر اقتدار آئے چونکہ وہ شروع سے امریکہ کے ساتھ زیادہ بہتر تعلقات کے خواہاں تھے۔ اس لیے برسر اقتدار آتے ہی انہوں نے ان تعلقات کو اور بھی بڑھایا جس سے پاکستان اور سوویت یونین کے باہمی تعلقات کو مزید دھچکا لگا۔ 1960ء میں یوٹو جاسوسی جہاز کا واقعہ پیش آیا۔ یہ جاسوسی جہاز پشاور سے اڑ کر سوویت یونین کے علاقہ میں تصویریں لے رہا تھا کہ اسے روسی جہازوں نے مار گرایا۔ پائلٹ پکڑا گیا اور اس نے سب کچھ اگل دیا۔ سوویت یونین نے پاکستان کو دھمکی دی کہ اگر پھر ایسا ہوا تو پشاور کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ اس واقعے نے تعلقات کو بالکل بگاڑ دیا۔ اچھے تعلقات کی رہی سہی امید بھی نظروں سے اوجھل ہونے لگی۔

3.5- موافقت

1962ء کی بھارت چین جنگ کے بعد پاک سوویت یونین تعلقات مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر بہتر ہونے لگے۔ سب سے بڑی وجہ تو پاکستان کا مغرب سے مایوس ہونا تھی۔ 1962ء تک پاکستان کو اس بات کا مکمل یقین ہو گیا کہ باوجود اس کے کہ وہ مغرب کے ساتھ تین معاہدوں میں شریک ہے۔ اس کی توقعات پوری نہیں ہو رہی ہیں۔ کشمیر کا مسئلہ جوں کا توں تھا مزید برآں بھارت جو معاہدوں میں شریک بھی نہیں تھا اس کو بڑے پیمانے پر فوجی اور معاشی مدد ملتی رہی۔ ان باتوں نے پاکستان کو اپنی خارجہ پالیسی میں نظر ثانی کرنے پر مجبور کر دیا۔

بین البراعظمی (Intercontinental) میزائلوں کی ایجاد نے زمینی اڈوں کی اہمیت کو بالکل ختم کر دیا۔ اب سوویت یونین ان اڈوں سے بالکل خوف زدہ نہیں تھا جو چھوٹے ملکوں نے امریکہ کو دیئے تھے۔ فوجی لحاظ سے اب سوویت یونین کو امریکہ سے کوئی ڈر باقی نہیں رہا تھا۔

چین ایک بڑی طاقت بن کر ابھر رہا تھا۔ سوویت یونین کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں یہ پڑوسی ملک دوسرے ایشیائی ملکوں کے ساتھ مل کر اس کے لئے بلائے جان نہ ثابت ہو۔ چین سوویت جھگڑے کے بعد روسیوں نے اس بات کو خاص طور پر مدنظر رکھا۔

چوتھی وجہ جس نے سوویت یونین کو پاکستان کے ساتھ تعلقات کو دوبارہ جائزہ لینے پر مجبور کیا، وہ 1962ء کی بھارت چین جنگ تھی۔ جنگ کے فوراً بعد مغرب والوں نے بڑے پیمانے پر بھارت کی فوجی امداد شروع کر دی۔ جب سوویت یونین نے محسوس کیا کہ بھارت مغرب والوں کی طرف جھک رہا ہے تو انہوں نے اپنی توجہ پاکستان پر مرکوز کر دی۔

مندرجہ بالا باتوں نے پاکستان کے بارے میں سوویت یونین کی پالیسی کو متاثر کیا۔ پاکستان نے بھی روس کی اہمیت کو پہچانا اور دونوں ممالک نے اپنے تعلقات بہتر بنانے شروع کر دیئے۔

3.6- معاہدہ تاشقند

1965ء پاک بھارت جنگ میں روس نے بالکل غیر جانبدار پالیسی اختیار کر لی۔ جنگ کے فوراً بعد سوویت یونین کی کوششوں سے پاکستان اور بھارت کے درمیان معاہدہ تاشقند ہوا روسی وزیر اعظم کوسیگن نے اس میں قابل ذکر کردار ادا کیا۔ چنانچہ سیاسی اور معاشی تعلقات دن بدن بڑھتے چلے گئے۔

3.7- اسلحہ کی فراہمی

1965/69ء تک سوویت یونین اور پاکستان کے تعلقات قابل تعریف تو نہیں تھے لیکن خاصے اچھے ہو گئے تھے۔ پاکستان کے ایک فوجی وفد نے 1966ء میں روس کا دورہ کیا اور روس نے پاکستان کو جیپیں اور ہیلی کاپٹر فراہم کرنے کا وعدہ کیا دوسرا اسلحہ اس نے نہ دیا کیونکہ بھارت نے بہت واویلا مچایا، لیکن کوسیگن جب 1968ء میں پاکستان کے دورے پر آئے تو انہوں نے مناسب اسلحہ دینے کا وعدہ کیا۔

3.8- دوبارہ کشیدگی

1969ء میں روس پاکستان تعلقات میں ایک بار پھر کشیدگی بڑھی۔ اس کی بنیادی وجہ سوویت یونین کا ایشیائی سلامتی کا معاہدہ تھا۔ پاکستان نے یہ سمجھ کر کہ یہ معاہدہ چین کے خلاف ہو رہا ہے۔ اس کی بالکل حمایت نہ کی۔ سوویت یونین نے دوبارہ

پاکستان کی طرف معاندانہ رویہ اختیار کیا 71-1973ء میں پاکستان کے بحران نے روس کو ایک نادر موقع فراہم کیا کہ وہ پاکستان کو سبق سکھائے۔ روس نے نہ صرف مشرقی پاکستان میں علیحدگی پسندوں کی حمایت کی اور امداد کی بلکہ ہندوستان کے ساتھ مل کر پاکستان کو دولخت کر دیا۔

3.9- کشیدگی میں کمی

بھٹو نے برسر اقتدار آتے ہی سوویت یونین کے ساتھ دوطرفہ دوستی کی بنیادوں پر تعلقات قائم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے بہت سے سوشلسٹ ملکوں کے ساتھ تعلقات استوار کیے اور روس نے پاکستان کی سیٹو سے علیحدگی کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ اس کے ساتھ دونوں ملکوں کے مابین وفود کے تبادلے شروع ہوئے جن سے تعلقات کی بہتری میں مدد ملی۔

3.10- خود آزمائی نمبر 3

سوال نمبر 4 پاکستان اور روس کے تعلقات کا پس منظر بیان کیجیے۔

(جواب کا جائزہ حصہ 3 کی عمومی بحث کی روشنی میں کیجیے۔)

سوال نمبر 5 دونوں ملکوں میں خیر سگالی اور کشیدگی کے جو دور آئے ان کے اسباب پر بحث کیجیے۔

(جواب کا موازنہ حصہ 3 کے متعلقہ حصوں سے کیجیے۔)

4- پاکستان اور چین

4.1- تمہید

پاکستان وہ واحد مسلم ملک تھا جس نے 1950ء میں چین کی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان سلامتی کونسل میں عوامی جمہوری چین کو مستقل ممبر کی حیثیت دلانے کی بھرپور کوششیں شروع کر دیں۔ اس کوشش کو چین نے ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا شاید یہی وجہ تھی کہ دونوں ملکوں کے تعلقات صحیح خطوط پر استوار ہونے لگے۔

4.2- تعلقات کی استواری

1950ء میں چین کی افواج نے تبت کو آزاد کرانے کے لیے کارروائی کی تو بھارت نے چین کے خلاف واویلا شروع کر دیا جب کہ پاکستان غیر جانبدار رہا۔ اس چیز نے بھی دونوں ملکوں کو قریب لانے میں مدد دی۔

اگرچہ کوریا کی جنگ میں پاکستان نے شمالی کوریا کو جارح قرار دیا لیکن اقوام متحدہ میں جب چین کو بھی جارح قرار دینے کی قرارداد پیش ہوئی تو پاکستان نے اس میں حصہ نہ لیا بعد میں دوستانہ تعلقات کے قیام میں یہ بات قابل تعریف سمجھی جاتی رہی۔

جب پاکستان نے سیٹو اور سینٹو میں شمولیت اختیار کی تو چین نے ان معاہدوں کو تو ہدف تنقید بنایا لیکن پاکستان کے خلاف کوئی بات نہیں کی تھی۔

> ''چین کی طرف سے اگرچہ مخالفت کا رویہ تھا لیکن دشمنی نہیں تھی۔ بھارت اور چین کی طرح ہزار سالہ دوستی کے نعرے بھی نہیں تھے''۔

انہی معاہدوں کی وجہ سے سوویت یونین نے پاکستان سے مخالفانہ روش اختیار کر لی۔ لیکن چین نے فراخدلی کا مظاہر کیا اور چینی رہنماؤں نے پاکستان کے عدم تحفظ کے احساس کو بخوبی بھانپ لیا۔ 1955ء میں پاکستان نے چین کو ان معاہدوں میں شمولیت کی اصل وجہ بتائی کہ ان معاہدوں میں پاکستان کی شمولیت چین کے خلاف نہیں بلکہ بھارتی خطرے کے پیش نظر اپنے دفاع کو مضبوط بنانا چاہتا ہے۔ چین نے پاکستانی موقف کو بڑی خوشی سے قبول کر لیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سوویت یونین کی بجائے چین نے کیوں پاکستان کا موقف قبول کیا آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ان چار باتوں نے چین کی سوچ کو متاثر کیا۔ پہلی بات تو وہی کہ چین کو معلوم تھا کہ بھارت پاکستان کی سلامتی کے لیے خطرہ ہے۔ اس لیے پاکستان ان دفاعی معاہدوں میں شامل ہوا ہے۔ دوسرے پاکستان ان معاہدوں میں شامل ہو کر امریکہ سے اسلحہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ان معاہدوں میں شامل ہو کر پاکستان کو بہت زیادہ فوجی ساز و سامان ملا۔ تیسری وجہ سیٹو میں پاکستان کی

شمولیت محض امریکہ کی خوشنودی کے لیے تھی۔ چوتھی وجہ امریکی فوجی امداد چین کے خلاف نہیں بلکہ بھارت کے خلاف ہوسکتی تھی۔ ان چیزوں نے چین کو پاکستان کا موقف سمجھنے میں بڑی مدد دی۔

1956ء میں پاکستان کے وزیراعظم سہروردی چین کے دورے پر گئے۔ چین نے اس دورے کا حوصلہ افزاء جواب دیا اور چینی وزیراعظم چواین لائی پاکستان کے دورے پر آئے۔ مشترکہ اعلامیہ میں اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا گیا کہ دونوں ملکوں کے درمیان کوئی جھگڑا نہیں اور دونوں ملکوں کو باہمی تعلقات مزید آگے بڑھانے چاہئیں۔

ایوب خان کے ابتدائی دور میں چین سے تعلقات میں معمولی رخنہ اندازی ہوئی اس کی بنیادی وجہ ایوب خان کی بھارت کو دفاعی معاہدہ کی پیش کش تھی۔ پاکستان اور چین کی سرحدوں کے بارے میں کچھ اختلافات تھے، پاکستان نے چین کے ساتھ مذاکرات شروع کیے اور 1962ء میں اس مسئلے کو خوش اسلوبی سے حل کرلیا گیا۔ بھارت نے اس معاہدہ پر اعتراض کیا کہ کشمیر کے بعض علاقے چین کو دے دیئے گئے ہیں۔

جنوری 1963ء میں پاکستان اور چین نے تجارتی سمجھوتہ کیا اور چین پاکستان کی کپاس کا سب سے بڑا خریدار بن گیا۔ 1963ء کا سال دونوں ملکوں کی دوستی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس سال دونوں ملکوں نے آپس میں کئی سمجھوتوں پر دستخط کیے۔

پاکستان کا چین کی طرف جھکاؤ ایک قدرتی امر تھا، اس کی بنیادی وجہ مغرب کا پاکستان کی طرف مایوس کن رویہ تھا بھارت اور افغانستان کی دشمنی اور روس کی مخالفت نے پاکستان کو مجبور کیا کہ وہ دنیا میں نئے دوست کی تلاش کرے۔ 1962ء میں بھارت چین جنگ نے پاکستان کو چین کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے لیے ایک نادر موقع فراہم کیا۔ دونوں ملکوں کے مفادات ایک دوسرے کو قریب لانے میں بڑے معاون ثابت ہوئے۔ اور اس نے دونوں کو دوستی کے رشتوں میں منسلک کر دیا۔

4.3- 1965ء کی جنگ اور چین

1965ء کی پاک بھارت جنگ میں چین نے بھارت کو جارح ملک قرار دیا۔ اور اس کی پرزور مذمت کی۔ جس سے پاکستان اور اس کے عوام چین سے متاثر ہوئے۔ اسی طرح 1971ء میں بھی چین نے پاکستان کا ساتھ دیا۔ اگرچہ چین نے پاکستان کی فوجی طور پر مدد نہ کی کیونکہ ہوسکتا ہے کہ اس طرح سوویت یونین بھی کھلے طور پر اس جنگ میں شامل ہو جاتا اور دنیا کا امن خطرے میں پڑ جاتا۔ لیکن چین نے سیاسی اور سفارتی طور پر بہت مدد کی۔

4.4- 1971ء کے بعد

☆ 1971ء کے بعد پاک چین دوستی بڑھی چین نے پاکستان کی معاشی امداد میں مزید اضافہ کر دیا اور فوجی ساز وسامان

بھی فراہم کیا۔

☆ کشمیر کے بارے میں پاکستان کا موقف ہمیشہ درست قرار دیا۔ اور کشمیریوں کے حق خودارادیت کی حمایت کی۔

☆ 1970ء کے شروع میں پاکستان نے امریکہ اور چین کی قریب لانے کی سفارتی کوششوں میں بھرپور کردار ادا کیا اس سے چین اور امریکہ قریب آ گئے۔ چین نے پاکستان کے کردار کی تعریف کی۔ اس کے بعد دونوں ملکوں کے تعلقات نہایت دوستانہ ہیں اور روز بروز ان میں اضافہ ہو رہا ہے۔

4.5- خود آزمائی نمبر 4

سوال نمبر 1 پاکستان اور چین کے تعلقات کا تجزیہ کیجیے۔

(جواب کا جائزہ حصہ 4 میں دی گئی عمومی بحث کی روشنی میں کیجیے۔)

5- حاصل بحث

آزادی کے وقت چونکہ بھارت اور افغانستان پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش تھے اس لیے پاکستان کی کوشش تھی کہ ایک طرف دوسرے ہمسایوں سے اچھے تعلقات قائم کیے جائیں اور ساتھ ساتھ ملکی دفاع کو مختلف طریقوں سے مضبوط بنایا جائے۔ اگر بڑی طاقتوں کے ساتھ پاکستان کے تعلقات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان تعلقات کی نوعیت بنیادی طور پر پاکستان کے دفاعی نقطہ نظر سے تھی۔ تمام ممالک اپنی علاقائی آزادی، سلامتی اور اقتدار اعلیٰ کو اولیت دیتے ہیں۔ اس لحاظ سے آزادی حاصل کرتے ہی پاکستان کو بھی یہی بڑا مسئلہ درپیش رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پاکستان کو معاشی اور تکنیکی امداد کی بھی بہت ضرورت رہی ہے۔ پاکستان اگر اپنے وسائل کا زیادہ حصہ دفاع پر خرچ کرتا تو اندرونی ترقی رک جاتی۔ اور آمدنی کا بڑا حصہ ترقی پر صرف کرتا تو دفاع متاثر ہوتا تھا۔ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھ کر پاکستان نے مختلف بڑی طاقتوں س اپنے تعلقات استوار کیے۔

6- تشریحات

-1	افغانستان	پاکستان کے شمال مغرب میں ہمسایہ اسلامی ملک۔
-2	امریکہ	ریاست ہائے متحدہ امریکہ۔شمال امریکہ میں واقع یہ ملک معاشی اورفوجی لحاظ سے دنیا کا مضبوط ترین ملک۔
-3	ایران	پاکستان کے مغرب میں ہمسایہ اسلامی ملک۔
-4	آئزن ہاور	ڈوائٹ ڈی آئزن ہاور دوسری عالم گیر جنگ میں شہرت پانے والا امریکی جرنیل اور ریاست متحدہ امریکہ کا صدر۔
-5	برما	جنوبی ایشیا کا ایک ملک۔
-6	بھارت	پاکستان کا مشرقی ہمسایہ ملک۔
-7	بین البراعظمی میزائل	براعظموں کے درمیان پھینکے جانے والے میزائل۔
-8	پالیسی	حکمت عملی۔
-9	تاشقند	وسطی ایشیا کا ایک شہر جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے۔
-10	تبت	ہمالیائی پہاڑوں میں گھرا ہوا ایک ملک جواب چین کا حصہ ہے۔
-11	جاپان	ایشیا کے مشرقی ساحل سے پرے واقع ایک ملک۔
-12	چین	رقبے کے لحاظ سے ایشیا کا دوسرا بڑا ملک جو پاکستان کے شمال میں واقع ہے۔
-13	ذرائع ابلاغ	اطلاع دینے کے ذریعے (ریڈیو،ٹیلیویژن،اخبارات وغیرہ)
-14	سیٹو	امریکہ کی سرکردگی میں جنوب مشرقی ایشیا کی دفاعی تنظیم۔
-15	سینٹو	امریک کی سرکردگی میں جنوب مغربی ایشیا کی دفاعی تنظیم۔
-16	کشمیر	پاکستان کے شمال میں ایک متنازعہ فیہ علاقہ۔
-17	کمیونزم	ایسا معاشی نظام جس میں ذاتی ملکیت کی اجازت نہیں ہوتی اور تمام ذرائع پیداوار ریاست کی تحویل میں ہوتے ہیں۔
-18	کوریا	ایشیا کے شمال مشرق حصے میں واقع ملک جواب دوحصوں میں (ملکوں) میں تقسیم کیا گیا ہے شمال کوریا اور جنوبی کوریا۔
-19	کوسیگن	(ایلکسی کوسیگن 1904ء تا 1980ء) 1964ء سے 1980ء تک روس کے وزیراعظم۔